سعادت حسن منٹو

۱۹۱۲ - ۱۹۵۵



ضیا ساجد



سعادت حسن منٹو

۱۹۱۲ —— ۱۹۵۵

- ناقابل فراموش افسانے
- لافانی مضامین
- غیر مطبوعہ خطوط
- نادر و نایاب تصاویر
- دانشوروں کا خراجِ تحسین

ترتیب

ضیا ساجد

قابلِ تحسین شمس قاری۔ گاف روڈ لاہور ۳

ڈسٹری بیوٹر: نسیم نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ لاہور

قانونی مشیر
انور علی چودھری ایڈووکیٹ
سپریم کورٹ و ہائیکورٹ
فین روڈ لاہور

ناشر ——— ضیا ساجد
تابع ——— ابوالمعالی پرنٹرز
ٹائیٹل ——— فخر بٹ
آرٹسٹ ——— خدا بخش ابڑو
کتابت و
تزئین کار ——— سرفراز رزاقی
قیمت ——— چھتیس ۳۶ روپے

تصاویر ——— خاطر غزنوی



سعادت حسن منٹو

کرشن چندر

لانبا، ترچھا، چٹپٹا، گورا گورا، ہاتھ کی پشت پر وریدیں ابھری ہوئی، گردن کا حلقوم باہر نکلا ہوا، سوکھی ٹانگوں پر بڑے بڑے پاؤں لیکن بے ڈول نہیں۔ ایک عجیب سی نفاست نسائیت لئے ہوئے، چہرے پر جھنجھلاہٹ، آواز میں بے چینی، لکھنے میں اضطراب، آداب میں تلخی، چلنے میں عجلت، سعادت حسن منٹو کو پہلی بار دیکھ کے کچھ ان باتوں کا احساس ہوتا ہے لیکن ان باتوں کے احساس پر ایک دوسرا احساس حاوی ہو جاتا ہے منٹو کی پیشانی کا چوکھٹا اس کے دماغ کی طرح عظیم ہے اور عجیب و غریب بھی۔ بالعموم ذہین آدمیوں کی پیشانی کا چوکھٹا ان تصویروں سے زیادہ ملتا جلتا ہے جو مغربی مصور شیطان سے منسوب کرتے ہیں، یعنی فراخ ماتھا اور بال کنپٹیوں کے قریب سے پیچھے کی طرف غائب ہوتے ہوئے۔ منٹو کا ماتھا شیطان سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ منٹو کا ماتھا مستطیل ہے۔ سیمیں پردے کی طرح نیچے سے کم فراخ ہے اور اوپر سے زیادہ اور بال سیدھے لانبے اور گھنے ہیں اور آنکھوں میں ایک وحشی چمک ہے ایک بے باک درشتی ہے۔ ایک ایسی سوجھ بوجھ ہے جیسے منٹو موت کے دروازے کے اندر جھانک کر لوٹ آیا ہو میں نے منٹو سے اس امر کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا۔ سنا ہے کہ وہ ایک دفعہ تپ دق یا ایسی ہی کسی خوف ناک بیماری میں مبتلا ہوا تھا —— بہرحال اس کی بڑی بڑی وحشت ناک آنکھوں کا سوز و کرب اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ منٹو زندگی کی منزل سے بہت آگے جاکے واپس آیا ہے۔ ممکن ہے کوئی بیماری نہ ہو خطرناک عشق رہا ہو اور حالانکہ عشق بھی ایک بیماری ہے۔ کچھ بھی ہو منٹو کے لئے یہ تجربہ مہنگا نہیں رہا۔ اس تجربے نے منٹو کو کندن بنا دیا۔

منٹو جواہر لال اور اقبال کی طرح کشمیری پنڈت ہے۔ عرصے سے اس کا خاندان امرتسر میں آباد تھا۔ اس کے دونوں بڑے بھائی ہندوستان سے ہجرت کر چکے ہیں۔ بڑا بھائی کینیا میں بیرسٹر ہے اور وہاں کی دستوری مجلس کا رکن بھی۔ اس کے بڑے بھائی کو میں نے دیکھا ہے۔ شرعی داڑھی اور بے حد متقی پارسا اور نمازی مسلمان۔ منٹو وہ سب کچھ ہے جو اس کے دونوں بڑے بھائی نہیں ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کی عزت کرتا ہے محبت نہیں، آداب میں، اخلاق میں، زاویۂ نگاہ میں اس قدر شدید اختلاف تھا کہ منٹو نے بچپن ہی سے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا اور اپنے لئے نئی راہ تلاش کرنی شروع کر دی تھی۔ علی گڑھ، لاہور، امرتسر، بمبئی، دہلی۔ ان مقامات نے منٹو کے مختلف رنگ دیکھے ہیں۔ روسی ادب کا پرستار منٹو، چینی ادب کا شیدا منٹو، نظمی اور یاسیت کا شکار منٹو، گمنام منٹو، بدنام منٹو، بھٹیار خانوں، شراب خانوں اور قحبہ خانوں میں جانے والا منٹو اور پھر گھریلو منٹو۔ محبت کرنے والا منٹو، دوستوں کی مدد کرنے والا منٹو، ترشی اور تلخی کو مٹھاس میں سمونے والا منٹو، اردو کا معروف ترین ادیب منٹو۔ ان مقامات نے منٹو کو ہر رنگ میں

دیکھا ہے اور منٹو نے بھی ان مقامات کو خوب دیکھا ہے۔ منٹو نے زندگی کے مشاہدے میں اپنے آپ کو ایک مومی شمع کی طرح پگھلایا ہے وہ اردو ادب کا واحد شنکر ہے جس نے زندگی کے زہر کو خود گھول کر پیا ہے اور پھر اس کے ذائقے کو، اس کے رنگ کو کھول کھول کے بیان کیا ہے۔ لوگ بد کتے ہیں، ڈرتے ہیں مگر اس کے مشاہدے کی حقیقت اور اس کے ادراک کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتے۔ زہر کھانے سے اگر شنکر کا گلا نیلا ہو گیا تھا تو منٹو نے بھی اپنی صحت گنوالی ہے۔ اس کی زندگی انجکشنوں کی محتاج ہو کے رہ گئی ہے۔ یہ زہر منٹو ہی پی سکتا تھا۔ اور کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا دماغ چل جاتا مگر منٹو کے دماغ نے زہر کو بھی ہضم کر لیا ہے ان درویشوں کی طرح جو پہلے گانجے سے شروع کرتے ہیں اور آخر میں سنکھیا کھانے لگتے ہیں اور سانپوں سے اپنی زبان ڈسوانے لگتے ہیں۔ منٹو کے ادب کی تیزی و تندی اور اس کی زبان کی نشتر زنی اس امر کی آئینہ داری کرتی ہے کہ منٹو کا فقرا آخری منزل پر پہنچ چکا ہے۔ منٹو سے ملنے سے پہلے میں نے منٹو کے افسانے پڑھے تھے۔ ہفتہ وار مصور بمبئی میں منٹو کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ یہ افسانے اتنے نکیلے تھے اتنے عجیب و غریب الفاظ میں لکھے گئے تھے اس قدر ٹیڑھے تھے کہ قائل ہونا پڑا۔ شو شو، خوشیا، دیوالی کے دیئے۔ غالباً یہ افسانے میں نے مصور ہی میں پڑھے تھے اور منٹو کو ان کے بارے میں توصیفی خطوط بھی لکھے تھے۔ ان دنوں منٹو بمبئی میں رہتا تھا۔ ہفت روزہ مصور کی ادارت سنبھالے ہوئے تھا اور "کیچڑ" کی کہانی، منظر نامہ اور مکالمے بھی تحریر کر رہا تھا۔ پریم چند کے بعد منٹو پہلا ادیب ہے جس نے ادب سے فلم کی طرف رجوع کیا۔ شاید منٹو کے لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی ادبی شہرت اس کی فلمی زندگی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ شاید منٹو وہ پہلا ادیب ہے جو فلم سے ادب کی طرف آیا اور اپنی شہرت کی بنیادیں استوار کر کے پھر فلم کی طرف چلا گیا۔ اس کی ہر بات عجیب ہے۔

ان افسانوں کے پڑھنے کے بعد میں نے اس کا افسانہ "لالٹین" پڑھا جو بٹوٹ سے متعلق ہے جہاں منٹو غالباً اپنی شدید علالت کے دوران میں رہا تھا۔ مجھے تو اس افسانے کا بیشتر حصہ منٹو کی سوانح سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ اس کی جزئیات میں اور حرف آخر میں جو حزن و ملال جھلکتا ہے وہ خود رومانی منٹو کی زندگی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد گویا منٹو کے افسانوں سے کسی نے ساری ملائمت اور نرمی اور مٹھاس چھین لی یا شاید اس نے خود ان اوصاف کو اپنی کہانیوں سے دھکے مار مار کر نکال دیا ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اذیت دہ کوشش، جذبے کے زیر اثر ایسا کرتا رہتا ہے۔ نکلو، نکلو، نکلو، زندگی بہت تلخ ہے۔ ان میں ان جذبات کا گزر نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ اس کے اکثر افسانوں میں معلوم ہوتا ہے گویا وہ ان جذبات کو دیدہ و دانستہ دھکے مار کر باہر نکال رہا ہو۔ کبھی بچوں کی طرح بسورنے لگتا ہے۔ کبھی تلخ لہجے میں، نہایت ہی ناخوش گوار لہجے میں ان کا مذاق اڑاتا ہے اور کوئی نہیں سمجھتا کہ اس تلخی، زہرناکی اور طنز یہ ہنسی کے پیچھے کتنی نرمی اور ملائمت اور زندگی کی چاہت چھپی ہوئی ہے۔ ایسی چاہت جس کی بھوک ابدی ہے اور کبھی نہیں مٹتی۔ مٹائے نہیں مٹتی۔ منٹو ازل سے بھوکا ہے۔ اس کے ہر افسانے میں انسانی محبت کی پکار ہے۔ آپ اس کے انداز پر نہ جایئے۔ وہ ہزار بار کہتا ہے، مجھے انسانوں سے محبت نہیں ہے۔ میں ایک گلے سڑے کتے کے پلے سے محبت کر لوں گا مگر انسانوں سے نہیں۔ وہ کہے گا مجھے دوستی، عنایت، شفقت کسی پر اعتبار نہیں۔ میرا اعتقاد شراب ہے۔ یہ ترقی پسندی سب بکواس ہے۔ میں ترقی پسند نہیں ہوں۔ میں صرف منٹو ہوں اور شاید وہ بھی نہیں ہوں۔ وہ یہ سب باتیں کہتا ہے "تکلفاً"۔ کبھی آپ کا جی جلانے کے لئے، منہ چڑانے کے لئے۔ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے بھی۔ وہ یہ سب باتیں کہتا ہے لیکن اس کی آنکھیں کچھ اور کہتی ہیں۔

اس کا قلم کچھ اور کہتا ہے اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس کی زبان کی طرح اس کا قلم اس کے قابو میں نہیں ہے۔ وہ اپنی انسانی ہمدردی، اپنی ترقی پسندی، اپنی بشری محبت پر پردہ ڈالنے کی ہزار کوشش کرتا ہے۔ اپنے افسانوں پہ استہزا کا روغن چڑھاتا ہے لیکن اس کا قلم اس کے قابو میں نہیں ہے اور ہر افسانے کے پس پردہ انسانی محبت ابلی پڑتی ہے۔

ان دنوں میں "نئے زاویے" کی پہلی جلد مرتب کر رہا تھا۔ میں نے منٹو سے اس میں شرکت کے لئے کہا تو اس نے بہت جلد مجھے اپنی وہ کہانی بھیجی جو میرے خیال میں آج تک اپنی جگہ اردو کی بہترین کہانی ہے اور ادب میں اس کا مقام وہی ہے جو راجندر سنگھ بیدی کے "گرہن" اور حیات اللہ انصاری کی "آخری کوشش" کا ہے۔ اتنے اچھے افسانے اب اردو میں مشکل سے لکھے جا سکیں گے میں نے روسی شاہکار "یاما" بھی پڑھا ہے اور اسی موضوع پر کئی فرانسیسی کہانیاں بھی پڑھی ہیں اور امراؤ جان ادا کے کردار کا بھی مطالعہ کیا ہے لیکن "ہتک" کی ہیروئن کی ٹکر کا ایک کردار بھی مجھے ان ناولوں اور افسانوں میں نہیں نظر آیا، ایک ایک کر کے منٹو نے موجودہ سماجی نظام کے اندر بسنے والی طوائف کی زندگی کے چھلکے اتار کر الگ کر دیئے ہیں اس طرح کہ اس افسانے میں نہ صرف طوائف کا جسم بلکہ اس کی روح بھی ننگی نظر آتی ہے۔ ایک شیشے کی طرح آپ اس کے آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں کس بے دردی اور سفاکی سے منٹو نے اسے ننگا کیا ہے لیکن اس بدصورت خاکے کا ہر رنگ، بدصورت ہوتے ہوئے بھی ایک نئے حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ طوائفیت سے محبت نہیں ہوتی۔ سوگندھی اور اس کی زندگی پر رحم بھی نہیں آتا لیکن سوگندھی کی معصومیت اور اسکے عورت پنے پر اور اس کی زندگی اور اس کی چاہت اور اس کی تخلیق پر اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے اور یہی سچے اور لافانی ادب کا جوہرِ عظیم ہے!

"ہتک" کے بعد پھر تو منٹو کے کئی ایک افسانے رسائل میں شائع ہوئے اور بجلی کے کوندے کی طرح منٹو کا نام پڑھے لکھے عوام کے اذہان میں چمک اٹھا۔ انہی دنوں میں آل انڈیا ریڈیو سے مجھے بلاوا ملا۔ اور میں لاہور سے دہلی چلا گیا۔ یہاں مجھے آئے ہوئے ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا کہ مجھے منٹو کا خط آیا کہ وہ دہلی آ رہا ہے اور میرے یہاں ٹھہرے گا۔ مجھے تیس ہزاری میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا تھا اور ایک نوکر بھی۔ اس لئے چنداں فکر کی بات نہ تھی۔ میں شام کے وقت ۶ بجے کے قریب دفتر سے لوٹ کر اپنے مکان کے باہر ٹہل رہا تھا کہ ایک صاحب لمبے دبلے، اتر چھے، گورے گورے سے آئے۔ ایک چرمی بیگ بغل میں دبائے اور میری طرف دیکھ کے مسکرانے لگے۔ ہم دونوں نے یکایک ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

"تم کرشن چندر ہو" نو وارد نے کہا۔

"منٹو" میں نے جواب دیا اور ہم دونوں بغل گیر ہو گئے۔

منٹو ایک لمبا سا کوٹ پہنے آیا تھا۔ کمرے کے اندر جا کر منٹو نے اوور کوٹ اتار دیا اور چرمی بیگ کو صوفے پر پٹک دیا اور خود ایک کرسی پر پاؤں سکیڑ کر اس طرح بیٹھ گیا کہ جس طرح کنہیا لال جیب کترے کا پارٹ ادا کرتے وقت بیٹھتا ہے۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا: "لو سگریٹ پیو"۔

کوئی گھٹیا قسم کا سگریٹ تھا جو میں نے اسے پیش کیا۔

"لاحول ولاقوۃ" منٹو بولا۔ "اے یہ سگریٹ تم پیتے ہو؟ حیرت ہے ایسے سگریٹ پی کر تم اتنے اچھے افسانے کیسے لکھ لیتے ہو۔

یہ سگریٹ پی کر تم صرف دفتر کی کلرکی کر سکتے ہو! سمجھے کرشن چندر ایم۔ اے...... لو اب یہ سگریٹ پیو ۵۵۵۔ اور بھول جاؤ ان سگریٹوں کو۔"

نوکر نے گرم گرم پھلکیاں پلیٹ میں سجا کر بھیج دیں۔ میں نے کہا: "پھلکیاں گھی میں تلی گئی ہیں۔ خالص گھی پنجاب سے آیا ہے۔"

"پھلکیاں اور گھی میں؟" منٹو چلّایا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ ارے میاں تم تو نرے کودن ہو۔ ارے بھائی میرے کون بیوقوف پھلکیاں گھی میں تلتا ہے۔ اس سے تو پھلکیوں کا مزہ ہی بدل جاتا ہے۔ تلنے کے لئے گھی نہیں ڈالڈا بہتر ہے۔ ڈالڈا سے بہتر فرائی اور کہیں نہیں ہوتا۔ میری بیوی کو آنے دو۔ پھر تمہیں پھلکیاں کھلاؤں گا۔ چٹپٹی اور کرکری اور ایسی مزیدار جیسے بمبئی کی گھاٹن ہوتی ہے۔ کبھی بمبئی گئے ہو؟"

میں نے کہا: "میں تو دہلی بھی پہلی بار آیا ہوں۔ اس سے آگے دنیا کیسی ہے۔ معلوم نہیں۔"

"بمبئی چلو اور چھوڑ دو یہ ریڈیو ویڈیو۔ لو شراب پیو۔"

یہ کہہ کر منٹو نے اپنے چھوٹے کوٹ کی جیب سے ایک بوتل نکالی۔ سولن وسکی نمبر ا۔ اور اس کا کاگ اڑا کر بولا: "لو جلدی سے دو گلاس منگواؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔"

اب تک میں نے کبھی شراب نہ چکھی تھی لیکن منٹو کا چہرہ اس قدر درشت تھا۔ اس کا لہجہ اس قدر تند تھا کہ میں نے سوچا اگر میں نے انکار کیا تو کہیں وہ مجھے مار ہی نہ بیٹھے۔ میں نے نہایت اطمینان سے دو گلاس منگوائے۔ منٹو نے شراب انڈیلنی شروع کی۔ پوچھنے لگا: "تم کون سی شراب پیتے ہو؟"

میں نے کہا: "برانڈی یا پھر — کوئی اچھی سی انگریزی وہسکی۔"

"کون سی انگریزی وہسکی؟" منٹو نے تلخی سے کہا — "وہسکی انگریزی نہیں ہوتی۔ سکاچ ہوتی ہے۔ سالے انگریز شراب تک تو کشید نہیں کر سکتے۔ ہندوستان پر حکومت کیا کریں گے۔"

میرے ذہن میں ایک انگریزی — سکاچ وہسکی کا اشتہار آگیا:

"DONT BE VAGUE ASK FOR HAGUE"

میں نے جلدی سے کہا: "مجھے ہیگ بہت پسند ہے۔"

"سب بکواس ہے۔" منٹو بولا۔ "سولن وہسکی نمبر ا سب سے عمدہ ہے۔ ایک تو پیسے کم اور پھر مزے میں اور نشے میں ہیگ سے بہتر ہے۔ آئندہ سے ہیگ مت پیا کرو۔ صرف سولن وہسکی نمبر ا۔ سمجھے۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے۔ آئندہ سے ہیگ نہیں پیوں گا۔"

"اور ڈالوں؟" منٹو نے میرے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو قریباً ایک چوتھائی بھر چکا تھا۔

میں نے کہا: "اور نہیں۔ جیسے تمہاری مرضی۔ اور ڈال دو۔"

"تو کیا پٹیالہ پیگ پیو گے؟" منٹو نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "ہاں۔" —— دراصل مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ پٹیالہ پیگ کیا ہوتا ہے۔ ہاں کہہ دینے سے نجات مل گئی۔

"بڑے پیاک ہو۔" منٹو نے مجھے شبے کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں تو پہلے ہی پیگ میں نہال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دوسرا میں نے نہیں لیا اور نہ منٹو نے اصرار کیا کیونکہ وہ میری حالت دیکھ چکا تھا۔ میں نے اقبال کیا کہ یہ پہلی بار شراب پی رہا ہوں۔ اس پر منٹو نے شراب کے فائدے گنائے۔ گناہ کی لذت شراب میں، عورت کی رنگت شراب میں ہے۔ ادب کی چاشنی شراب میں ہے۔ مکروہاتِ دنیا سے نجات شراب میں ہے۔ ابھی تم ب تک پنڈت بنے رہو گے۔ آخر تمہیں ادب کی تخلیق کرنا ہے۔ کوئی سکول کے بچوں کو تو پڑھانا ہے نہیں۔ زندگی نہیں دیکھو گے گناہ نہیں کرو گے، موت کے قریب نہیں جاؤ گے۔ غم کا مزہ نہیں چکھو گے۔ سولن دھسکی نما نہیں پیو گے تو کیا تم خاک لکھو گے۔

بوتل ختم کرنے کے بعد وہ بھی آؤٹ ہو گیا۔ اب اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں کرشن چندر ایم۔ اے کیوں ہوں۔ صرف کرشن چندر کیوں نہیں۔

پھر مجھے چڑانے کے لئے بار بار کہنے لگا: "کرشن چندر ایم۔ اے، کرشن چندر ایم۔ اے، کرشن چندر ایم۔ اے۔"

اور میں نے بدلہ چکانے کے لئے کہا: "تم یہ بتاؤ تم کون ہو؟ منٹو، ہو یا مَنٹو ہو یا مُنٹو ہو —— یہ منٹو کیا بلا ہے منٹو۔ مَنٹو۔ مُنٹو!"

وہ کہنے لگا: "کرشن چندر ایم۔ اے، کرشن چندر ایم۔ اے، کرشن چندر ایم۔ اے۔"

تھوڑی دیر تک اسی طرح گردان کرتے ہوئے ہم دونوں سو گئے۔ میں صوفے اور وہ اسی کرسی پر اسی طرح ہو گیا۔ گردن کو ٹانگوں میں دبائے ہوئے اور صبح تک، اسی طرح سویا رہا —— صبح جب میں جاگا تو وہ اسی طرح سو رہا تھا۔ میز پر بوتل اوندھے منہ پڑی تھی۔ گلاس خالی تھے اور پھلکیاں باسی تھیں۔

میں نے منٹو کو جگایا: "اٹھو۔"

وہ اٹھتے ہی کہنے لگا۔ "اگر اس وقت بھی تھوڑی سی مل جائے تو شراب کا ذائقہ زبان سے دُور ہو جائے۔ تم جانتے ہو شراب کے ذائقے کو دور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ صبح اٹھتے ہی آدمی پھر دو گھونٹ شراب کے پی لے۔ سمجھے —— شراب منگاؤ۔ پھر مجھے آل انڈیا ریڈیو جانا ہے۔"

"وہ کیوں۔" میں نے پوچھا۔

"میں یہاں ڈرامے لکھنے کے لئے بلایا گیا ہوں۔"

"اور تم تو مجھے بمبئی بھیج رہے تھے رات کو۔ فلموں میں کام کرنے کے لئے۔"

"گولی مارو بمبئی کو اور یہ بکواس بند کرو۔ اور شراب منگواؤ۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا چرمی بیگ کھولا اور ایک افسانہ نکال کر مجھے دیا۔ "اسے ذرا پڑھ لو۔ میں اپنے افسانے کسی کو نہیں دکھاتا ہوں۔ اپنے باپ کو بھی نہیں۔ بس تمہیں صرف دکھا سکتا ہوں، اگر تم بھی بہت اچھے نہیں لکھتے مگر ایک بات ہے ان میں۔ اسے مانتا ہوں۔ سمجھے کرشن چندر ایم۔ اے"

۲

ریڈیو پر ہم لوگ دو سال اکٹھے رہے۔ بعد میں اوپندر ناتھ اشک بھی آگئے۔ میں ڈرامہ پروڈیوسر تھا۔ منٹو اور اشک دونوں ڈرامے لکھتے تھے اور مجھے ان دونوں کے بیچ میں توازن قائم رکھنا پڑتا تھا۔ دونوں اچھے ادیب، دونوں اپنی انانیت پر قائم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دنوں بہت اچھے ریڈیائی ڈرامے لکھے گئے اور یہ ڈرامے کسی دوسری زبان سے ترجمے نہ کئے گئے تھے۔ یہ اعلیٰ دماغوں کی بہترین تخلیق تھے اور ان ڈراموں سے اردو ادب میں ماڈرن ڈراموں کو فروغ حاصل ہوا بلکہ اس کے بعد تو اوپندر ناتھ نے اپنی بہترین کاوشیں ڈرامے کے لئے وقف کر دیں۔

یہ بڑے مزے کا زمانہ تھا۔ ہم تینوں میں ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ نوک جھونک، افسانے لکھے جاتے، ڈرامے لکھے جاتے، مضامین ایک دوسرے کو سنائے جاتے۔ پھر کچھ عرصے کے لئے بیدی بھی آگئے۔ احمد ندیم قاسمی بھی اور ن م۔ راشد بھی۔ اور اس اجتماع نے اردو ادب میں ایک نئے باب، کا اضافہ کیا۔ ندیم نے اپنا طویل آپیرا نظم کیا۔ بیدی نے پہلی بار ڈراموں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اور راشد کی "ماورا" بھی انہی دنوں میں چھپی۔ دیوندر ستیارتھی بھی تشریف لائے۔ یوں ہی گھومتے گھامتے۔ دو ایک روز تو منٹو سے خوب گاڑھی چھنی۔ مگر منٹو کے مزاج کی تلخی ستیارتھی کی شیریں بیانی کی ضد تھی۔ زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی۔ منٹو نے اپنے ایک افسانے میں ستیارتھی پر چوٹ کی۔ ستیارتھی نے "نئے دیوتا" میں اس کا جواب دیا۔ منٹو کو اس کا صدمہ ضرور ہوا۔ دو تین روز تک اس افسانے کا اثر رہا۔ آخر اس نے کہا: "یہ نئے دیوتا ــــ ٹھیک ہے۔ چلو ہٹاؤ۔"

میں نے کبھی اس سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ منٹو اکثر مجھ سے کہتا تھا: "مجھے تمہاری یہ حرکت پسند نہیں۔ میں تم سے لڑنا چاہتا ہوں اور تم ہمیشہ طرح دے جاتے ہو۔ یہ نامعقولیت مجھے پسند نہیں۔"

میں نے کہا: "لڑنے کے لئے کیا اشک کافی نہیں۔"

اشک اور منٹو کی نوک جھونک خوب ہوتی تھی اور اکثر دنیا کے ہر موضوع پہ ہو جاتی تھی اور ایسی ایسی ادبی موشگافیاں نکلتی تھیں کہ دن بھر جی لگا رہتا تھا۔

منٹو کے پاس اردو ٹائپ رائٹر تھا اور منٹو اپنے تمام ڈرامے اسی طرح لکھتا تھا کہ کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھا کے بیٹھ جاتا تھا اور ٹائپ کرنا شروع کر دیتا تھا۔ منٹو کا خیال ہے کہ ٹائپ رائٹر سے بڑھ کے دنیا میں خیال انگیز مشین اور کوئی نہیں ہے۔ الفاظ گھڑے گھڑائے موتیوں کی طرح چمکاتے ہوئے صاف ستھرے مشین سے نکلتے آتے ہیں۔ قلم کی طرح نہیں کہ نب گھسی ہوئی ہے تو روشنائی کم ہے۔ کاغذ پتلا ہے۔ ایک ادیب کے لئے ٹائپ رائٹر اتنا ضروری ہے کہ جتنا خاوند کے لئے بیوی اور یہ ایک اوپندر ناتھ اشک اور کرشن چندر ہیں کہ قلم گھسے گھسے گئے جا رہے ہیں۔ ارے میاں کبھی عظیم ادب کی تخلیق اٹھ آنے کے پن ہولڈر سے بھی ہو سکتی ہے۔ تم گدھے ہو نرے گدھے!

میں تو خیر چپ رہا مگر دو تین روز کے بعد ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ اشک صاحب اپنی بغل میں ایک نیا اردو کا ٹائپ رائٹر دبائے چلے آ رہے ہیں اور آپ نے منٹو کی میز کے سامنے اپنا ٹائپ رائٹر سجا دیا اور کھٹ کھٹ کرنے لگے۔

"ارے اردو کے ٹائپ رائٹر سے کیا ہوتا ہے۔ انگریزی ٹائپ رائٹر بھی ہونا چاہیے۔ کرشن! تم نے میرا انگریزی کا ٹائپ رائٹر دیکھا ہے۔ دہلی بھر میں ایسا ٹائپ رائٹر کہیں نہیں ہوگا۔ ایک روز لا کے تمہیں دکھاؤں گا۔"

اشک نے اس پر نہ صرف انگریزی کا بلکہ ہندی کا ٹائپ رائٹر بھی خرید لیا۔ جب وہ اکثر آتا تو چپراسی ایک چھوڑ تین ٹائپ رائٹر اٹھائے اس کے پیچھے داخل ہوتا اور اشک منٹو کے سامنے سے گزرتا کیونکہ منٹو کے پاس صرف دو ٹائپ رائٹر تھے۔ آخر غصے میں آکر منٹو نے اپنا انگریزی کا ٹائپ رائٹر بھی بیچ دیا اور پھر اردو ٹائپ رائٹر کو بھی وہ رکھنا نہیں چاہتا تھا مگر اس سے کام میں تھوڑی سی آسانی ہو جاتی تھی اس لئے اس نے اسے نہیں بیچا۔ پہلے پہل۔ مگر تین ٹائپ رائٹروں کی مار وہ کب تک کھاتا۔ آخر اس نے اردو کا ٹائپ رائٹر بھی بیچ دیا۔ کہنے لگا:

"لاکھ کہو۔ وہ بات مشین میں نہیں آسکتی جو قلم میں ہے۔ کاغذ، قلم اور دماغ میں جو رشتہ ہے وہ ٹائپ رائٹر سے قائم نہیں ہوتا۔ ایک تو کم بخت کھٹا کھٹ شور کئے جاتا ہے۔ مسلسل متواتر۔ اور قلم کس روانی سے چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے روشنائی سیدھی دماغ سے نکل کر کاغذ کی سطح پر بہہ رہی ہے۔ ہائے یہ شیفر کا قلم کس قدر خوبصورت ہے۔ اس کا نوکیلا سٹریم لائن حسن دیکھو جیسے باندرہ کی کرسچین چھوکری!"

اور اشک نے جل کر کہا: "تمہارا بھی کوئی دین ایمان ہے۔ کل تک ٹائپ رائٹر کی تعریف کرتے تھے۔ آج اپنے پاس ٹائپ رائٹر ہے تو قلم کی تعریف کرنے لگے۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہمارے ایک ہزار روپے خرچ ہو گئے۔"

منٹو زور سے ہنسنے لگا۔

ایک روز منٹو بہت خوش خوش میرے پاس آیا کہنے لگا: "بھئی یہ احمد ندیم قاسمی کا خط آیا ہے۔ تمہیں بھی سلام کہا ہے ذرا اسے پڑھ لو۔"

میں نے خط پڑھا۔ بڑا پیارا خط تھا مگر منٹو نے خط مجھے اس لئے پڑھنے کے لئے دیا کہ اس میں منٹو کی افسانہ نگاری کی تعریف کی گئی تھی۔ اس نے منٹو کو یہ خط مجھے دکھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ خط کا آخری فقرہ یہ تھا:

"آپ افسانہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔"

خط پڑھ کے میں نے اپنی میز کی دراز کھولی اور اس میں سے ایک خط نکالا۔ یہ خط بھی احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا اور آج ہی مجھے ملا تھا۔ ابھی کوئی منٹو کے آنے سے چند منٹ پہلے۔ اسے پڑھ کے میں نے میز کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ میں نے وہ خط منٹو کو دیا: "لو بھئی۔ یہ ایک خط انہی صاحب نے مجھے بھی بھیجا ہے۔ اسے تم پڑھ لو۔"

میرے خط میں ندیم نے میری افسانہ نگاری کی تعریف کی تھی۔ خط کا آخری فقرہ یہ تھا:

"آپ افسانہ نگاری کے شہنشاہ ہیں۔"

میں نے کہا: "منٹو تم تو صرف بادشاہ ہو۔ ہم شہنشاہ ہیں۔ تم سے بڑے ہیں۔ بولو اب کیا کہتے ہو۔"

پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔ ندیم نے ہم دونوں سے کیا اچھا مذاق کیا تھا۔ منٹو نے کہا: "آؤ ہم دونوں اسے ایک خط لکھیں اور اسے یہاں بلائیں۔"

پڑھی لکھی شریف گھرانوں کی لڑکیاں اس وقت تک ریڈیائی ڈراموں میں حصہ لینے سے گھبراتی تھیں۔ جب میں دہلی آیا تو صرف تین چار لڑکیاں ہی ایسی تھیں جو ہمارے ڈراموں میں حصہ لے سکتی تھیں اور جب نئے ڈھب کے ڈرامے لکھے جانے لگے جن میں متوسط یا اعلیٰ طبقے کی زندگی کی عکاسی ہوتی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے گروپ کو وسیع کیا جائے۔ چنانچہ میں نے بڑی کاوش سے دس بارہ لڑکیوں کا گروپ بنایا تھا جو ہمارے ڈراموں میں حصہ لیا کرتی تھیں۔

ایک روز منٹو نے مجھ سے پوچھا: "دیکھو بھئی تم اپنے ڈرامے کے لئے کتنی لڑکیاں لا سکتے ہو"۔

"کتنی کیا مطلب۔ جتنی کہو"۔

"اب دون کی مت لو۔ میں تم سے پوچھتا ہوں"۔

"پوچھتے کاہے کو ہو۔ تم ڈرامہ لکھو۔ اس میں جتنی چاہے لڑکیاں بھر لو، میں لا دوں گا"۔

"اچھا تو میں ایک ڈرامہ لکھوں گا اس میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہونگی۔ چھبیس ستائیس لڑکیاں رکھوں گا"۔

میں نے کہا: "اور اس کا نام رکھو "ایک مرد"۔

ڈرامہ لکھا گیا۔ براڈکاسٹ بھی ہوا۔ ہر کردار کے لئے لڑکی بھی مل گئی۔

اسی طرح ہر چیز میں مقابلے سے کام لیا جاتا۔ میں نے ایک اچھا افسانہ لکھا تو منٹو نے بھی اور پھر اشک نے بھی۔ اور راشد نے بھی ایک نظم کہہ ڈالی۔ منٹو نے ڈرامہ لکھا تو اشک بھی ضرور لکھیں گے اور پھر میں بھی ان دونوں کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کرتا۔ میرے تمام ریڈیائی ڈرامے جن میں "سرائے کے باہر" بھی شامل ہے انہی دنوں کی پیداوار ہیں۔ جب میرا اور منٹو کا ساتھ تھا۔ وہ دن اتنے اچھے تھے کہ مالی پریشانیوں کے باوجود بھی ہم لوگ بہت خوش رہتے تھے اور بہت لکھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے، تازگی اور توانائی کے ساتھ لکھتے تھے۔ مرجھائے ہوئے دلوں کے ساتھ نہیں۔ انہی دنوں میں منٹو نے اپنی ادبی زندگی کے بہترین ڈرامے اور افسانے لکھے ہیں۔ ان دنوں میں اس کے قلم میں بلا کی روانی تھی اور وہ ہر دوسرے تیسرے روز ایک نئی چیز کوئی ڈرامہ یا افسانہ لکھ ڈالتا تھا۔ لڑنے جھگڑنے کے بعد بھی ہم تینوں میں اس قدر تعاون تھا کہ دن رات اکٹھے رہتے اور اپنے پروگرام کو بہتر بنانے کی تجاویز سوچا کرتے۔ ریڈیو آرٹسٹ خاص طور پر منٹو کو بہت چاہتے تھے۔ منٹو ہماری ریہرسل میں کم آتا تھا لیکن جب آتا تو اپنی پھلجھڑیوں سے ایک ایسی شگفتگی پیدا کر دیتا کہ جس کا تاثر گھنٹوں تک رہتا۔ منٹو کے ڈرامے ان آرٹسٹوں نے جس کاوش اور انہماک سے نشر کئے ہیں اور وہ عوام میں کس قدر مقبول ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ منٹو نے اپنی ریڈیائی ڈراموں کی ایک کتاب ان فنکاروں کے نام معنون کی ہے۔ اسی دوران میں منٹو نے اور میں نے مل کر ایک فلمی کہانی لکھی میرے لئے یہ پہلی فلمی کاوش تھی جس میں میں نے حصہ لیا ہو۔ بنجارا اس کا نام تھا۔ دہلی میں کسی ڈسٹری بیوٹر کے ہاتھ اس نے بیچ دی تھی کیونکہ ان دنوں ہم لوگ نئے سوٹ سلوانا چاہتے تھے اور ابھی ایک لمبے عرصے تک کسی پبلشر سے پیسوں کے آنے کی امید نہ تھی لیکن اس فلمی کہانی کا دلچسپ پہلو ہمارے نئے سوٹ نہ تھے بلکہ کم از کم ہمارے لئے تو یہ ایک تجربہ تھا۔ کہانی سن کر سیٹھ نے کہا:

"کہانی بہت اچھی ہے۔ ہم لوگ خرید لیں گے۔ لیکن منٹو صاحب۔ آپ نے فلم میں مل کے مینجر کو بہت برا بتایا ہے اچھا دکھانا چاہئے ورنہ مزدوروں پہ برا اثر پڑتا ہے"۔

"تو اسے اچھا دکھا دیں گے"!

میں حیرت سے منٹو کی طرف تکنے لگا۔ میں کہنے والا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے"...... اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

اور سیٹھ صاحب پھر بولے: "اور یہ مینجر کی بیوی ہے۔ یہ اگر اس کی کنواری بہن ہو اور ہیرو سے پریم کرے۔ ایک ویمپ کے موافق۔ کیسا رہے گا منٹو صاحب"؟

"بہت اچھا۔ بہت اچھا"، منٹو نے کہا۔ میں پھر حیران رہ گیا۔ یہ وہی منٹو ہے جو کسی کے لئے اپنی ایک سطر تو کیا ایک حرف تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس کے افسانے جوں کے توں شائع ہونے چاہئیں ورنہ وہ افسانہ واپس لے لے گا۔ کیا یہ وہی منٹو ہے؟ میں حیرت سے اس کی طرف تکنے لگا۔

جب ہم سیٹھ سے مل کے باہر آگئے تو منٹو نے کہا: "بھئی یہ ادب نہیں ہے یہ فلم ہے جو پڑھے لکھے اور ذہین اور ادب شناس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہمارے افسانے پرکھنے والے مولانا صلاح الدین ہیں۔ کلیم اللہ ہیں۔ حامد علی خاں ہیں۔ وہ سارو بھائی ڈوکرجی پٹیل یا منگو بھنگو جنگو اینڈ برادرس نہیں ہیں اس لئے فلم میں ماں کو بہن اور بہن کو معشوق اور معشوق کو ویمپ بنا دینا ہمارے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ سمجھے۔ ادب کی خدمت کرو اور فلم سے روپیہ کماؤ۔ اب بولو تمہیں سوٹ چاہئے کہ نہیں"۔

"چاہئے"۔

"تو فلمی کہانی میں تبدیلی ضرور ہوگی"۔

"ضرور ہوگی بھئی"!

مزاج، جسم اور روح کے اعتبار سے منٹو آج بھی کشمیری پنڈت ہے۔ بہت سی باتوں میں وہ اشک سے ملتا جلتا ہے میں جانتا ہوں اسے پڑھ کر اسے بڑی کوفت ہوگی مگر یہ سچائی سے بعید نہیں کیونکہ اشک بھی برہمن ہے۔ پنڈت ہے۔ دونوں لانبے دبلے پتلے ہیں۔ دونوں دن رات انجکشنوں کی فکر میں رہتے ہیں۔ دونوں میں برہمنوں کی ہٹ دھرمی، برہمنوں کی ضد، ان کی ذہانت اور ان کا چڑچڑاپن پایا جاتا ہے۔ دونوں بہت باتیں کرتے ہیں۔ ہاں منٹو کی باتوں میں مزاح، انوکھا پن ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی موضوع پر اس سے گفتگو کیجئے۔ وہ اس پہ ایک نئے انداز سے بولے گا۔ عام راستوں سے بچ کر چلنے کی عادت اب اس کے مزاج کا خاصہ بن گئی ہے۔ وہ اسے ترک نہیں کر سکتا۔ آپ اگر دوستوں کی تعریف کریں تو وہ سامرسٹ ماہم کے گن گائے گا۔ آپ بمبئی شہر کی خوبیاں گنائیں گے تو وہ امرتسر کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا۔ آپ جناح یا گاندھی کی عظمت کے قائل ہوتے نظر آئیں گے تو وہ اپنے محلے کے موچی...... کی عظیم ہستی کا معترف ہوگا۔ آپ گوشت اور پالک پسند فرمائیں گے تو وہ آپ کو دال کھانے کی ترغیب دے گا۔ آپ شادی کرنا چاہیں گے تو وہ آپ کو کنوارا رہنے کے لئے مصر ہوگا۔ آپ کنوارپنے کو بہتر سمجھیں گے تو وہ شادی کی افادی حیثیت سے بحث کر کے آپ کو شادی کے لئے مجبور کرے گا۔ آپ اس کے احسان کی تعریف کریں گے تو وہ برا بھلا کہے گا۔ آپ اسے گالی دیں گے تو وہ آپ کے لئے پانسو روپے کی نوکری ڈھونڈتا پھرے گا۔ منٹو کے مزاج کی طرح اسکی

دوستی، دشمنی اور اس کا انتقام بھی عجیب ہے اور اس میں سچی بشریت کے بہت سے پہلو پائے جاتے ہیں۔ اس کی درشتی، بے باکی اور تلخی ایک قسم کا خول ہے جو اس نے اپنی نرم شخصیت کے تحفظ کی خاطر اپنے اوپر چڑھا رکھا ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے قطعاً مختلف دکھانے کی خواہش دراصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اندر سے بالکل ہمارے ایسا ہے بلکہ ہم سے زیادہ زخمی ہے۔ زیادہ جذباتی ہے۔ زیادہ ہمدرد ہے۔ منٹو کو لوگوں نے اکثر ہنستے ہوئے، شراب پیتے ہوئے، اپنے احباب کا مذاق اڑاتے ہوئے تسلیم شدہ حقیقتوں اور سچائیوں کو طنزیہ انداز میں جھٹلاتے ہوئے دیکھا ہے لیکن میں نے منٹو کو روتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ وہ دنیا کے دکھوں پر نہیں روتا۔ وہ اپنے دکھوں پر نہیں روتا۔ اسے عشق نہیں ہوا تھا۔ اسے کسی خطرناک بیماری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنے ڈیڑھ سالہ بچے کی موت پر رو رہا تھا۔ جس وقت مجھے خبر ملی میں جلدی سے اس کے گھر دوڑا دوڑا گیا، منٹو نے اس طرح اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا گویا کہہ رہا ہو اور تم اب آئے ہو جب کہ وہ مر چکا ہے جبکہ ہم اسے دفنانے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے تم کہاں تھے۔ تم پہلے آتے تو شاید میرا بچہ بچ جاتا —— اس کا گلا رندھا ہوا تھا اور اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور اس نے مجھ سے کہا۔ کرشن! میں موت سے نہیں ڈرتا۔ کسی کی موت سے نہیں متاثر ہوتا۔ لیکن یہ بچہ..... اس لئے نہیں کہتا ہوں کہ یہ میرا بچہ ہے، اس لئے کہتا ہوں تم اسے دیکھتے ہونا..... اس وقت بھی کتنا معصوم، کتنا نیا، کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جب کوئی نیا خیال اپنے اختتام تک پہنچنے سے پہلے ٹوٹ جاتا ہے، اس وقت کتنا بڑا سانحہ ہوتا ہے۔ ہر نیا بچہ ایک نیا خیال ہے۔ یہ کیوں ٹوٹ گیا؟ ابھی میں نے اس کی جانکنی دیکھی ہے۔ میں مر جاؤں، تم مر جاؤ۔ بڈھے جوان، ادھیڑ عمر کے لوگ مر جائیں۔ مرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بچہ، فطرت کو کسی نے خیال کو اتنی جلدی نہ توڑنا چاہیئے —— اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے قنوطی خول کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔

اس کے بعد میں نے اسے روتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن ان آنسوؤں نے مجھے منٹو کے اندر اس گہرے سمندر میں پہنچا دیا جہاں سے اس کے ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس سمندر کا رنگ گہرا سبز و سنہرا ہے اس کا پانی کھاری ہے اور شارک مچھلیاں اور آکٹوپس اور دوسرے خطرناک سمندری جانور بھی اس کی تہ میں چھپے ہوئے ہیں لیکن یہاں رنگا رنگ کو دل کی شاداب چٹانیں بھی ہیں جن کے مخملیں سبزوں پر سیپ کے موتی آرام کر رہے ہیں۔ اس عجیب و غریب منظر کو میں نے صرف ایک بار دیکھا ہے۔ آپ نے وہ موتی دیکھے ہیں جو منٹو ایک غواص بن کر اپنے دل کی گہرائیوں سے نکال لاتا ہے۔ یہ اس کے خون کی جمی ہوئی بوندیں ہیں جن پر وہ اپنے طنز اور قنوط سے جلا کر کے ایک استہزائیہ انداز میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ آپ اس کے انداز پہ نہ جائیے۔ یہ سچے موتی ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ ہم ان کی قدر نہیں کرتے۔ کہنے کو تو ہندوستان ادب، تہذیب اور کلچر اور فنونِ لطیفہ کا گہوارہ رہا ہے لیکن صدیوں سے ہم نے اپنے عظیم فن کاروں سے ایسی شدید لاپرواہی برتی ہے کہ اب ہمیں اپنے جرم کا احساس تک نہیں ہوتا۔ میرے سامنے سہگل کی مثال ہے۔ جب سہگل کا انتقال ہوا تو ہمارے ملک کی عظیم ترین شخصیتوں سے ایک کلمۂ تاسیف بھی نہ نکلا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو دن رات اپنی تہذیب و تمدن اور کلچر کی بقا کے رونے رویا کرتے ہیں۔ لیکن ان سے کبھی پوچھئے کہ ہندوستان کے عظیم فن کار، ادیب، آرٹسٹ، مغنی، مصور کون کون سے ہیں اور آجکل کیا کر رہے ہیں تو ان کی زبان گنگ ہو جائے گی اور یہ اپنی عدیم الفرصتی کا بہانہ کر کے خاموش ہو جائیں گے۔

منٹو کو اچھے کپڑوں کا شوق نہیں۔ اسے اچھے گھر، اچھے کھانے اور اچھی شرابوں کا شوق ہے۔ اس کا گھر ہمیشہ آپ کو قرینے سے سجا ہوا ملے گا۔ وہ ایک صاف ستھرے پاکیزہ ماحول میں کام کرنے کا عادی ہے۔ صفائی، باقاعدگی اور عمدگی اس کے مزاج کا خاصہ ہیں۔ وہ لاابالی پن، پھوہڑ پن جو اکثر ادیبوں کے گھروں میں آپ کو ملتا ہے منٹو کے ہاں نہیں ملے گا۔ منٹو کے گھر میں آپ کو کوئی بات ٹیڑھی نہیں ملے گی۔ صرف صاحبِ خانہ کی سوچ ٹیڑھی ہے۔ ٹیڑھی ہے لیکن اس میں بھی ایک واضح ترتیب ہے جس کا انکشاف بالعموم افسانے کے اختتام پر ہوتا ہے۔ منٹو کے افسانے اس کے مزاج اور اس کے ماحول کے آئینہ دار ہیں۔ منٹو اپنے افسانوں کا لباس نفاست سے تیار کرتا ہے۔ ان میں کہیں جھول نہیں آتا۔ کہیں کچے ٹانکے نہیں ہوتے۔ بخیہ عمدہ ہوتا ہے۔ استری شدہ صاف ستھرے افسانے، زبان منجھی ہوئی، سلیس، سادہ، ہاں اس کے افسانوں کے رنگ عجیب ہوتے ہیں۔ ان کی تراش نرالی ہوتی ہے اس کے استعارے اچھوتے ہوتے ہیں۔ ان میں رس، شعریت اور شفقی اوصاف نہیں ہوتے، وہ ادب میں حسن نہیں اقلیدس کا قائل ہے۔ ہر چیز نپی تلی رکھتا ہے۔ وہ اپنے استعاروں کے مفہوم، تاثر اور حدود اربعہ سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور لاشعوری حسن سے نہیں ایک متعین ترتیب اور جیومیٹری کی اشکال سے تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے اور اکثر رومانیت پسندوں سے کہیں زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ منٹو زمین کے بہت قریب ہے، اس قدر قریب کہ اکثر گھاس کے خوشے میں رینگنے والے کیڑے بھی اپنے تمام اوصاف کے ساتھ اسے نظر آجاتے ہیں اور جو لوگ زندگی کو ایک اوپری، چھچلتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ منٹو کے عمیق مشاہدے اور اس کی ژرف نگاہی کی داد دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کہیں کہیں اس کی حد سے بڑھی ہوئی انا اسے دھوکا دے جاتی ہے یا ایسا ہوتا ہے کہ وہ گھاس کے کیڑوں اور آسمان میں اڑتے ہوئے بادلوں کے درمیان زندگی اور ادب کا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا اور انفرادی اور نراجی روش اختیار کر لیتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اس کی بیشتر تخلیقات عظیم بشریت کے نصب العین پر پوری اترتی ہیں اور اپنی سادگی اور سچائی اور تلخی کے اندر ایک ایسے شیریں حسن کی نمود رکھتی ہیں کہ جس کے حصول کے لئے انسان کا سینہ آج تک ترس رہا ہے۔

شروع شروع میں منٹو پر روسی تخلیقات کا نمایاں اثر تھا۔ اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ دنیا بھر کے ترقی پسند ادیبوں نے بلکہ ایسے ادیبوں نے بھی جو اپنے خیالات میں رجعت پسند تھے روسی ادب کی وراثت سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن تھوڑے عرصے ہی کے بعد منٹو نے اپنا طرزِ انشا اختراع کر لیا جو اسی کا ہے۔ عباس، اشک، عصمت اور کرشن چندر کے بہتیرے نقال آپ کو مل جائیں گے لیکن منٹو اور کسی حد تک بیدی کے طرزِ انشا کو آج تک کوئی اپنا نہ سکا۔ اردو ادب میں ایک ہی منٹو ہے اور ایک ہی بیدی ہے۔ باقی ادیبوں کی ملتی جلتی تصویریں آپ کہیں نہ کہیں ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ خاص طور پر جنسیات کے مسئلے پر جس بیباکانہ انداز میں منٹو نے قلم اٹھایا ہے، ہمارے ادب میں اور ہندی ادب میں اور جہاں تک میں نے مرہٹی اور گجراتی، بنگالی زبانوں کے تراجم پڑھے ہیں، دوسری زبان میں بھی اس کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ منٹو نے پہلے تو شرم اور شرم کے خول اکھاڑے، پھر غلاظت کی تہوں کو صاف کیا اور پھر اصل موضوع کو صابن سے دھو دھو کر اتنا چمکایا کہ آج ہم میں سے ہر شخص جنس کی اہمیت اس کی پیچیدگیوں اور اس کے گوناگوں تاثرات سے بخوبی واقف نظر آتا ہے۔ اس جنسی تعلیم کے لئے ہم بڑی حد تک منٹو کے معترف ہیں۔ یہ تعلیم اس نے اپنی جوانی اور اپنی صحت کو کھو کے ہمیں دی ہے۔ بمبئی کی چالیں، بمبئی کی گلیاں، بمبئی کے شراب خانے، بمبئی کے قمار خانے،

بمبئی کے قحبہ خانے ——— منٹو نے بمبئی کی جرائم پیشہ دنیا کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ سچائی کی تلاش میں وہ اس کیچڑ کے اندر گھٹنوں گھٹنوں دھنس گیا۔ اس کے کپڑے ضرور آلودہ ہو گئے لیکن اس کی روح کبھی میلی نہیں ہوئی۔ اس کے افسانوں کے اندر چھپا چھپا کرب اس کا گواہ ہے۔ وہ عورت کی عزت کا، اس کی عصمت کا اور اس کے گھریلو پن کا جس قدر قائل ہے کوئی دوسرا مشکل سے ہو گا۔ اس لئے جب وہ عورت کی عزت کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے، اسے اپنا ناموس کھوتے ہوئے دیکھتا ہے، اس کے گھریلو پن کو لٹتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بے قرار ہو جاتا ہے اور بے تاب ہو کر جاننا چاہتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور جب وہ ہر بار اپنے مشاہدے کو بروئے کار لا کر ایک ہی تسلسل کو ایک ہی ترتیب کو سماج کے ایک ہی نظام کو دیکھتا ہے تو غصے میں آکر اسے تھپڑ مارنا چاہتا ہے۔ منٹو اپیل کا قائل نہیں۔ وہ ڈرانے اور تھپڑ مارنے کا قائل ہے۔ اس کے ہر افسانے کے آخر میں ایک طمانچہ ہوتا ہے جو پڑھنے والے کے منہ پر اس بری طرح پڑتا ہے کہ قاری بھنا کے رہ جاتا ہے اور منٹو کو صلواتیں سنانے لگتا ہے لیکن منٹو اس طمانچے سے باز نہیں آتا۔ کبھی نہیں آئے گا۔ جسے بہت سے نقاد منٹو کی اذیت پسندی کہتے ہیں۔ وہ اس کی اذیت پسندی اس قدر نہیں ہے بلکہ اس کی زخمی انسانیت کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے اور یہی چیز آپ کو منٹو کے اطوار و گفتار، اس کے تخلیقات اس کے قول و فعل میں ہر جگہ دکھائی دے گی۔ منٹو کی زندگی کی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس کی زندگی میں نہیں کہی جا سکتیں اور اس لئے لکھی بھی نہیں جا سکتیں۔ لیکن ایک واقعہ میں یہاں لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں شالیمار پکچرز پونا میں ملازم تھا اور بمبئی میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ اچانک میری ملاقات منٹو سے ریل گاڑی میں ہو گئی۔ کوئی دس پندرہ منٹ تک ہم لوگ اکٹھے رہے۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد منٹو نے یکایک مجھ سے پوچھا:

”بھئی میں نے پونا میں ایک لڑکی ”ش“ صاحب کے پاس بھیجی تھی۔ ایکٹرس بننے کی خواہش مند تھی۔ اس کا کیا ہوا۔“

میں نے کہا: ”وہ لڑکی تو ”پ“ صاحب کے پاس ہے آجکل“ ——— پھر میں نے پوچھا: ”تم نے تو اس کا مطالعہ کیا ہو گا؟“

منٹو نے نہایت سنجیدگی سے کہا: ”لاحول ولاقوۃ ..... میں تو صرف طوائفوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میں شریف لڑکیوں کے نزدیک نہیں پھٹکتا۔“

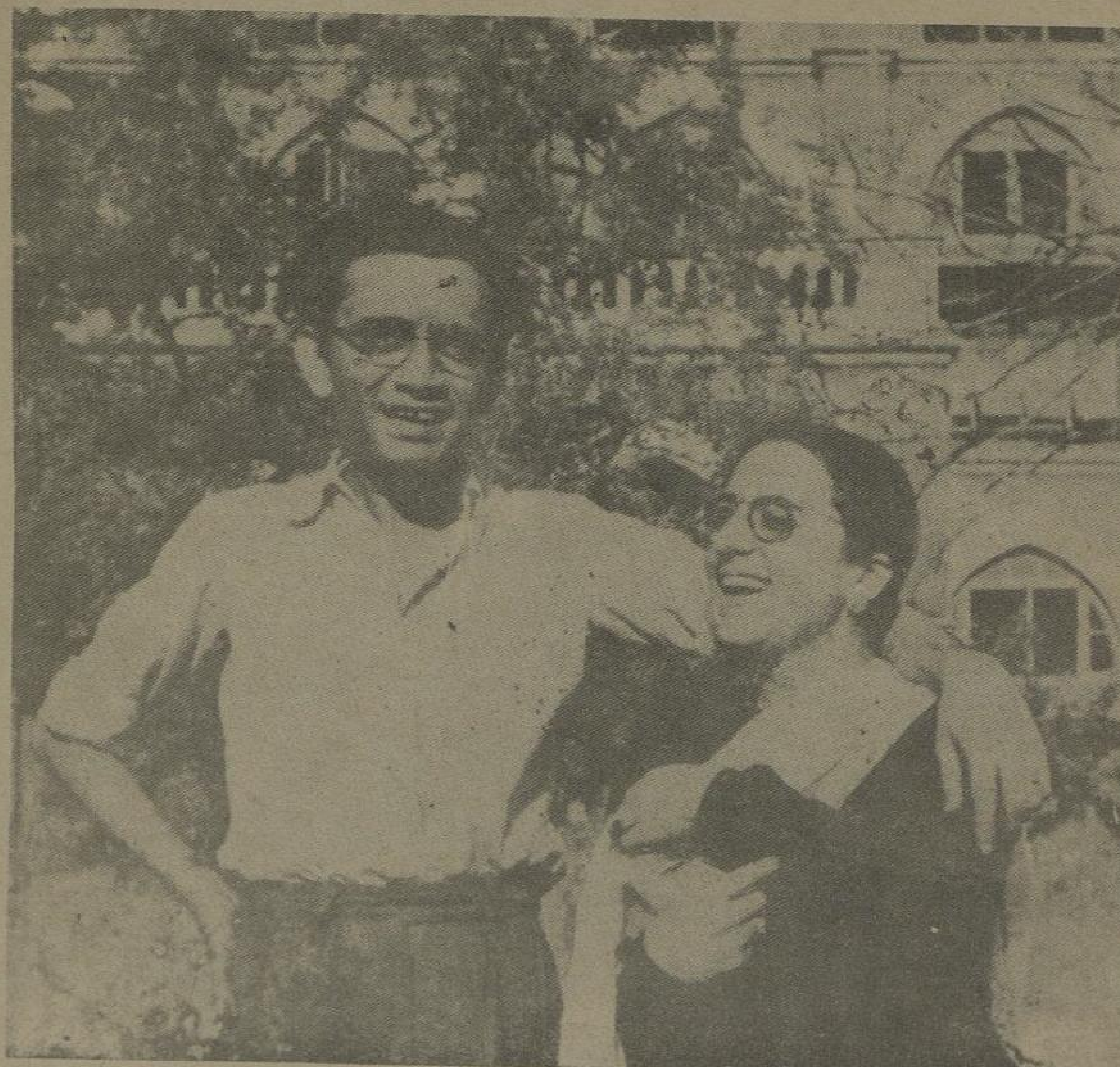
یہ منٹو کا خاص انداز ہے۔ پھر اس نے رک کر کہا: ”مجھے تو بیچاری بڑی شریف معلوم ہوتی ہے مگر پیٹ بری بلا ہے۔“

پھر وہ دیر تک چپ رہا اور میں نے محسوس کیا کہ اس انسان کے اندر کتنی جھجک، شرم اور پاکیزگیِ نفس ہے۔ وہ عورت کو کس قدر صاف ستھرا، پاکیزہ اور عصمت پرور دیکھنا چاہتا ہے اور جب کوئی زندگی اور تخلیق اور حسن کے منبع کو غلاظت اور آلودگی سے پاک دیکھنا چاہے تو اس کے صحت مند نظریے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اس کی ادبی دیانت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ اس کے سرچشمہ اخلاص کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ کم از کم مجھے اس کا پورا پورا یقین ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ منٹو محض مجھے جھٹلانے کے لئے دو ایک افسانے ابھی میرے تکذیب دعوے میں لکھ دے..... وہ اس قسم کی حرکت کر سکتا ہے لیکن یہ ردِ عمل اس کے جوہر، اس کی اپج اور اس کی فنی استعداد کی دلیل نہیں ہے۔ اس کے جوہر کا غالب حصہ انسانی حسن، انسانی ہمدردی اور انسانیت کو بہتر بنانے کی آرزو کی غمازی کرتا



تک





منٹو
اور
صفیہ منٹو



منٹو
اور
اس کی
بیٹیاں



ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہیں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل میں خون میں ٹپک رہی ہے۔ اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی بانہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور وہ نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ اپنے جوڑے میں غالباً لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود اور گلے ہوئے سنگتروں کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر اور پتنگے اڑ رہے تھے۔ پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک

کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے داہنے ہاتھ پر ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹیبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوارگیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لئے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوارگیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے سے لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں اس لئے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانے پڑتے تھے جو اس نے خاص اسی کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ کرنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آکر سوگندھی پر دھاوے بولتا ہے تو کہا تھا:

"اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے ——— یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے۔ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے ——— سات سال سے دھندا کر رہا ہوں ——— تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا، سوگندھی کو بتایا:

"سالی۔ اپنا دھن یوں برباد نہ کر ——— تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار۔ اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ آیا کرے تو اس سے کہا کر ——— "تیری جان کی قسم مادھو۔ آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ نیچے والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" ——— سمجھیں! بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان ——— اس سالی کانگرس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔"

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا: "نیچے سے ان سیب کے گولوں کو باندھ کر رکھا کر۔ انگیا پہنے گی تو ان کی سختائی ٹھیک رہے گی۔"

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی:

"جمنا تو سب کو اپنے سر کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری لوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہوگا ـــــ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ ـــــ ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں۔ رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا۔ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی ـــــ ارے وہ تو ڈرنے لگا۔ سنتی ہے تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا ـــــ وہ ڈر گیا ـــــ میں نے کہا، چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو۔ تین بجنے والے ہیں۔ ابھی دن چڑھ جائے گا ـــــ بولا روشنی کرو۔۔۔۔ روشنی کرو ـــــ میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا ـــــ بولا۔۔۔ لائٹ۔۔۔۔ لائٹ ـــــ اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ "بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی"۔ اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی۔۔۔۔ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ آن کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا۔ "تجھے شرم نہیں آتی مردوے" ـــــ وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی ـــــ وہ پھر گھبرانے لگا ـــــ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی۔ کبھی اندھیرا، کبھی اجالا، کبھی اجالا کبھی اندھیرا ـــــ ٹرام کی کھڑکھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا ـــــ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا ـــــ جمنا! تو بالکل الھڑ ہے۔ بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لئے"۔

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے جو اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتا دیا کرتی تھی ـــــ "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو۔ ان گنت باتیں کرو۔ اسے چھیڑو، ستاؤ۔ اس کے گدگدی کرو۔ اس سے کھیلو ـــــ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو ـــــ پیٹ بڑا ہو تو تھپ تھپاؤ ـــــ اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے ـــــ وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی۔۔۔۔ ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن۔ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے"۔

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں ـــــ ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں۔۔۔۔ جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لئے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات۔۔۔۔ کوئی کومل بول اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے۔ وہ تھکن چاہتے تھے ـــــ ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر ـــــ انہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے یا ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے کتنی مزیدار ہوتی ہے ـــــ وہ بیہوشی

جو مار کھا کے بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے کتنا آنند دیتی ہے ——— کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا۔ دائیں ہوا، بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا۔ اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزہ دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی تو نا کافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزہ دیا کرتی تھی۔

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی آنکھ مچولی ہی تو تھی ——— کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا ——— بس یوں اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لئے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے بے شمار گر یاد تھے اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا:

"سوگندھی۔ میں تجھ سے پریم کرتا ہوں"۔

اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہو ——— پریم ——— کتنا سندر بول ہے۔ وہ چاہتی تھی اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے۔ اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے ——— یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹ کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کئے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپ تھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود ہی میں سلا دے۔

پریم کر سکنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا:

"سوگندھی ۔ ۔ ۔ ۔ تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے

اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی تاہم وہ چاہتی تھی کہ یونہی اس کے دن بیتتے چلے جائیں۔ اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال دلال اپنی کمیشن کے کاٹ لیا کرتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لئے کافی تھا اور مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لئے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی۔ یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا۔ اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اسے چھپانا کیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں ــــ سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا:

"تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے۔ جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے ــــ اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں ــــ چھی چھی چھی ــــ دس روپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ــــ اب ان ساڑھے سات، روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی۔ اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ــــ مجھے عورت چاہیئے پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیئے ــــ مجھے تو کوئی بھی عورت بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں ــــ تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں ــــ بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے، تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ــــ کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری ــــ پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لئے ــــ یہ دھندا چھوڑ ــــ میں تجھے خرچ دے دیا کروں گا ــــ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا سوگندھی پر اس قدر زیادہ اثر ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا:

"سوگندھی! بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا ــــ اور پانی کا یہ گھڑا ــــ دیکھو کتنا میلا ہے اور یہ ..... یہ چیتھڑے ــــ یہ چندیاں ــــ اف کتنی بری باس آتی ہے، اٹھا کر باہر پھینک ان کو ــــ اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ... اور .... اور ....."

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے جس میں گھریلو پن آسکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا۔ "دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے ــــ ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔" ــــ مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی

کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو ـــــ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پُونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا:

"دیکھ سوگندھی! اگر تُو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تُو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا ـــــ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پُونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ـــــ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ـــــ"

نہ مادھو نے کبھی پُونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا: "تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تُو نے؟" اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا: "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جبکہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں......؟" دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے ـــــ لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے وہ آف کرنا بھول گئی تھی اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مُندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی ـــــ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا۔ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھی ـــــ دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیسدار تھا۔ دھوتی کے پلّو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے پی لیا اور دوسرا ڈونگا غٹاغٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا:

"رام لال؟"

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا بھنّا کر کہنے لگا: "تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟" پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا: "اندر کوئی ہے تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا: "نہیں"...... تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ ...... "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی...... بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا۔ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن۔ پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ۔ باہر موٹر میں

ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ـــــ چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا: "رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔"

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا: "تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔"

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی: "وہ بات نہیں رام لال ..... ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں رات بہت پی گئی۔"

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا: "تھوڑی بچی ہو تو لا ـــ ذرا ہم بھی منہ کا مزہ ٹھیک کرلیں۔"

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا: "بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا۔ دیکھ رام لال وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔"

رام لال نے جواب دیا: "نہیں بھئی وہ اندر نہیں آسکتے۔ جنٹرمین آدمی ہیں۔ وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے ـــــ تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کی نکڑ تک چل ـــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جبکہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا، کبھی قبول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا اس لئے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور کہا تھا کہ "بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔"

مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی کو ہی کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخی پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہولی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی ـــــ سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا: "لیجئے وہ آ گئی..... بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع

کئے "...... پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا: "سوگندھی۔ ادھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ جی نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی۔ اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے "اونہہ" نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن جاگا اور کار یہ جا وہ جا۔

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا ـــــ اس "اونہہ" کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھن بھنا رہی تھی ـــــ کیا ـــــ کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی: "پسند نہیں کیا تجھے ـــــ اچھا بھئی میں چلتا ہوں ـــــ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کئے ـــــ!"

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اس کی باہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت کا ارادہ پیدا ہوا۔ کہاں تھی وہ موٹر ـــــ کہاں تھا وہ سیٹھ ـــــ تو "اونہہ" کا مطلب یہ تھا۔ اس نے مجھے پسند نہیں کیا ـــــ اس کی..... ـــــ گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال لال انگارہ "اونہہ" ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے "او سیٹھ! ذرا موٹر روکنا اپنی..... بس ایک منٹ کے لئے" ـــــ پر وہ سیٹھ، لعنت ہے اس کی ذات پر، بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی۔ رات کے پچھلے پہر کی ہلکی ہلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ اور اس کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اڑا دے، کیونکہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر "اونہہ اونہہ" کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہ سوچا۔ "میں نے اس موٹے کو دکھانے کے لئے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے۔ پر..... پر..... یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور..... یہ بازار..... اور وہ موٹر اور وہ بیٹری کی چمک....." یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حدِ نگاہ تک فضا میں ادھر ادھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑپھڑاہٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا

لگا کہ سر درد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ پہلے بھی درد ٹپک رہا تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے۔ اس کے سر میں درد ہو۔ اس کی ٹانگوں میں درد ہو۔ اس کے پیٹ میں درد ہو۔ اس کی باہوں میں درد ہو۔ ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔

یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔ کیا یہ درد تھا؟ ایک لمحے کے لئے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا — لعنت! یہ وہی "اونہہ" تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا کہ "تجھے پسند نہیں کیا۔" اسے — اسے صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی۔ نہیں آئی تو کیا ہوا — مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی — وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا کتنی بری صورت تھی اس کی۔ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی۔ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی۔ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ ٹھیک ہے، پر سوگندھی! — تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔ تو نے اس کو ٹھکرایا نہیں تھا۔ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔ اونہہ — اس اونہہ کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔ اونہہ یہ منہ اور مسور کی دال۔ ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ لایا ہے۔ اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو — دس روپے اور یہ عورت — خچر کیا بری ہے؟ —

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کی باہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔ اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو صرف ایک بار — وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے۔ موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ "اونہہ" کی آواز آئے اور وہ — سوگندھی — اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور — اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔ بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے — جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لئے آیا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا:

"تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو —"

آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں

میں سے دیر تک اس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ ——— یہ آواز کہاں سے آئی؟ ——— سوگندھی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا۔ ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے۔ اس کا دل اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑ دھڑ یوں کرتا تھا بالکل اس گھِسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رک جاتا تھا۔ "رات کٹی گن گن تارے" "کتنا کتنا رے تارے" کی رٹ لگائے دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا: "کتنے سندر ہیں" ——— وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے۔ پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دل میں گودا۔ "تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے ——— کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے۔"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کرکے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کر دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔ بڑی ملنسار تھی۔ بڑی رحمدل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اس کے دس روپے واپس کر دیئے تھے۔

"مجھ میں کیا برائی ہے؟" سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری۔ ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا۔ پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے۔ کوئی.... کوئی...... اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے: "سوگندھی! کون کہتا ہے تو بری ہے۔ جو تجھے برا کہے وہ آپ برا ہے۔" ——— نہیں کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا: "سوگندھی! تو بہت اچھی ہے"۔

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا

چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں "ماں" بن رہا تھا۔ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لئے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔ اپنے گرم گرم گال۔ اور اس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی، ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں، اس کی باتیں سمجھتا تھا۔ اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی ـــــ وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے ـــــ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر اُبل رہا ہے ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو ـــــ کیسے ہو؟ ـــــ

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے کے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا ـــــ اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ـــــ اور ـــــ

"نہ آئے ـــــ بلا سے ـــــ میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں ـــــ گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردِ سر ہی تو ہے ـــــ چل سوگندھی۔ گھر چل ـــــ ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا ـــــ فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ سیٹھ اور اس کی موٹر کی ایسی تیسی!"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا ہے اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کی طرح پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے رونگٹے رونگٹے پر چھا گیا۔ قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر، باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے ابھی ابھی اس کی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ..... اس سیٹھ نے ..... پرماتما کرے ..... سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بددعا دے مگر سوچا، بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ـــــ اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا ـــــ کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی ـــــ "یہی لینے آیا تھا نا تو ـــــ لے دام دیئے بنا لے جا اسے۔ یہ جو کچھ میں ہوں۔ جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا"۔

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر اس سیٹھ سے ایک بار صرف ایک بار ..... اس کی

مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے ـــــ نہیں نہیں یہ کرے ـــــ یوں اس سے انتقام لے ـــــ نہیں نہیں یوں ـــــ لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی۔ بس صرف ایک چھوٹی سی گالی جو اس کی ناک پہ چیکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اس ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی۔ کنڈے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا:

"آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا ـــــ صبح کی سیر تندرستی کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اس طرح صبح اٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آتی ہو گی تو؟ ـــــ کیوں؟"

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا ایک بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی: "میں آج تیرا انتظار ہی کر رہی تھی"۔

مادھو بڑا سٹپٹایا ـــــ "انتظار ـــــ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں"۔

سوگندھی کے بھنچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی: "میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا۔ اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سو جی نے کہا۔ چلو کہیں باہر گھوم آئیں ـــــ اور ـــــ"

مادھو خوش ہو کر بولا: "اور میں آ گیا۔ بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ـــــ تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا"۔

سوگندھی نے جواب دیا: "چار بجے کے قریب"۔

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا: "اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا ـــــ جیسے تو پھولوں والی ساڑھی ـــــ ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں ـــــ کیا تھا تیرے ہاتھوں میں ـــــ ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا: "مادھو! تو چنتا کیوں کرتا ہے لے یہ تھیلی ـــــ ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں" ـــــ سوگندھی تیری جان کی قسم! فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا ـــــ کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے ـــــ بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس روپے ہوں تو . . . . . انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے ـــــ تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا، میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا

کرتی ہے ____ ادھر میری طرف پیر کرکے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بازوؤں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اس لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا مادھو سے کہنے لگی:

"مادھو! یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے ____ جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے ____ بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے ____ جان بچی لاکھوں پائے ____ بس بس اب جانے دے۔ تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے ____ مٹھی چانپی چھوڑ اور مجھے ساری بات بتا ____ کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے ____ واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا: "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا ____ اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو ____ زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی: "ہمارا فوٹو اترے گا۔ ہمارا فوٹو اترے گا۔"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی ____ اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا: "کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی:

"اس کی ____ منسپلٹی کے اس داروغہ کی ____ ذرا دیکھ تو اس کا تھوبڑا ____ کہتا تھا ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی ____ اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال!" یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا: "رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی!"

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ اس پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہو۔

مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا: "ہی ہی ہی ..."

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا: "اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے۔ بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا ۔۔۔ کیوں مادھو!"

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور پھر ہنسا: "ہی ہی ہی ....."

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا: "اچھا کیا ۔۔۔ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی: "تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا ۔۔۔ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کونسی چیز جو کسی کو پسند آسکتی ہے ۔۔۔ یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سُوجے ہوئے نتھنے، یہ تیرے مڑے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل ۔۔۔ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ ۔۔۔ پسند کیوں ہوتا۔ تیرے عیب جو چھپائے ہوئے تھے اس نے ۔۔۔ آجکل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی بُرا۔"

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا: "دیکھو سوگندھی! مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تُو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کر دیا ہے ۔۔۔ اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں ....."

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا ۔۔۔ "اگر تُو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا ۔۔۔ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پُونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ۔۔۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا: "میں بتاتی ہوں ۔۔۔ پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا ..... اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے ہوتے ہیں۔ باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ۔۔۔ ان ساڑھے سات روپیوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تُو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تُو لے ہی نہیں سکتا تھا ۔۔۔ تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری ۔۔۔ پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں۔ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا: "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا: "یہ چیتھڑے، یہ چندیاں ـــــ اُف کتنی بُری باس آتی ہے۔ اٹھا کے باہر پھینک ان کو ـــــ"

مادھو چلایا: "سوگندھی"۔

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا: "سوگندھی کے بچے تُو آیا کس لئے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے یہاں جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تُو کوئی ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پہ عاشق ہو گئی ہوں ـــــ کُتّے، کمینے! مجھ پر رعب گانٹھتا ہے۔ میں تیری دبیل ہوں کیا ـــــ بھک منگے تُو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے ـــــ میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟ ـــــ چور یا گٹھ کترا ـــــ اس وقت تُو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے ـــــ بلاؤں پولیس کو ـــــ پُونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پہ ایک کیس کھڑا کر دوں"۔

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا: "سوگندھی تجھے کیا ہو گیا ہے"

"تیری ماں کا سر ـــــ تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسا سوال کرنے والا ـــــ بھاگ یہاں سے ورنہ...."

سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کُتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔ مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی:

"خبردار ـــــ پڑی رہنے دے وہیں۔ تُو جا ـــــ تیرے پُونا پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی"۔ یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی ـــــ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی ـــــ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو پہلے کبھی اس نے نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے ـــــ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب سٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے ـــــ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پُر کرتی تھی ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی خالی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اسے اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔



گنجے فرشتے

سعادت حسن منٹو

"ٹھنڈا گوشت" کا مقدمہ قریب قریب ایک سال چلا۔ ماتحت عدالت نے مجھے تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دی۔ سیشن میں اپیل کی تو بری ہو گیا۔ (اس حکم کے خلاف سرکار نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی ہے مقدمے کی سماعت ابھی تک نہیں ہوئی)۔

اس دوران میں مجھ پر جو گزری اس کا کچھ حال آپ کو میری کتاب "ٹھنڈا گوشت" کے دیباچے بعنوان "زحمتِ مہرِ درخشاں" میں مل سکتا ہے۔ دماغ کی کچھ عجیب ہی کیفیت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پروا ہو کر قلم زنی کرتا رہوں۔ سچ پوچھیے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا کوئی چیز الاٹ ہو جائے تو آرام سے کسی کونے میں بیٹھ کر چند برس قلم اور دوات سے دور رہوں۔ دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو انہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دوں۔ الاٹ منٹ میسر نہ ہو تو بلیک مارکیٹنگ شروع کر دوں یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں۔ آخر الذکر کام میں نے اس لیے نہ کیا کہ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ ساری شراب میں خود پی جایا کروں گا۔ خرچ ہی خرچ ہوگا۔ آمدن ایک پیسے کی بھی نہ ہوگی۔ بلیک مارکیٹنگ اس لیے نہ کر سکا کہ سرمایہ پاس نہ تھا۔ ایک صرف الاٹ منٹ ہی تھی جو کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ کو حیرت ہوگی مگر یہ واقع ہے کہ میں نے اس کے لیے کوشش کی۔ پچاس روپے حکومت کے خزانے میں جمع کرا کے میں نے درخواست دی کہ میں امرتسر کا مہاجر ہوں، بے کار ہوں اس لیے مجھے کسی پریس یا سینما میں حصہ الاٹ فرمایا جائے۔

درخواست کے چھپے ہوئے فارم تھے۔ ایک عجیب و غریب قسم کا سوالیہ تھا۔ ہر سوال اس قسم کا تھا جو اس امر کا طالب تھا کہ درخواست کنندہ پیٹ بھر کے جھوٹ بولے۔ اب یہ عیب مجھ میں شروع سے رہا ہے کہ جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ میں نے الاٹ منٹ کرانے والے بڑے بڑے گھاگوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہیں جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔ میں راضی ہو گیا۔ لیکن جب چھپے ہوئے فارم کی خالی جگہیں بھرنے لگا تو روپے میں صرف دو یا تین آنے جھوٹ بول سکا اور جب انٹرویو ہوا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ:

"صاحب! جو کچھ درخواست میں ہے سب جھوٹ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ہندوستان میں کوئی بہت بڑی جائداد چھوڑ کے نہیں آیا۔ صرف ایک مکان تھا اور بس۔ آپ سے میں خیرات کے طور پر کچھ نہیں مانگتا۔ میں بزعمِ خود بہت بڑا افسانہ نگار تھا لیکن اب مجھے محسوس ہوا کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں۔ اللہ میاں، میاں ایم۔ اسلم اور دت بھارتی کو سلامت رکھے۔

میں ان کے حق میں اپنی افسانہ نگاری سے سبک سر ہوتا ہوں اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ حکومت مجھے کوئی ایسی چیز الاٹ کر دے جس کیلئے مجھے کام کرنا پڑے اور اس کام کی اجرت کے طور پر مجھے پانچ چھ سو روپیہ ماہوار مل جایا کرے۔"

حیرت ہے کہ میری اس گفتگو کا اثر ہوا۔ قریب تھا کہ مجھے کسی برف خانے میں کوئی حصہ الاٹ ہو جائے کہ بورڈ کے ممبروں سے کسی نے کہہ دیا کہ تم لوگ یہ کیا غضب کر رہے۔ یہ شخص جس کا نام سعادت حسن منٹو ہے ترقی پسند ہے۔ چنانچہ یک قلم میری درخواست مسترد کر دی گئی۔

ادھر یہ ہوا۔ اُدھر ترقی پسند مصنفین نے رجعت پسند قرار دے کر میرا حقہ پانی بند کر دیا......... یہ بھی خوب لطیفہ رہا۔ بہت دیر تک سوچا کیا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ "مولے نے اوڑک ہٹی بہناں"۔ چنانچہ قلم اٹھا کر پھر لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن لکھنے سے پہلے یہ مرحلہ درپیش ہوا کہ موضوع کیا ہو۔ فورم کیسی ہو۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی جان پہچان کے ایکٹر، ایکٹرسوں پر کچھ لکھوں۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون چنانچہ "پری چہرہ نسیم بانو" کے عنوان سے ہوا جو روزنامہ آفاق میں چھپا۔ میں خوش تھا کہ ایک رستہ نکل آیا ہے۔ جو حکومت کے احتساب سے پاک صاف رہے گا اور طہارت پسند لوگوں کے لئے موجب اطمینان ہو گا۔ لیکن یہ مضمون چھپتے ہی طوفان برپا ہو گیا۔ آفاق کے دفتر میں بے شمار خطوط آئے جن میں مجھے ملعون و مطعون گردانا گیا۔

۴۔ جولائی کے آفاق میں ایک صاحب قاضی م بشیر محمود صاحب ادیب فاضل کا ایک خط ایڈیٹر کے نام چھپا۔۔۔ ان کا ملخص ملاحظہ فرمائیے:

سعادت حسن منٹو کا مضمون..... بے ضرر سا مضمون "پری چہرہ نسیم بانو" نظر سے گزرا۔ ساتھ ہی نسیم بانو کا مکتوب اپنے بھائی کے نام بھی پڑھا۔

منٹو نے بڑے اطمینان سے اور لطف لے لے کر بہن کے بتمامہا وصف، مناقب، لغزشیں اور حکایتیں، توضیح اور وضاحت کے ساتھ رقم کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہن کی قدر و منزلت، ساکھ اور وقعت اور وقار کو کچھ حد تک نظر انداز کر چکے ہیں..... کسی حد تک یہ بہن کی توہین و تذلیل میں شمار ہو گا۔

ایسا لکھتے ہوئے انہیں حجاب و تامل کو خدا حافظ کہنا پڑا ہو گا۔ مجھے ان کے الفاظ پر اعتراض نہیں۔ حروف و سکنات پر گرفت نہیں اور نہ ہی مضمون پر حرف گیری کر رہا ہوں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ کیا نسیم بانو، منٹو صاحب کی حقیقی بہن ہے؟..... کیا منٹو اس کے معاشقے پر روشنی ڈالنے کی قوت اور جسارت رکھتا ہے؟

منٹو بڑا شریر ہے۔ میرے دل میں اس کی بے انتہا عزت ہے۔ میں اس کے کافی کارنامے دیکھ چکا ہوں۔ اب ایک اور "بے ضرر قسم کا" کارنامہ بھی لگے ہاتھوں دیکھ لیا۔ میں منٹو دوست کی "پری چہرہ نسیم بانو" پر رائے زنی یا نکتہ چینی نہیں کر رہا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں...... اور پھر اپنے منٹو پر نکتہ چینی کر بھی کیسے سکتا ہوں۔ اس کی بلند آشیانی تک ابھی میری پہنچ نہیں!

یہ خط پڑھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ اسے دور کرنے کے لئے میں نے یہ چند حروف لکھ کر محمد سرور صاحب کو بھیج دیئے۔ اس خط پر اور ایسے ہی دوسرے خطوں پر جو اس مضمون کے متعلق "آفاق" اور دوسرے اخباروں میں چھپتے رہے، میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

سرور صاحب نے شروع میں ان خطوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور مجھ سے کہا:

"تم لکھتے رہو۔ یہ سلسلہ کافی دلچسپ ہے، جاری رہنا چاہئے"۔

میں نے جاری رکھا۔ لعنت ملامت بھی جاری رہی۔ شیام پر مضمون چھپا تو سیالکوٹ کی ایک خاتون بیز بانو صاحبہ نے ایک طویل خط لکھا جسے پڑھ کر یقین مانئے مجھے بہت ترس آیا۔ اس کے چند اقتباس دیکھئے:

میں سینما دیکھنا گناہ کبیرہ میں شمار نہیں کرتی۔ تصویروں پر نظر پڑتے ہی آنکھوں پر پٹی باندھ نہیں دوڑتی مگر میرے پاس بچے ہیں اور میری آرزو ہے کہ وہ نیک اخلاق ہوں۔ سینما دیکھ دیکھ کر اخلاق بنتا نہیں بگڑتا ہے اس لئے میں نے سینما دیکھنا چھوڑ دیا۔ . . . . . میں جاؤں گی تو وہ بھی جائیں گے۔ زبردستی روکا تو اس آرزو کو دل میں پالتے رہیں گے اور جب موقع ملے گا کسر پوری کر لیں گے۔

میں اتنی بڑی ہوں مگر بعض تصویروں پر نظر ڈالنا طبیعت کو گوارا نہیں ہوتا۔ ایسا پن محسوس ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ جیسے کسی کی خلوت میں بغیر اجازت گھسے جا رہے ہیں اور یہ بات آداب شرافت کے خلاف ہی تو ہے۔ آپ کہیں گے ایسے رسالے، اخبار، کتابیں، بچوں کو نہ دکھائی جائیں مگر یہ کتنا مشکل کام ہے کہ پڑھتے پڑھتے اخبار یا رسالہ میز پر ٹکا دینے کی بجائے خاص اہتمام سے تالے میں بند کرنے کی فکر کی جائے۔

ذرا "مرلی کی دھن" دوبارہ پڑھ کر بتائیے کہ یہ کیا چیز ہے؟

کیا کوئی شخص خواہ کتنا بھی نیکی سے دور اور اخلاق باختہ ہو۔ کیا اپنے گھر میں بیوی بچوں کے درمیان بیٹھ کر یہ پُر لطف یا گھناؤنے تجربات دہرانا پسند کرتا ہے . . . . . اس نے چاہے کتنے ہی خم لنڈھائے ہوں۔ شراب کے تالاب میں غوطے لگائے ہوں، پی کر منجمد رہتا ہے یا مغلظات بکتا ہو۔ کتنی ہی عورتوں کو دستر خوان کی چٹنی بناتا ہو۔ جب یاد کیا ہو "سالی عورت" کہا ہو اور نہ پا کر بستر کو آگ لگا دی ہو۔ ان چیزوں کو اخباروں کے ذریعے سے پھیلا کر کون سی اخلاق اور اخلاق کی خدمت ہوتی ہے۔ دوسروں کے بھی گھر ہوتے ہیں۔ ان کے بھی بیوی بچے ہوتے ہیں لڑکے لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کا خیال بھی اپنے گھر اور بچوں کی طرح ہونا چاہیئے۔ کل دنیا مردوں ہی کی تو نہیں کہ خاک پھانکتے پھریں۔ گندگی اچھالیں۔ خود لتھڑیں، معصوموں کو بھی ستائیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں . . . . . کوئی کہاں بھاگے۔ گھروں میں بھی چین نہیں۔ اخبار، رسالے اور ادب جو بیچ بو رہے ہیں ماں باپ کو چاہیئے کہ وہ بھی ان کی پرورش اور آبیاری شروع کر دیں تا کہ بہتر اور مکمل نتیجہ سامنے آئے۔ باپ بیٹے کو سکھائے کہ اس طرح شراب کے تالاب میں غوطہ لگا کر ان صابنوں کو اس طرح گھسیٹ لے جانا چاہئے۔ اور مائیں اپنی بیٹیوں کو نئے نئے دام پھیلانے کے حربے سمجھا دیں . . . . . استغفر اللہ، کیسی انسانیت اور

کیسا معاشرہ ہوگا ..... ذرا تصور تو کیجئے۔ سوچ سوچ کر کتنا جلتی ہوں۔

میں نے جب یہ خط پڑھا تو بخدا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ مجھے نیرّ بانو کی حالت پہ بہت ترس آیا۔ میں نے سوچا اور کچھ نہیں تو اس خاتون پر میں نے واقعی بہت ظلم کیا ہے جس کا کفارہ مجھے ضرور ادا کرنا چاہئے۔ لیکن پھر میں نے سوچا اگر میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق یہ کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی تو وہ عورت جو بعض تصویروں پر نظر ڈال کر ننگا پن محسوس کرتی اور یہ سمجھتی ہے کہ گویا وہ کسی کی خلوت میں بغیر اجازت گھس گئی ہے یقیناً اس کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو جائے گی اور بہت ممکن ہے مر بھی جائے۔

مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ نیرّ بانو ذہنی مریضوں کی جس فہرست میں آتی ہیں۔ اس کے تمام افراد قابلِ رحم ہیں۔ ان کا علاج جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ ان کے سامنے۔ بوتلوں کے کاک اڑا اڑا کر تالاب بھر دئے جائیں۔ گندگی اچھالی جائے۔ اپنے سر میں خاک ڈالی جائے۔ بال نوچے جائیں۔ مغلظات بکی جائیں۔ یہ کام خود سے نہ ہو سکے تو کرائے پر آدمی لائے جائیں جو واہی تباہی بکیں۔ ..... شمع، بیسویں صدی، رومان اور اسی قسم کے دوسرے پرچوں کے تمام مضامین اشتہاروں سمیت پڑھ کر بار بار انہیں سنائے جائیں۔ اگر یہ نسخہ کارگر ثابت نہ ہو تو سعادت حسن منٹو سے کہا جائے کہ نیرّ بانو کا پرانا سینڈل اٹھائے اور اپنے سر پہ مار مار کر اسے گنجا کر دے۔

میراجی والا مضمون "تین گولے" شائع ہوا تو اس سے بھی لوگوں کو تکلیف پہنچی۔ آفاق کے ایڈیٹر صاحب کو ایک صاحب خواجہ فرخندہ بنیادی نے یہ خط لکھا:

آپ نے آفاق کے ادبی ایڈیشن میں سعادت حسن منٹو کا مضمون "تین گولے" شائع کر کے میراجی مرحوم، منٹو صاحب اور خود آفاق کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ مضمون ایک مخصوص ادبی حلقے کے لئے تو شاید موزوں تھا لیکن ایک سنجیدہ اخبار اس کی اشاعت کا قطعاً متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

دنیا کے ہر مہذب ملک اور ہر مہذب سماج میں یہ اصول مروّج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے صرف محاسن بیان کئے جاتے ہیں اور عیوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ میراجی میں اگر کچھ کمزوریاں تھیں تو ان سے صرف ان کا مخصوص حلقۂ احباب ہی واقف تھا۔ دنیا تو انہیں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے جانتی اور عزت کرتی تھی۔ کیا غضب کہ ان کے لنگوٹیے یار ان کے مرنے کے بعد ان برائیوں کو الم نشرح کر رہے ہیں۔

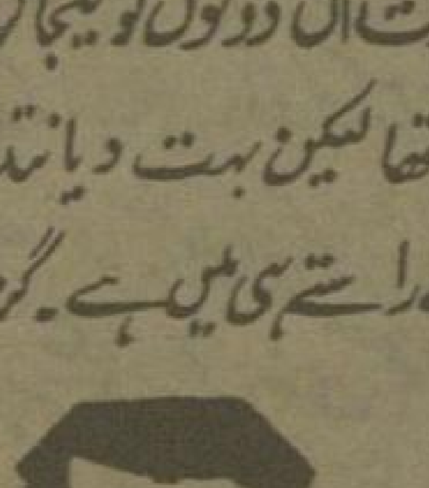
عصمت نے دوزخی لکھ کر اپنے بھائی کو جس طرح خراج ادا کیا ہے غالباً ہمارے ادیب اب اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ ..... اور پھر اس مضمون کے بعض حصوں کی کراہت کی حد تک عریانی۔ پناہ بخدا۔ نہ نفاست پسند طبائع اسے برداشت کر سکتی ہیں نہ یہ مضمون گھر کی خواتین پڑھ سکتی ہیں۔ نہ بچے نہ لڑکیاں۔ اگر منٹو کے بغیر آپ کا ادبی ایڈیشن مکمل نہیں ہو سکتا تھا تو ایڈیٹر کے قلمی احتساب کو کیا ہو گیا تھا۔

میراجی مرحوم، منٹو اور آفاق کے ساتھ جو ظلم ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے جو مزید ظلم ہوگا اس کا میں

گنہ گار ہوں اور یہ گناہ ، بنیادی صاحب کے سر چڑھ کر ، کر رہا ہوں ۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ دنیا کے ہر مہذب ملک اور ہر مہذب سماج میں یہ اصول مروّج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے ۔ اس کے صرف محاسن بیان کیے جاتے ہیں اور عیوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے ۔ ویسے میں ایسی دنیا پر ، ایسے مہذب ملک پر ، ایسے مہذب سماج پر ، ہزار لعنت بھیجتا ہوں ۔ جہاں یہ اصول مروّج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری پر بھیج دیا جائے ۔ جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے ۔

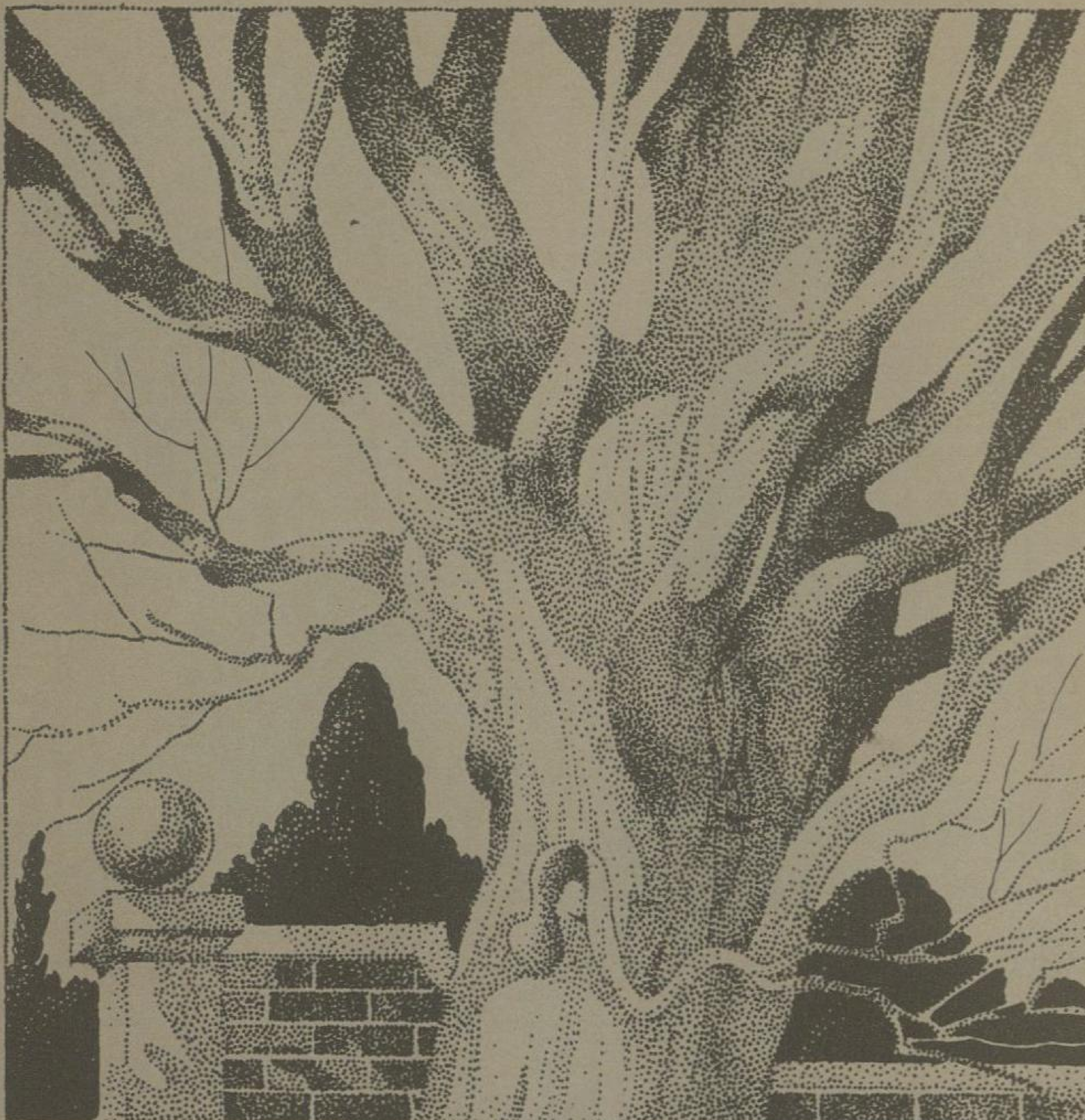
میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں ، کوئی شیمپو نہیں ، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں ...... میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا ..... آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی ۔ اس کے منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا ۔ میرا جی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ بر خود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے ..... اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے !

منٹو کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا ۔ سب کمزوریوں کے باوجود مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے کچھ فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے ۔ اگرچہ یہ شاگردی کچھ برائے نام ہی تھی ۔ اس لئے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آتے ہوں البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی اور چیخوف ، فرائڈ اور موپساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرم مباحثے ہوتے تھے ۔ بیس برس گزر چکے ہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے ۔ ہمارے نقاد جنہیں دورِ حاضر کے فنکار کی شکستِ دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی ۔ غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے ۔ بہت پیتا تھا ۔ بہت بے قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا ۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا ۔ ایسے ہی کیٹس نے بھی اپنے آپ کو مار رکھا تھا ۔ برنز نے بھی ۔ موزارٹ نے بھی ۔ اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے ۔ دوسری صورت سمجھوتہ بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصہ قربان کرنا پڑتا ہے اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جدوجہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فنکاروں کا حصہ ہے ۔ منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانتدار ، بہت ہنرمند اور قطعی راست گو ضرور تھا ۔ میرے خیال میں اس کا گھر تمہارے راستے ہی میں ہے ۔ گزرتے ہوئے وہاں سے ہو آنا اور میری طرف سے بہت پیار اور دلی تعزیت پہنچا آنا ۔



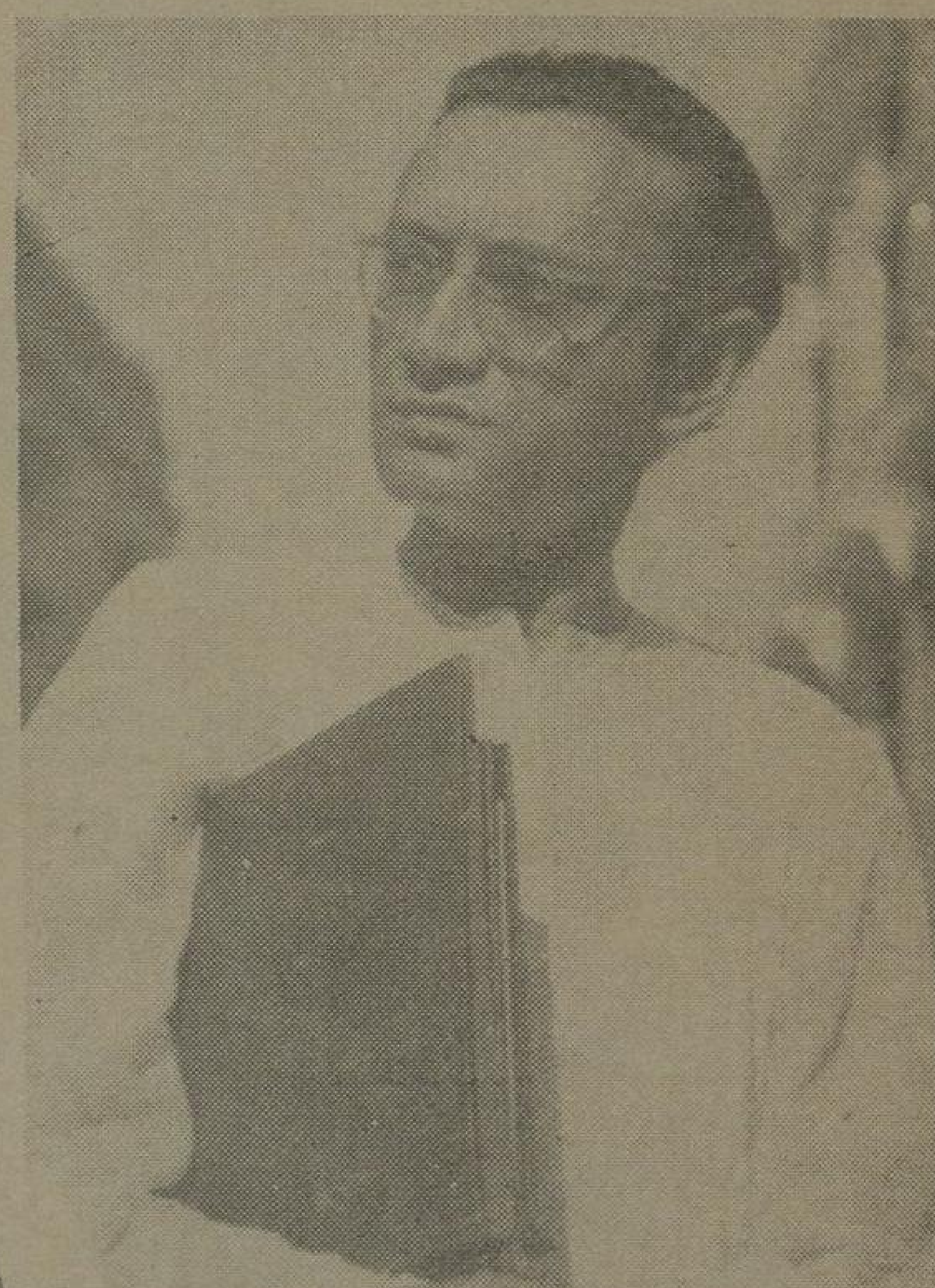
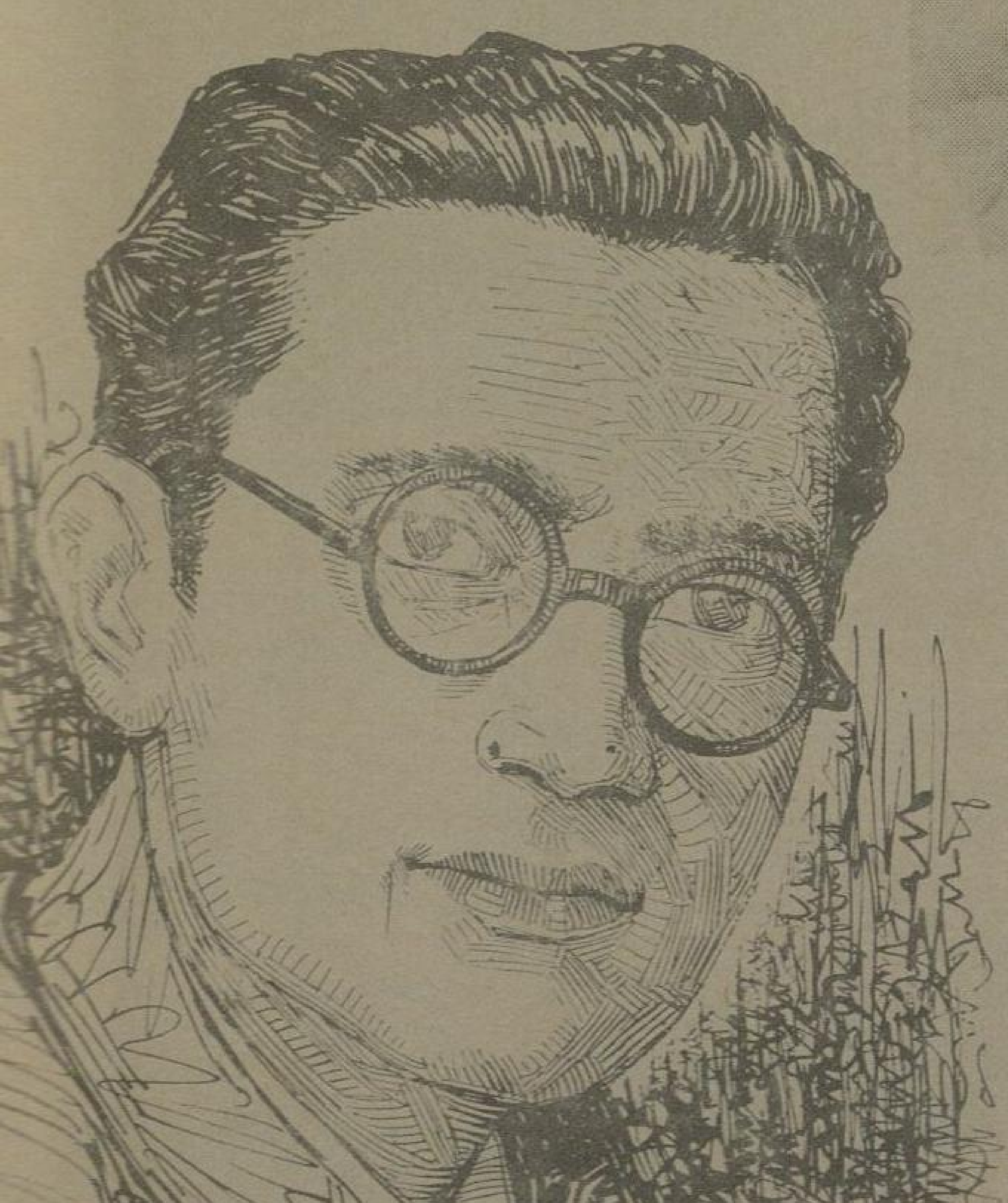
ایلیس فیض کے نام خط

فیض احمد فیض



کالی شلوار






کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی، جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ اِن گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی، اِن کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی، لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دِن اُس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا :" دس لیف ــ ویری بیڈ" یعنی یہ زندگی بہت بُری ہے۔ جب کہ کھانے ہی کو نہیں ملتا"

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا، چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی، یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر اِن کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ کچھ اس سے رعائت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی :" صاحب ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا :" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ اِن کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی ــ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ اِن سے کہتی :" صاحب تم ایک دم اُلّو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ہے۔ سمجھا :" یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ اِن سے باتیں کرتی۔ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اُلّو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی۔ ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے۔ جہاں اس نے سُنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں۔ صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا :" بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے، جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا، چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا :" دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی، اس سے ایک دھیلہ تم کم کہو تو نہ ہوگا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ :" چھٹے آدمی نے یہ بات سُن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے وروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا :" لائیے ایک

روپیہ دودھ کا۔" اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا۔ لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں۔ بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا۔ جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا۔ جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا، شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا، پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لئے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا، فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ زنجیر اسی لئے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے، مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا۔ اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایکدم پانی اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائی ڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا ———— کیا ہوا ———— یہ چیخ تمہاری تھی۔

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ یہ موا پیخانہ ہے یا کیا ہے۔ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھی۔ چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں ا؎ دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لئے اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں آیا۔ جہاں اس کو سلطانہ مل گئی سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لئے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے۔ جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹوگرافر سے دوستی

پیدا کی۔ جو ریلوے سٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لیکر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا۔ دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ سے اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ جہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی۔ مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی۔ جب کہ خدا بخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی۔ جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دوکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں۔ اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی۔ "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔" یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں۔ مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دوکان" لکھا تھا۔ وہ اس کی سہیلی ہیرا بائی کا گھر تھا۔ جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے لئے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی۔ جو اسی کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کیوقت اپنے کارخانہ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔ اس لئے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا "کیا بات ہے خدا بخش، پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آتے ہوئے، کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔" خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا۔ پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا "میں کئی دنوں سے

اس کی بابت سوچ رہا ہوں - ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں - یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " وہ اس کے آگے کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی - خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے - تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی - خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا - ایک آدمی اندر داخل ہوا - یہ پہلا گاہک تھا - جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا - اس کے بعد پانچ اور آئے - یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے -

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا - اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ، کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی - ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے، سلطانہ پریشان ہو گئی - ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں - آہستہ آہستہ بک گئیں - آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا: "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے - یہاں کیا دھرا ہے؟ — بھئی ہو گا پر ہمیں یہ شہر راس نہیں آیا - تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا - چلو وہیں چلتے ہیں - جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو - اس کنگنی کو بیچ کر آؤ — میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں - آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے"

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا: "نہیں جانِ من! انبالے نہیں جائیں گے - یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے - یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی - اللہ پر بھروسہ رکھو، وہ بڑا کارساز ہے یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دیگا"

سلطانہ چپ ہو رہی - چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی - بُچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا - پر کیا کرتی - پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا -

جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی - خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا - سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا - اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں تھیں - جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی - پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا - چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا - سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی - کبھی چھالیہ کاٹتی رہتی - کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آکر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی - اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی -

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا - داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال و اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے - بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا - جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں - دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی

جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں - اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں - کبھی اِدھر کبھی اُدھر - ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی - صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا - دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا - بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے - پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دیکر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا - وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دیکر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے - دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے — نہ جانے کہاں - پھر ایک روز ایسا آئیگا - جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رک جائے گی - کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہی - پھر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے - انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اسکا مکان تھا - مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا - اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے - بہت سی گاڑیاں ہیں - جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں - سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے - جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے - پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گذرتا دیکھتی تو اسے ایسے محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے -

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے - چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا - خدا بخش سے اس نے بارہا کہا " دیکھو میرے حال پر رحم کرو - یہاں گھر میں رہا کرو - میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں " مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اسکی تشفی کر دی " جان من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں - اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائیگا -

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا -

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا - مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا - مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیض بنوائی تھی - جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں - اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی - انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی - اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی - کیونکہ یہ نیا فیشن ہے - اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی - جو بڑا نازک تھا - سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس

احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرّم منانے کے لئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو باہر بالکنی میں چلی گئی۔ تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا۔ کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے کہا۔ "آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے؟" وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا — ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اس پر سلطانہ نے کہا: "یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔" وہ یہ سن کر پھر مسکرایا: "تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا: "آپ جا رہے ہیں؟" اس آدمی نے جواب دیا: "نہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیئے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ تو اس آدمی نے کہا:

"میرا نام شنکر ہے۔"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیض تھی۔ جس کا کالر گردن پر

سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا۔ شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا:

فرمائیے.....:

شنکر بیٹھا تھا یہ سنکر لیٹ گیا: میں کیا فرماؤں کچھ تم ہی فرماؤ — بلایا تمہیں نے ہے مجھے: جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا: میں سمجھا: تو اب مجھ سے سنو جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے:

سلطانہ یہ سنکر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آگئی:

آپ کام کیا کرتے ہیں؟

شنکر نے جواب دیا: یہی جو تم لوگ کرتے ہو:

کیا؟

تم کیا کرتی ہو؟

میں..... میں..... میں کچھ بھی نہیں کرتی:

میں بھی کچھ نہیں کرتا:

سلطانہ نے بھنا کر کہا: یہ تو کوئی بات نہ ہوئی — آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے:

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی:

جھک مارتی ہوں:

میں بھی جھک مارتا ہوں:

تو آؤ دونوں جھک ماریں:

حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا:

ہوش کی دوا کرو — یہ لنگر خانہ نہیں:

اور میں بھی والنٹیر نہیں:

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا: یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں:

شنکر نے جواب دیا: الو کے پٹھے:

میں الو کی پٹھی نہیں:

مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے:

کیوں؟

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا "تم ہندو ہو۔ اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔

شنکر مسکرایا "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں"

"جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو —— بولو رہو گے؟"

"اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں"

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی —— "تو جاؤ رستہ پکڑو"

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا "میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا۔ بہت کام کا آدمی ہوں"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا۔ جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں آدمی کو دیکھا ہوتا اور ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی اس۔ شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا "پرانے قلعے کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہ ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں"

"کچھ انہوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے —— پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے"

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی "سارا سارا دن غائب رہتے ہو —— میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں —— کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں —— گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو ایک ایک بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہوگا؟ —— یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے —— میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا "پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہئیے —— خدا کے لئے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں —— میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی

پر جو کرتا ہے — اللہ ہی کرتا ہے — اور ہماری بہتری ہی کے لئے کرتا ہے — کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم ...."

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "تم خدا کے لئے کچھ کرو — چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو — پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو — میرے پاس سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے — اس کو میں رنگوا لوں گی — سفید نینوں کا ایک نیا ڈوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا — یہ بھی قمیض کے ساتھ رنگوا لیا جائے گا — ایک صرف شلوار کی کسر ہے — سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو — دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو — میری بھتی کھاؤ — اگر تم نہ لاؤ"

خدا بخش اٹھ بیٹھا "اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو — میں کہاں سے لاؤں گا — افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس ایک پیسہ نہیں"

"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو"

"جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی — اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے، ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے —؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا "لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ — میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں"

ہوٹل سے کھانا آیا — دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے، صبح ہوئی خدا بخش پرانے قلعہ والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی — کچھ دیر لیٹی رہی — کچھ دیر سوئی رہی — ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی — دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینوں کا ڈوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیض نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لئے دے آئی — کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا — یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں — جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے — یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی — جب اٹھی تو چار بج چکے تھے — کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی — نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی — قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی — اب شام ہو گئی تھی — بتیاں روشن ہو رہی تھیں — نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے — سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی — مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوتی وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کو ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی — دفعتہً اسے شنکر نظر آیا — مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا — سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا — اور اسے اوپر بلا لیا"

جب شنکر اوپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ویسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا۔ "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی۔ "نہیں بیٹھو۔ تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔"

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ — نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہ میں — یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں — چھوڑو ان فضولیات کو — کوئی کام کی بات کرو۔"

"بولو کیا بات کروں —؟"

"تم عورت ہو — کوئی ایسی بات کرو — جس سے دو گھڑی دل بہل جائے — اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی — کہنے لگی — "صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو —؟"

"جو دوسرے چاہتے ہیں۔" شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں — ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا۔

"میں سمجھ گئی۔"

"تو کہو کیا ارادہ ہے۔"

"تم جیتے میں ہاری — پر میں کہتی ہوں آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔"

"تم غلط کہتی ہو — اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی۔ جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے، جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔ تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

"سلطانہ ہی ہے۔"

"شنکر اٹھ کھڑا ہوا — اور ہنسنے لگا۔ "میرا نام شنکر ہے ———— یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ اندر چلیں۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے۔ تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا۔ تو سلطانہ نے کہا۔ "شنکر میری بات مانو گے ۔"
شنکر نے جواباً کہا۔ "پہلے بات بتاؤ۔"
سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں۔
مگر۔۔۔۔۔"
"کہو کہو۔ رک کیوں گئی ہو۔"
سلطانہ نے جرأت سے کام لیکر کہا۔ "بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے۔ اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا۔ جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے۔"
شنکر نے یہ سن کر کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔"
سلطانہ نے فوراً کہا۔ "نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔"
شنکر مسکرایا۔ "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو جاؤ۔" سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا۔ "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"
سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"
اس پر شنکر نے کہا۔ "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو۔"
"لے لو۔" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے۔ اس کے بعد اسے افسوس ہوا۔ مگر شنکر جا چکا تھا۔
سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی۔ اور کہا۔
"ساٹن کی شلوار ہے۔ دیکھ لینا شاید لمبی ہو۔ اب میں چلتا ہوں۔"
شنکر شلوار دے کر چلا گیا۔ اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔
سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا۔ اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے

دور کر دیا۔"

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیض اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لئے تو دروازے پر دستک ہوئی۔

"سلطانہ نے دروازہ کھولا۔ تو مختار اندر داخل ہوئی ۔۔۔۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔"

"قمیض اور دوپٹہ رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے۔ کب بنوائی؟"

"سلطانہ نے جواب دیا۔" آج ہی درزی لایا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں۔" یہ بندے تم نے کہاں سے لئے۔؟"

مختار نے جواب دیا۔" آج ہی منگوائے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔"

منٹو کی حقیقت نگاری کچھ تو زندگی کے شدید احساس اور صحیح شعور کا نتیجہ ہے اور کچھ فرانس اور روس کے بعض حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے گہرے اثرات بھی اس میں شامل ہیں۔ منٹو زندگی اور اس کے مختلف شعبوں سے قریب رہا ہے۔ اس نے ان میں سے ہر ایک میں گہری دلچسپی لی ہے۔ اس کی ایک ایک بات کو اس نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ ایک ایک پہلو کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح زندگی کی تمام حقیقتیں اس پر بے نقاب ہو گئی ہیں۔ زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے حقائق سے وابستگی نے منٹو کو بعض اہم حقیقت پسند افسانہ نگاروں کا گرویدہ بنایا ہے۔ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں منٹو نے روس اور فرانس کے افسانہ نگاروں سے گہرے اثرات قبول کئے ہیں کیونکہ وہاں کے افسانہ نگاروں کے یہاں اسے زندگی اور اس کی حقیقتیں اپنے اصل روپ میں بے نقاب ملی ہیں۔ چیخوف، ترگنیف، ٹالسٹائی، موپاساں، بالزاک اور فلابیر وغیرہ کے اثرات اس پر بہت گہرے ہیں۔ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کو بہت غور سے پڑھا ہے۔ ایک زمانہ اس پر ایسا گزرا ہے کہ جب اس نے ان افسانہ نگاروں کے بہت اچھے ترجمے کئے ہیں اس لئے ان کی حقیقت نگاری نے منٹو کو براہِ راست متاثر کیا ہے اور پھر آگے چل کر اس نے خود افسانے لکھے ہیں تو ان افسانہ نگاروں کے رنگوں کی جھلک خود اس کے فن میں پیدا ہو گئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کی تقلید کی ہے۔ اس کے یہاں اس سلسلے میں تقلید نہیں بلکہ اجتہاد ہے۔



عبادت بریلوی



جانکی

پونا میں ریسوں کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ کہ پشاور سے عزیز نے لکھا کہ میں اپنی ایک جان پہچان کی عورت جانکی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ اس کو یا تو پونے میں یا بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں ملازم کرادو۔ تمہاری واقفیت کافی ہے۔ اُمید ہے تمہیں زیادہ دقّت نہیں ہوگی۔

دقّت کا آنا نہ آنا زیادہ سوال نہیں تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ فلم کمپنیوں میں اکثر وہی آدمی عورتیں لیکر آتے ہیں جنہیں ان کی کمائی کھانا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں بہت گھبرایا لیکن پھر میں نے سوچا عزیز اتنا پرانا دوست ہے جانے کس یقین کے ساتھ بھیجا ہے اس کو مایوس نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ سوچ کر بھی ایک گونہ تسکین ہوئی کہ عورت کے لیے اگر وہ جوان ہو ہر فلم کمپنی کے دروازے کھلے ہیں۔ اتنی تردّد کی بات ہی کیا ہے۔ میری مدد کیے بغیر ہی اسے کبھی نہ کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے گی۔

خط ملنے کے چوتھے روز وہ پونا پہنچ گئی۔ کتنا لمبا سفر طے کرکے آئی تھی۔ پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پُونا۔ پلیٹ فارم پر چونکہ اس کو مجھے پہچاننا تھا اس لیے گاڑی آنے پر میں نے ایک سرے سے ڈبوں کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ مجھے زیادہ دور نہ چلنا پڑا۔ کیونکہ سیکنڈ کلاس کے ڈبّے سے ایک متوسط قد کی عورت جس کے ہاتھ میں میری تصویر تھی، اتری، میری طرف وہ پیٹھ کرکے کھڑی ہوگئی۔ اور ایڑیاں اونچی کرکے ہجوم میں مجھے تلاش کرنے لگی میں نے قریب جاکر کہا جسے آپ ڈھونڈ رہی ہیں وہ غالباً میں ہوں۔"

وہ پلٹی" اوہو آپ" ایک نظر میری تصویر کی طرف دیکھا اور بڑے بے تکلّف انداز میں کہا۔" سعادت صاحب سفر بہت لمبا تھا بمبئی میں فرنٹیئر میل سے اتر کر اس گاڑی کے انتظار میں جو وقت کاٹنا پڑا۔ اس نے طبیعّت صاف کر دی۔"

میں نے کہا۔" اسباب کہاں ہے آپ کا؟"

" لائی ہوں" یہ کہہ کر وہ ڈبے کے اندر داخل ہوئی دو سوٹ کیس اور ایک بستر نکالا۔ میں نے قلی بلوایا اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھے کہا" میں ہوٹل میں ٹھہروں گی۔"

میں نے اسٹیشن کے سامنے ہی اس کے لیے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا۔ اسے غسل وسل کرکے کپڑے تبدیل کرنے تھے۔ اور آرام کرنا تھا۔ اس لیے میں نے اسے اپنا ایڈریس دیا۔ اور یہ کہہ کر صبح دس بجے مجھ سے ملے، ہوٹل سے چل دیا۔

صبح ساڑھے دس بجے وہ پربھات نگر جہاں میں ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا آئی جگہ تلاش کرتے ہوئے اسے دیر ہو گئی تھی۔ میرا دوست اس چھوٹے سے فلیٹ میں جو نیا نیا بنا تھا موجود نہیں تھا۔ میں رات دیر تک لکھنے کا کام کرنے کے باعث صبح دیر سے جاگا تھا۔ اس لیے ساڑھے دس بجے نہا دھو کر چائے پی رہا تھا کہ وہ اچانک اندر داخل ہوئی۔

پلیٹ فارم پر اور ہوٹل میں تھکاوٹ کے باوجود وہ جاندار عورت تھی، مگر جونہی وہ کمرے میں جہاں میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے چائے پی رہا تھا داخل ہوئی تو اس کی طرف دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے بہت زیادہ پریشان اور خستہ حال عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔ جب میں نے اسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا تو وہ زندگی سے بھرپور تھی۔ لیکن جب پربھات کے نمبر گیارہ فلیٹ میں آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یا تو اس نے خیرات میں اپنا دس پندرہ اونس خون دے دیا ہے یا اس کا اسقاطِ حمل ہو گیا ہے۔

جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں۔ گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔ سوائے ایک بے وقوف نوکر کے میرے دوست کا گھر جس میں ایک فلمی کہانی لکھنے کے لیے ٹھہرا ہوا تھا۔ بالکل سنسان تھا۔ اور مجید ایک ایسا نوکر تھا جس کی موجودگی ویرانی میں اضافہ کرتی تھی۔

میں نے چائے کی ایک پیالی بنا کر جانکی کو دی اور کہا۔ ہوٹل سے تو آپ ناشتہ کر کے آئی ہوں گی۔ پھر بھی شوق فرمائیے۔"

اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی اور پینا شروع کی اس کی داہنی ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن ہچکچاتی ہے میں نے سوچا شاید ہوٹل میں رات کسی مسافر نے اُسے چھیڑا ہے۔ چنانچہ میں نے کہا۔ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہوٹل میں؟"

"جی؟ —— جی نہیں!"

میں یہ مختصر جواب سن کر خاموش رہا چائے ختم ہوئی تو میں نے سوچا اب کوئی بات کرنی چاہیئے چنانچہ میں نے پوچھا "عزیز صاحب کیسے ہیں؟"

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور لفظوں کو جلدی جلدی ادا کر کے کہا "منٹو صاحب آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "پونا میں تو میں کسی کو نہیں جانتا۔"

"اوہ!"

میں نے پوچھا "کیوں بیمار ہیں آپ؟"

"جی ہاں" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے دریافت کیا "تکلیف ہے؟"

اس کے تیکھے ہونٹ جو مسکراتے وقت سکڑ جاتے تھے۔ یا سکڑ لیے جاتے تھے۔ وا ہوئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن کہہ نہ سکی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر کہا "معاف کیجئے گا میں سگریٹ پیا کرتی ہوں۔"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف سگریٹ پیا ہی نہیں کرتی تھی بلکہ پھونکا کرتی تھی۔ بالکل مردوں کی طرح سگریٹ انگلیوں میں دبا کر وہ زور زور سے کش لیتی اور ایک دن میں تقریباً پچیس سگرٹوں کا دھواں کھینچتی تھی۔

میں نے کہا "آپ بتاتی کیوں نہیں کہ آپ کو تکلیف کیا ہے؟"

اس نے کنواری لڑکیوں کی طرح جھنجھلا کر اپنا ایک پاؤں فرش پر مارا۔

"ہائے اللہ میں کیسے بتاؤں آپ کو" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ مسکراتے ہوئے تیکھے ہونٹوں کی محراب میں سے مجھے اس کے دانت نظر

آئے جو غیر معمولی طور پر صاف اور چمکیلے تھے وہ بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں اپنی ڈگمگاتی آنکھوں کو نہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ پندرہ بیس دن اوپر ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ....."

پہلے تو میں مطلب نہ سمجھا لیکن جب وہ بولتے بولتے رک گئی تو میں کسی قدر سمجھ گیا۔

"اکثر ایسا ہوتا ہے۔"

اس نے زور سے کش لیا اور مردوں کی طرح زور سے دھوئیں کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "نہیں یہاں معاملہ کچھ اور ہے مجھے ڈر ہے کہ کہیں ٹھہر نہ گیا ہو۔"

میں نے کہا "اوہ"

اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اس کی گردن جلنے کی طشتری میں دبائی "اگر ایسا ہو گیا ہے تو بڑی مصیبت ہوگی۔ ایک دفعہ پشاور میں ایسی ہی گڑبڑ ہو گئی تھی لیکن عزیز صاحب اپنے ایک حکیم دوست سے ایسی دوا لائے تھے جس سے چند دنوں ہی میں سب صاف ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا "آپ کو بچے پسند نہیں۔"

وہ مسکرائی "پسند ہیں ـــ لیکن کون پالتا پھرے۔"

میں نے کہا "آپ کو معلوم ہے اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی پھر اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا "مجھ سے عزیز صاحب نے بھی یہی کہا تھا لیکن میں پوچھتی ہوں اس میں جرم کی کونسی بات ہے اپنی ہی تو چیز ہے اور ان قانون بنانے والوں کو بھی یہ معلوم ہے کہ بچہ ضائع کراتے ہوئے تکلیف کتنی ہوتی ہے۔

"بڑا جرم ہے۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "عجیب و غریب عورت ہو تم جانکی!"

جانکی نے بھی ہنسنا شروع کیا "عزیز صاحب بھی یہی کہا کرتے ہیں۔"

ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا مشاہدہ ہے۔ جو آدمی پُرخلوص ہوں ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ جاتے ہیں اس نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا اور آنکھیں خشک کر کے بھولے بچوں کے انداز میں پوچھا "سعادت صاحب بتائیے کیا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بہت"

"جھوٹ۔"

"اس کا ثبوت؟"

اس نے سگریٹ سلگانا شروع کر دیا "بھئی شاید ایسا ہو میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کچھ بے وقوف ہوں۔ زیادہ کھاتی ہوں زیادہ بولتی ہوں زیادہ ہنستی ہوں، اب آپ ہی دیکھئے نا زیادہ کھانے سے میرا پیٹ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ عزیز صاحب ہمیشہ کہتے

رہے جانکی کم کھایا کرو۔ پر میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ سعادت صاحب بات یہ ہے کہ میں کم کھاؤں تو ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے کوئی بات کہنا بھول گئی ہوں۔"

اس کی ہنسی بالکل الگ قسم کی تھی بیچ بیچ میں گھونگھرو سے بجتے تھے۔ پھر وہ اسقاطِ حمل کے متعلق باتیں شروع کرنے والی ہی تھی کہ میرا دوست جس کے یہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ آگیا۔ میں نے جانکی سے اس کا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ وہ فلم میں آنے کا شوق رکھتی ہے۔ میرا دوست اسے اسٹوڈیو لے گیا اس کو یقین تھا کہ وہ ڈائریکٹر جس کے ساتھ وہ بحیثیت اسسٹنٹ کے کام کر رہا تھا۔ اپنے نئے فلم میں جانکی کو ایک خاص رول کے لیے ضرور لے لیگا۔

پونا میں جتنے اسٹوڈیو تھے۔ میں نے مختلف ذرائع سے جانکی کے لیے کوشش کی۔ کسی نے اس کا ساؤنڈ ٹسٹ لیا۔ کسی نے کیمرہ ٹسٹ ایک فلم کمپنی میں اس کو مختلف قسم کے لباس پہنا کر دیکھا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا ایک تو جانکی ویسے ہی دن اوپر ہو جانے کے باعث پریشان تھی چار پانچ روز متواتر جب اُسے مختلف کمپنیوں کے اکتا دینے والے ماحول میں بے نتیجہ گزارنے پڑے تو وہ اور زیادہ پریشان ہوگئی۔

بچہ ضائع کرنے کے لیے وہ ہر روز بیس بیس گرین کونین کھاتی تھی۔ اس سے بھی اس کی طبیعت پر گرانی سی رہتی تھی۔ عزیز صاحب کے دن پشاور میں اس کے بغیر کیسے گزرتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی اس کو ہر وقت فکر رہتی تھی پونا پہنچتے ہی اس نے تار بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ بلاناغہ ہر روز ایک خط لکھ رہی تھی۔ ہر خط میں یہ تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتے رہیں۔

عزیز صاحب کو کیا بیماری تھی۔ اس کا مجھے علم نہیں لیکن جانکی سے مجھے اتنا معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کو چونکہ اس سے محبت ہے اس لیے وہ خود اس کا کہنا مان لیتے ہیں، گھر میں کئی بار بیوی سے ان کا جھگڑا ہوا کہ وہ دوا نہیں پیتے لیکن جانکی سے اس معاملے میں انہوں نے کبھی چوں بھی نہ کی۔

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکر مند رہتی ہے محض بکواس ہے، بناوٹ ہے لیکن آہستہ آہستہ میں نے بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے اس کا جب بھی خط آیا جانکی پڑھ کے ضرور روئی۔

فلم پیوں کے طواف کا کوئی نتیجہ نہ نکلا لیکن ایک روز جانکی کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا اندیشہ غلط تھا۔ دن واقعی اوپر ہو گئے تھے۔ لیکن وہ بات جس کا اسے کھٹکا تھا نہیں تھا۔

جانکی کو پونا آئے بیس روز ہو چکے تھے۔ عزیز کو وہ خط پہ خط لکھ رہی تھی اس کی طرف سے بھی لمبے لمبے محبت نامے آتے تھے ایک خط میں عزیز نے مجھ سے کہا کہ پونا میں اگر جانکی کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو میں بمبئی میں کوشش کروں کیوں کہ وہاں بے شمار اسٹوڈیو ہیں بات معقول تھی لیکن میں سینیریو لکھنے میں مصروف تھا اس لیے جانکی کے ساتھ میرا بمبئی جانا بہت مشکل تھا۔ لیکن میں نے پونا سے اپنے دوست سعید کو جو ایک فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا، ٹیلی فون کیا۔ اتفاق سے وہ اس وقت اسٹوڈیو میں موجود نہیں تھے۔ آفس میں نرائن کھڑا تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ میں پونا سے بول رہا ہوں تو ٹیلی فون لے لیا اور زور سے چلّایا "ہلو منٹو ...... نرائن اسپیکنگ فرام دِس اینڈ ..... کہو کیا بات ہے سعید اس وقت اسٹوڈیو میں نہیں ہے گھر میں

بیٹھا رضیہ سے آخری حساب کتاب کر رہا ہے ۔۔۔۔

میں نے پوچھا "کیا مطلب "

نرائن نے ادھر سے جواب دیا "کھٹ پٹ ہو گئی ہے ان میں، رضیہ نے ایک اور آدمی سے ٹانکا ملا لیا ہے "

میں نے کہا "لیکن یہ حساب کتاب کیسا ہو رہا ہے ۔؟

نرائن بولا "بڑا کمینہ ہے یار سعید ——— اس سے کپڑے لے رہا ہے جو اس نے خرید کے دیئے تھے ——— خیر چھوڑو اس بات کو بتاؤ بات کیا ہے ؟ "

میں نے اس سے کہا "بات یہ ہے کہ پشاور سے میرے ایک عزیز نے ایک عورت یہاں بھیجی ہے جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے "

جانکی میرے پاس ہی کھڑی تھی مجھے احساس ہوا کہ میں نے مناسب اور موزوں لفظوں میں مدعا بیان نہیں کیا۔

میں تصحیح کرنے والا ہی تھا کہ نرائن کی بلند آواز کانوں کے اندر گھس گئی "عورت ؟ پشاور کی عورت خوب بھیجو اس کو جلدی ——— خود ہم بھی تصور کا پٹھان ہے ۔ "

میں نے کہا "بکواس نہ کرو نرائن سنو کل دکن کوئن سے میں انہیں بمبئی بھیج رہا ہوں سعید یا تم کوئی بھی اسے اسٹیشن پر لینے کے لیے آ جانا کل دکن کوئن سے یاد رہے ۔ "

نرائن کی آواز آئی "پر ہم پہچانیں گے کیسے ؟ "

میں نے جواب دیا "وہ خود تمہیں پہچان لے گی ——— لیکن دیکھو کوشش کر کے اسے کسی نہ کسی جگہ ضرور رکھوا دینا "

تین منٹ گزر گئے ۔ میں نے ٹیلی فون بند کیا اور جانکی سے کہا کل دکن کوئن سے تم بمبئی چلی جانا۔ سعید اور نرائن دونوں کی تصویریں میں تمہیں دکھاتا ہوں، لمبے تڑنگے خوبصورت جوان ہیں تمہیں پہچاننے میں دقت نہیں ہو گی۔

میں نے البم میں جانکی کو سعید اور نرائن کے مختلف فوٹو دکھائے، دیر تک وہ انہیں دیکھتی رہی میں نے نوٹ کیا کہ سعید کا فوٹو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔

البم ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالنے کی ڈگمگاتی کوشش کرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

" دونوں کیسے آدمی ہیں ؟ "

" کیا مطلب ؟ "

" مطلب یہ کہ دونوں کیسے آدمی ہیں ؟ ——— میں نے سنا ہے کہ فلموں میں اکثر آدمی بُرے ہوتے ہیں "

اس کے لہجے میں ایک ٹوہ لینے والی سنجیدگی تھی۔

میں نے کہا "یہ درست ہے لیکن فلموں میں نیک آدمیوں کی ضرورت ہی کہاں ہوتی ہے ؟ "

" کیوں ۔ "

" دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں ایک قسم ان انسانوں کی ہے جو اپنے زخموں سے درد کا اندازہ کرتے ہیں ۔ دوسری قسم

ان کی ہے جو دوسروں کے زخم دیکھ کر درد کا اندازہ کرتے ہیں — تمہارا کیا خیال ہے کون سی قسم کے انسان زخم کے درد اور اس کی جلن کو صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں؟"

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا "وہ جن کے زخم لگے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "بالکل درست فلموں میں اصل کی اچھی نقل وہی اتار سکتا ہے جسے اصل سے واقفیت ہو، ناکام محبت میں دل کیسے ٹوٹتا ہے یہ ناکام محبت ہی اچھی طرح بتا سکتا ہے وہ عورت جو پانچ وقت جانماز بچھا کر نماز پڑھتی ہے اور عشق و محبت کو سؤر کے برابر سمجھتی ہے۔ کیمرے کے سامنے کسی مرد سے اظہار محبت خاک کرے گی۔"

اس نے پھر سوچا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلم لائن میں داخل ہونے سے پہلے عورت کو سب چیزیں جاننی چاہئیں۔"

میں نے کہا "یہ ضروری نہیں فلم لائن میں آ کر بھی وہ چیزیں جان سکتی ہے۔" اس نے میری بات پر غور نہ کیا اور جو پہلا سوال کیا تھا پھر اسے دہرایا "سعید صاحب اور نرائن کیسے آدمی ہیں۔"

"تم تفصیل سے پوچھنا چاہتی ہو؟"

"تفصیل سے آپ کا کیا مطلب؟"

"یہ کہ دونوں میں سے آپ کے لیے کون بہتر رہے گا۔"

جانکی کو میری یہ بات ناگوار گذری۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ"

"جیسی تم چاہتی ہو"

"ہٹائیے بھی یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ اب آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جب پوچھو گی تو میں نرائن کی سفارش کروں گا۔"

"کیوں؟"

اس لیے کہ وہ سعید کے مقابلے میں بہتر انسان ہے۔"

میرا اب بھی یہی خیال ہے سعید شاعر ہے ایک بہت بے رحم قسم کا شاعر مرغی پکڑے گا تو ذبح کرنے کی بجائے اس کی گردن مروڑ لے گا۔ گردن مروڑ کر اس کے پر نوچے گا۔ پر نوچنے کے بعد اس کی یخنی نکالے گا۔ یخنی پی کر اور ہڈیاں چبا کر وہ بڑے آرام اور سکون سے ایک کونے میں بیٹھ کر اس مرغی کی موت پر ایک نظم لکھے گا جو اس کے آنسوؤں میں بھیگی ہوگی

شراب پئے گا تو کبھی بہکے گا نہیں مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے کیوں کہ شراب کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے صبح بہت آہستہ آہستہ بستر پر سے اٹھے گا۔ نوکر چائے کی پیالی بنا کر لائے گا۔ اگر رات کی بچی ہوئی رم سرہانے پڑی ہے تو اسے چائے میں انڈیل لے گا اور اس مکسچر کو ایک ایک گھونٹ کر کے ایسے پئے گا جیسے اس میں ذائقے کی کوئی حس ہی نہیں۔

بدن پر کوئی پھوڑا نکلا ہے، خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے مگر مجال ہے جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو پیپ بہہ رہی ہے گل سڑ گیا ہے ناسور بن جانے کا خطرہ ہے لیکن سعید کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا۔ آپ اس سے کچھ کہیں گے تو یہ جواب سے

گا۔ اکثر اوقات بیماریاں انسان کی جزو بدن بن جاتی ہیں جب مجھے یہ زخم تکلیف نہیں دیتا تو علاج کی کیا ضرورت ہے" اور یہ کہتے ہوئے وہ زخم کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے کوئی بڑا اچھا شعر نظر آگیا ہے۔

ایکٹنگ وہ ساری عمر نہیں کر سکے گا اس لیے کہ وہ لطیف جذبات سے قریب قریب عاری ہے۔ میں نے اُسے ایک فلم میں دیکھا جو ہیروئن کے گانوں کے باعث بہت مقبول ہوا تھا۔ ایک جگہ اسے اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت کا اظہار کرنا تھا۔ خدا کی قسم اس نے ہیروئن کا ہاتھ کچھ اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا جیسے کتے کا پنجہ پکڑا جاتا ہے میں اس سے کئی بار کہہ چکا ہوں، ایکٹر بننے کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اچھے شاعر ہو گھر بیٹھو اور نظمیں لکھا کرو۔ مگر اس کے دماغ پر ابھی تک ایکٹنگ کی دُھن سوار ہے۔

نرائن مجھے بہت پسند ہے اسٹوڈیو کی زندگی کے جو اصول اس نے اپنے لیے وضع کر رکھے ہیں مجھے اچھے لگتے ہیں۔

(۱) ایکٹر جب تک ایکٹر ہے اُسے شادی نہیں کرنی چاہیئے، شادی کرے تو فوراً فلم کو طلاق دے کر دودھ، دہی کی دکان کھول لے۔ اگر مشہور ایکٹر رہا ہے تو کافی آمدنی ہو جایا کرے گی۔

(۲) کوئی ایکٹریس تمہیں بھیا یا بھائی صاحب کہے تو تم فوراً اس کے کان میں کہو آپ کی انگیا کا کیا سائز ہے؟

(۳) کسی ایکٹریس پر اگر تمہاری طبیعت آگئی ہے تو تمہیدیں باندھنے میں وقت ضائع نہ کرو اس سے تخلیئے میں ملو اور کہو "میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں،" اس کو یقین نہ آئے تو پوری جیب باہر نکال کر دکھا دو۔

(۴) اگر کوئی ایکٹریس تمہارے تصرف میں آجائے تو اس کی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی نہ لو۔ ایکٹرسوں کے شوہر اور بھائیوں کیلیے یہ پیسہ حلال ہے۔

(۵) اس بات کا خیال رکھنا کہ ایکٹریس کے بطن سے تمہاری کوئی اولاد نہ ہو سوراج ملنے کے بعد البتہ تم اس قسم کی اولاد پیدا کر سکتے ہو۔

(۶) یاد رکھو ایکٹر کی بھی عاقبت ہوتی ہے اسے ریز اور کنگھی سے سنوارنے کے بجائے کبھی کبھی غیر مہذب طریقے سے بھی سنوارنے کی کوشش کیا کرو مثال کے طور پر کوئی نیک کام کر کے۔

(۷) اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ احترام پٹھان چوکیدار کا کرو صبح اسٹوڈیو آتے وقت اسے سلام کرنے سے تمہیں فائدہ ہوگا یہاں نہیں تو دوسری دنیا میں جہاں فلم کمپنیاں نہیں ہوں گی۔

(۸) شراب اور ایکٹریس کی عادت ہرگز نہ ڈالو بہت ممکن ہے کسی روز کانگریس گورنمنٹ لہر میں آکر یہ دونوں چیزیں ممنوع قرار دے دے۔

(۹) سوداگر مسلمان سوداگر ہو سکتا ہے لیکن ایکٹر ہندو ایکٹر یا مسلم ایکٹر نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) جھوٹ نہ بولو۔

یہ سب باتیں "نرائن کے دس احکام" کے عنوان تھے اس نے اپنی ایک نوٹ بک میں لکھ رکھی ہیں جن سے اس کے کیریکٹر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ وہ ان سب پر عمل نہیں کرتا مگر یہ حقیقت نہیں۔

سعید اور نرائن کے متعلق جو میرے خیالات تھے وہ میں نے جانکی کے پوچھے بغیر اشارۃً بتا دیئے اور آخر میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ اگر تم اس لائن میں آگئیں تو کسی نہ کسی مرد کا سہارا تمہیں لینا پڑے گا۔ نرائن کے متعلق میرا خیال ہے کہ اچھا دوست ثابت ہو گا۔

میرا مشورہ اس نے سن لیا اور بمبئی چلی گئی دوسرے روز خوش خوش واپس آئی کیوں کہ نرائن نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک سال کے لیے پانچ سو روپے ماہوار پر اسے ملازم کرا دیا تھا۔ یہ ملازمت اُسے کیسے ملی دیر تک اس کے متعلق باتیں ہوئیں جب اور کچھ سننے کو نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا۔ سعید اور نرائن دونوں سے تمہاری ملاقات ہوئی ان میں سے کس کو تم نے زیادہ پسند کیا؟"

جانکی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لغزش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا "سعید صاحب کو" یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی "سعادت صاحب آپ نے کیوں اتنے پل باندھے تھے نرائن کی تعریفوں کے؟"

میں نے پوچھا "کیوں"

"بڑا ہی واہیات آدمی ہے ــــ شام کو باہر کرسیاں بچھا کر سعید صاحب اور وہ شراب پینے کے لیے بیٹھے تو باتوں باتوں میں، میں نے نرائن بھیا کہا تو اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر اس نے مجھ سے پوچھا۔ تمہاری انگیا کا سائز کیا ہے۔ بھگوان جانتا ہے میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی ــــ کیسا لچر آدمی ہے" جانکی کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اس نے تیزی سے کہا "آپ کیوں ہنس رہے ہیں۔"

"اس کی بے وقوفی پر" یہ کہہ کر میں نے ہنسنا بند کر دیا۔

تھوڑی دیر نرائن کو برا بھلا کہنے کے بعد جانکی نے عزیز کے متعلق فکر مند لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔ کئی دنوں سے اس کا خط نہیں آیا تھا۔ اس لیے طرح طرح کے خیال اسے ستا رہے تھے کہیں انہیں پھر زکام نہ ہو گیا ہو۔ اندھا دھند سائیکل چلانے میں کہیں حادثہ ہی نہ ہو گیا ہو۔ پونا ہی نہ آ رہے ہوں کیوں کہ جانکی کو رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا تھا۔ ایک روز میں چپ چاپ تمہارے پاس چلا آؤں گا۔

باتیں کرنے کے بعد جب اس کا تردد کم ہوا تو اس نے عزیز کی تعریفیں شروع کر دیں گھر میں بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں ہر روز صبح ان کو ورزش کراتے ہیں اور نہلا دھلا کر اسکول چھوڑنے جاتے ہیں، بیوی بالکل پھوہڑ ہے اس لیے رشتہ داروں سے سارا رکھ رکھاؤ انہیں خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ جانکی کو ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ تو بیس دن تک متواتر نرسوں کی طرح اس کی تیمارداری کرتے رہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے روز مناسب اور موزوں الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ بمبئی چلی گئی۔ جہاں اس کے لیے ایک نئی اور چمکیلی دنیا کے دروازے کھل گئے تھے۔

پونا میں مجھے تقریباً دو مہینے کہانی کا منظر نامہ تیار کرنے میں لگے۔ حق الخدمت وصول کر کے میں نے بمبئی کا رخ کیا جہاں مجھے ایک نیا کنٹریکٹ مل رہا تھا۔

میں صبح پانچ بجے کے قریب اندھیری پہنچا۔ جہاں ایک معمولی بنگلے میں سعید اور نرائن دونوں اکٹھے رہتے تھے برآمدے میں داخل ہوا تو دروازہ بند پایا۔ میں نے سوچا سو رہے ہوں گے تکلیف نہیں دینا چاہیئے۔ پچھلی طرف ایک دروازہ ہے جو نوکروں کے لیے اکثر کھلا رہتا ہے میں اس میں سے اندر داخل ہوا باورچی خانہ اور ساتھ والا کمرہ جس میں کھانا کھایا جاتا ہے حسب معمول بے حد غلیظ تھا۔ سامنے والا کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا میں نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا کمرے میں دو پلنگ تھے ایک پر سعید اور اس کے ساتھ کوئی لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔

مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ دوسرے پلنگ پر میں کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا۔ پائنتی پر کمبل پڑا تھا۔ یہ میں نے ٹانگوں پر ڈال لیا۔ سونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ سعید کے پیچھے سے ایک چوڑیوں والا بازو نکلا اور پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھنے لگا کرسی پر لٹھے کی سفید شلوار لٹک رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا ـــــ سعید کے ساتھ جانکی لیٹی تھی۔ میں نے کرسی پر سے شلوار اٹھائی اور اس کی طرف پھینک دی۔

نرائن کے کمرے میں جا کر میں نے اُسے جگایا۔ رات کے دو بجے اس کی شوٹنگ ختم ہوئی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ اس غریب کو جگایا لیکن وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی خاص موضوع پر نہیں مجھے اچانک دیکھ کر بقول اس کے وہ کچھ بے ہودہ بکواس کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ صبح نو بجے تک ہم بے ہودہ بکواس میں مشغول رہے جس میں بار بار جانکی کا بھی ذکر آیا۔

جب میں نے انگیا والی بات چھیڑی تو نرائن بہت ہنسا ہنستے ہنستے اس نے کہا "سب سے مزے دار بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا تمہاری انگیا کا کیا سائز ہے تو اس نے بتا دیا۔ کہا چوبیس ـــــ اس کے بعد اچانک اسے میرے سوال کی بے ہودگی کا احساس ہوا اور مجھے کوسنا شروع کر دیا ـــــ بالکل بچی ہے جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو سینے پر دوپٹہ کھسکا لیتی ہے لیکن منٹو بڑی وفادار عورت ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ تم نے کیسے جانا؟"

نرائن مسکرایا "عورت جو ایک بالکل اجنبی آدمی کو اپنی انگیا کا صحیح سائز بتا دے دھوکے باز ہرگز نہیں ہو سکتی۔"

عجیب و غریب منطق تھی لیکن نرائن نے مجھے بڑی سنجیدگی سے یقین دلایا کہ جانکی بڑی پُر خلوص عورت ہے اس نے کہا۔

"منٹو تمہیں معلوم نہیں سعید کی کتنی خدمت کر رہی ہے ایسے انسان کی خبر گیری جو پرلے درجے کا بے پروا انسان ہو۔ آسان کام نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ جانکی اس مشکل کو بڑی آسانی کے ساتھ نبھا رہی ہے ـــــ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پُر خلوص اور ایماندار آیا بھی ہے۔ صبح اٹھ کر اس خرذات کو جگانے میں آدھا گھنٹہ صرف کرتی ہے اس کے دانت صاف کراتی ہے کپڑے پہناتی ہے ناشتہ کراتی ہے اور رات کو جب وہ رم پی کر بستر پر لیٹتا ہے تو سب دروازے بند کر کے اس کے ساتھ لیٹ جاتی ہے ـــــ اور جب اسٹوڈیو میں کسی سے ملتی ہے تو صرف سعید کی باتیں کرتی ہے۔ سعید صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ سعید صاحب بہت اچھے لگتے ہیں۔ سعید صاحب کا وزن بڑھ گیا ہے۔ سعید صاحب کا پل اوور تیار ہو گیا ہے سعید صاحب کے لیے پشاور سے پوٹھوہاری سینڈل منگوائی ہے۔ سعید صاحب کے سر میں آج ہلکا ہلکا درد

ہے۔ اسپرو لینے جارہی ہوں۔ سعید صاحب نے آج مجھ پر ایک شعر کہا —— اور جب مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انگیا والی بات یاد کرکے تیور چڑھالیتی ہے۔"

میں تقریباً دس دن سعید اور نرائن کا مہمان رہا اس دوران میں سعید نے جانکی کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کی شاید اس لیے کہ ان کا معاملہ کافی پرانا ہوچکا تھا۔ جانکی سے البتہ کافی باتیں ہوئیں وہ سعید سے بہت خوش تھی۔ لیکن اسے اس کی بے پروا طبیعت کا بہت گلہ تھا۔ "سعادت صاحب اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ بہت بے پروا ہیں لیکن مجھے ہر روز ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ سنڈاس گئے تھے یا نہیں؟"

نرائن نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا ٹھیک نکلا۔ جانکی ہر وقت سعید کی خبر گیری میں منہمک رہتی تھی دس دن اندھیری کے بنگلے میں رہا۔ ان دس دنوں میں جانکی کی بے لوث خدمت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ عزیز کا کیا ہوا۔ جانکی کو اس کا بھی تو بہت خیال رہتا تھا۔ کیا سعید کو پاکر وہ اس کو بھول چکی تھی۔

میں نے اس کا جواب جانکی ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرتا جس کمپنی سے میرا کنٹریکٹ ہونے والا تھا اس کے مالک سے کسی بات پر چخ چخ ہوگئی اور میں دماغی تکدر دور کرنے کے لیے پونا چلا گیا۔

دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ بمبئی سے عزیز کا تار آیا کہ میں آرہا ہوں —— پانچ چھ گھنٹے کے بعد وہ میرے پاس تھا۔ اور دوسرے روز صبح سویرے جانکی میرے کمرے پہ دستک دے رہی تھی۔

عزیز اور جانکی جب ایک دوسرے سے ملے تو انہوں نے دیر سے بچھڑے ہوئے عاشق و معشوق کی سرگرمی ظاہر نہ کی میرے اور عزیز کے تعلقات شروع سے بہت سنجیدہ اور متین رہے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ دونوں معتدل رہے عزیز کا خیال تھا ہوٹل میں اُٹھ جائے لیکن میرا دوست جس کے یہاں میں ٹھہرا تھا۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے کولہاپور گیا تھا اس لیے میں نے عزیز اور جانکی کو اپنے پاس ہی رکھا تین کمرے تھے ایک میں جانکی سو سکتی تھی۔ دوسرے میں عزیز یوں تو مجھے ان دونوں کو ایک ہی کمرہ دینا چاہیئے تھا لیکن عزیز سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس نے جانکی سے تعلق کو مجھ پر ظاہر بھی نہ کیا تھا۔

رات کو دونوں سینما دیکھنے چلے گئے میں ساتھ نہ گیا اس لیے کہ میں ایک نئی کہانی شروع کرنا چاہتا تھا۔ دو بجے تک میں جاگتا رہا۔ اس کے بعد سو گیا ایک چابی میں نے عزیز کو دے دی تھی۔ اس لیے مجھے ان کی طرف سے اطمینان تھا۔

رات کو میں چاہے بہت دیر تک کام کروں ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان ایک دفعہ ضرور جاگتا ہوں اور اٹھ کر پانی پیتا ہوں۔ حسبِ عادت اس رات کو بھی میں پانی پینے کے لیے اٹھا۔ اتفاق سے جو کمرہ میرا تھا یعنی جس میں میں نے اپنا بستر جمایا ہوا تھا۔ عزیز کے پاس تھا۔ اور اس میں میری صراحی پڑی تھی۔

اگر مجھے شدت کی پیاس نہ لگی ہوتی تو عزیز کو تکلیف نہ دیتا۔ لیکن زیادہ وہسکی پینے کے باعث میرا حلق خشک ہورہا تھا۔ اس لیے مجھے دستک دینی ہی پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ جانکی نے آنکھیں ملتے ملتے دروازہ کھولا اور کہا سعید صاحب"! اور جب مجھے دیکھا تو ایک ہلکی سی۔ اوہ اس کے منہ سے نکل گئی۔

اندر پلنگ پر عزیزہ سو رہا تھا۔ میں نے بے اختیار مسکرا دیا۔ جانکی بھی مسکرائی اور اس کے تیکھے ہونٹ ایک کونے کی طرف سکڑ گئے۔ میں نے پانی کی صراحی لی اور چلا آیا۔

صبح اٹھا تو کمرے میں دھواں جمع تھا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو جانکی کاغذ جلا جلا کر عزیزہ کے غسل کیلئے پانی گرم کر رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور انگیٹھی میں پھونکیں مارتی ہوئی کہنے لگی۔ "عزیزہ صاحب ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو انہیں زکام ہو جاتا ہے میں نہیں تھی پشاور میں تو ایک مہینہ بیمار رہے اور رہتے بھی کیوں نہ جب دوا پینی ہی چھوڑ دی تھی۔ آپ نے دیکھا نہیں کتنے دبلے ہو گئے ہیں۔"

اور عزیزہ نہا دھو کر جب کسی کام کی غرض سے باہر گیا تو جانکی نے مجھے سعید کے نام تار لکھنے کے لیے کہا۔ "مجھے کل یہاں پہنچتے ہی انہیں تار بھیجنا چاہیئے تھا ——— کتنی غلطی ہوئی مجھ سے، انہیں بہت تشویش ہو رہی ہوگی۔"

اس نے مجھ سے تار کا مضمون بنوایا جس میں اپنے بخیریت پہنچنے کی اطلاع تو تھی۔ لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا۔ انجکشن لگوانے کی زیادہ تاکید بھی تھی۔

چار روز گذر گئے سعید کو جانکی نے پانچ تار روانہ کیے۔ پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بمبئی جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک شام عزیزہ کی طبیعت خراب ہو گئی مجھ سے سعید کے نام ایک اور تار لکھوا کر وہ ساری رات عزیزہ کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ معمولی بخار تھا۔ لیکن جانکی کو بے حد تشویش تھی۔ میرا خیال ہے اس تشویش میں سعید کی خاموشی کا پیدا کردہ اضطراب بھی شامل تھا۔ وہ مجھ سے اس دوران میں کئی بار کہہ چکی تھی۔ "سعادت صاحب میرا خیال ہے سعید صاحب ضرور بیمار ہیں ورنہ وہ مجھے میرے تاروں اور خطوں کا جواب ضرور لکھتے۔"

پانچویں روز شام کو عزیزہ کی موجودگی میں سعید کا تار آیا جس میں لکھا تھا۔ "میں بہت بیمار ہوں فوراً چلی آؤ" تار آنے سے پہلے جانکی میری کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ لیکن جب اس نے سعید کی بیماری کی خبر سُنی تو ایک دم خاموش ہو گئی۔ عزیزہ کو یہ خاموشی بہت ناگوار معلوم ہوئی لیکن جب اس نے جانکی کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں تیزی تھی میں اٹھ کر چلا گیا۔

شام کو جب واپس آیا تو جانکی اور عزیزہ کچھ اس طرح علیحدہ علیحدہ بیٹھے تھے جیسے ان میں کافی جھگڑا ہو چکا ہے جانکی کے گالوں پر آنسوؤں کا میل تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جانکی نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عزیزہ سے کہا۔ "میں جاتی ہوں لیکن جلد واپس آ جاؤں گی" پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "سعادت صاحب ان کا خیال رکھیے گا۔ ابھی تک بخار دور نہیں ہوا۔"

میں اسٹیشن تک اس کے ساتھ گیا۔ بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ خرید کر اسے گاڑی میں بٹھایا اور گھر چلا آیا۔ عزیزہ کو ہلکا ہلکا بخار تھا ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن جانکی کا ذکر نہ آیا۔

تیسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد جانکی کی جلدی جلدی لفظوں کو اوپر تلے کرتی ہوئی وہ عزیزہ سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت کیسی ہے اور کیا اس کی غیر موجودگی میں اس نے باقاعدہ دوائی پی تھی یا نہیں۔ عزیزہ کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی۔ لیکن آدھ گھنٹے کے بعد جب کہ نیند سے میری آنکھیں مند رہی تھیں عزیز

کی خفگی آمیز باتوں کا دبا دبا شور سنائی دیا۔ سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔ لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ جانکی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا ہے۔

صبح دس بجے عزیز ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور جانکی کا گرم کیا ہوا پانی ویسے ہی غسل خانے میں پڑا رہا۔ جب میں نے جانکی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

نہا دھو کر عزیز باہر چلا گیا۔ جانکی کمرے میں پلنگ پر لیٹی رہی۔ سہ پہر کو تین بجے کے قریب جب میں اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر بلانے کے لیے باہر نکلا تو عزیز اکّے میں اسباب رکھوا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو" تو اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا "بمبئی — انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی"۔

یہ کہہ کر وہ اکّے میں بیٹھا اور چلا گیا۔ اور مجھے یہ بتانے کا موقعہ ہی نہ ملا کہ جانکی کو بہت تیز بخار ہے۔

ڈاکٹر نے جانکی کو اچھی طرح دیکھا اور مجھے بتایا کہ اسے برونکائٹس ہے۔ اگر احتیاط نہ برتی تو نمونیا ہونے کا خطرہ ہے ڈاکٹر نسخہ دے کر چلا گیا تو جانکی نے عزیز کے بارے میں پوچھا پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے نہ بتاؤں، لیکن چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں تھا اس لیے میں نے کہہ دیا کہ چلا گیا ہے یہ سن کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ دیر تک وہ تکیے میں سر دے کر روتی رہی۔

دوسرے روز گیارہ بجے کے قریب جب جانکی کا بخار ایک ڈگری ہلکا تھا اور طبیعت بھی کسی قدر درست تھی بمبئی سے سعید کا تار آیا جس میں بڑے درشت لفظوں میں یہ لکھا تھا "یاد رہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا" میں بہت منع کرتا رہا لیکن وہ تیز بخار میں ہی پونا ایکسپریس سے بمبئی روانہ ہو گئی۔

پانچ چھ دنوں کے بعد نرائن کا تار آیا "ایک ضروری کام سے فوراً بمبئی چلے آؤ" میرا خیال تھا کہ کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کنٹریکٹ کی بات کی ہوگی لیکن بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جانکی کی حالت نازک ہے۔ برونکائٹس بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو گیا تھا اس کے علاوہ جب وہ پونا سے بمبئی پہنچی تھی تو اندھیری جانے کے لیے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑی تھی جس کے باعث اس کی دونوں رانیں چھل گئی تھیں۔

جانکی نے اس جسمانی تکلیف کو بڑی بہادری سے برداشت کیا۔ لیکن جب وہ اندھیری پہنچی۔ اور سعید نے اس کے بندھے ہوئے اسباب کی طرف اشارہ کر کے کہا "مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ" تو اسے بہت ہی روحانی تکلیف ہوئی۔ نرائن نے مجھے بتایا۔ "سعید کے منہ سے یہ برف جیسے ٹھنڈے لفظ سن کر وہ ایک لحظے کے لیے بالکل پتھر ہو گئی۔ میرا خیال ہے اس نے تھوڑی دیر کے لیے یہ ضرور سوچا ہوگا، میں گاڑی کے نیچے آ کر کیوں نہ مر گئی۔ سعادت تم کچھ بھی کہو مگر سعید جیسا عورتوں سے سلوک کرتا ہے بہت ہی نامردانہ ہے — بے چاری کو بخار تھا۔ چلتی ریل سے گر پڑی تھی اور وہ بھی اس خرذات کے پاس جلدی پہنچنے کے باعث — لیکن اس نے ان باتوں کا خیال ہی نہ کیا اور ایک بار پھر اس سے کہا مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ — اس کے لہجے میں مٹو کسی جذبے کا اظہار نہیں تھا — بس ایسا تھا جیسے لینو ٹائپ مشین سے اخبار کی ایک سطر ڈھل کر باہر نکل آئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا — شام کو جب واپس

آیا تو جانکی موجود نہیں تھی۔ لیکن سعید پلنگ پر بیٹھا رم کا گلاس سامنے رکھے ایک نظم لکھنے میں مصروف تھا ــــ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا ــــ دوسرے روز نرائن سے معلوم ہوا کہ جانکی ایک ایکسٹرا لڑکی کے گھر خطرناک حالت ــــ میں پڑی ہے ــــ میں نے اسٹوڈیو کے مالک سے بات کی اور اسے ہسپتال بھجوا دیا۔ کل سے وہیں ہے بتاؤ اب کیا کیا جائے میں تو اسے دیکھنے نہیں جا سکتا اس لیے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے ــــ تم جاؤ اور دیکھ کے آؤ کس حالت میں ہے۔

میں ہسپتال گیا تو اس نے سب سے پہلے عزیز اور سعید کے متعلق پوچھا۔ جو سلوک ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے باوجود یہ خلوص استفسار نے مجھے متاثر کیا۔

اس کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ دونوں پھیپھڑوں پہ ورم ہے اور جان کا خطرہ ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ جانکی اتنی بڑی تکلیف مردانہ وار برداشت کر رہی تھی۔

ہسپتال سے لوٹا اور اسٹوڈیو میں نرائن کو تلاش کیا۔ تو معلوم ہوا وہ صبح ہی سے کہیں غائب ہے شام کو جب گھر واپس آیا تو اس نے مجھے تین چھوٹی چھوٹی شیشیاں دکھائیں جن کا منہ ربڑ سے بند تھا: جانتے ہو یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا معلوم نہیں ــــ انجکشن سے لگتے ہیں۔"

نرائن مسکرایا، انجکشن ہی ہیں لیکن پنسلین کے۔"

مجھے سخت حیرت ہوئی کیوں کہ پنسلین اس وقت بہت ہی قلیل مقدار میں تیار ہوتی تھی امریکہ انگلستان میں جتنی بنتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی ملٹری ہسپتالوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ میں نے نرائن سے پوچھا یہ تو بالکل نایاب چیز ہے تمہیں کیسے مل گئی؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ بچپن میں گھر کی تجوری کھول کر روپے چرانا میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا ــــ آج دائیں ہاتھ سے ملٹری کا رفریجریٹر کھول کر میں نے تین بلب چرا لیے ہیں ...... چلو جلدی کرو جانکی کو ہسپتال سے ہوٹل لے چلیں۔"

ٹیکسی لے کر میں ہسپتال گیا اور جانکی کو اس ہوٹل میں لے گیا جس میں نرائن دو کمروں کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔

جانکی نے مجھ سے کئی بار نحیف آواز میں پوچھا کہ میں اسے ہوٹل میں کیوں لایا ہوں، ہر بار میں نے یہی جواب دیا" تمہیں معلوم ہو جائے گا اور جب اُسے معلوم ہوا یعنی جب نرائن سرنج ہاتھ میں لیے اُسے ٹیکہ لگانے کے لیے کمرے میں آیا تو اس نے نفرت سے ایک طرف منہ پھیر لیا۔ اور مجھ سے کہا" سعادت صاحب اس سے کہئے چلا جائے یہاں سے۔"

نرائن مسکرایا" جان من غصہ تھوک دو ــــ یہاں تمہاری جان کا سوال ہے۔"

جانکی کو طیش آ گیا۔ نقاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی" سعادت صاحب میں جاتی ہوں یہاں سے یا آپ اس حرامزادے کو نکالیے باہر ــــ"

نرائن نے دھکا دے کر اسے لٹا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ حرم زادہ تمہیں انجکشن لگا کر ہی رہے گا ــــ خبردار جو تم نے مزاحمت کی ــــ"

یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ جانکی کا بازو پکڑا۔ سرنج مجھے دے کر اس نے اسپرٹ میں روئی بھگوئی اور اس کا ڈنڑ صاف کیا اس کے بعد روئی مجھے دے کر اس نے سرنج کی سوئی اس کے بازو کی مچھلی میں داخل کر دی۔ وہ چیخی لیکن پنسلین اس کے

جسم میں جاچکی تھی۔

جب نرائن نے جانکی کا بازو اپنی مضبوط گرفت سے علیحدہ کیا۔ تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ نرائن نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور اسپرٹ لگی روئی سے انجکشن والا حصّہ پونچھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا انجکشن رات کو نو بجے دیا تھا۔ دوسرا تین گھنٹے کے بعد دینا تھا۔ نرائن نے مجھے بتایا اگر تین کے ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے تو پنسلین کا اثر بالکل زائل ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ جاگتا رہا تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس نے اسٹو جلایا سرنج ابالی اور اس میں دوا بھری۔

جانکی خرخراہٹ بھرے سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ نرائن نے دوسرے بازو کو اسپرٹ سے صاف کیا اور سرنج کی سوئی اندر کھبو دی۔ جانکی کے ہونٹوں سے تپلی سی چیخ نکلی۔ نرائن نے دوا جسم کے اندر بھیج کر سوئی باہر نکالی اور اسپرٹ والی جگہ صاف کرتے ہوئے کہا: "اب تیسرا تین بجے۔"

مجھے معلوم نہیں اس نے تیسرا اور چوتھا انجکشن کب دیا۔ لیکن جب بیدار ہوا تو اسٹو و جلنے کی آواز آرہی تھی۔ اور نرائن ہوٹل کے بیرے سے برف کے لیے کہہ رہا تھا کیوں کہ پنسلین کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔ نو بجے انجکشن دینے کے لیے جب ہم دونوں جانکی کے کمرے میں گئے تو وہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے نرائن کی طرف دیکھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہا نرائن مسکرایا "کیوں جانِ من کیا حال ہے؟"

جانکی خاموش رہی۔

نرائن اس کے پاس کھڑا ہو گیا "یہ انجکشن جو میں تمہیں دے رہا ہوں عشق کے انجکشن نہیں، تمہارا نمونیہ دور کرنے کے انجکشن ہیں جو میں نے ملٹری ہسپتال سے بڑی صفائی کے ساتھ چرائے ہیں — لو اب اُلٹی لیٹ جاؤ اور کولھے پر سے شلوار کو نیچے کھسکا دو — کبھی لیا ہے یہاں انجکشن؟"

یہ کہہ کر اس نے جانکی کے کولھے پر ایک جگہ گوشت کے اندر انگلی کھبوئی جانکی کی آنکھوں میں مرعوب سی نفرت پیدا ہوئی۔ جب اس نے کروٹ بدلی تو نرائن نے کہا "شاباش"

بغیر اس کے جانکی کچھ مزاحمت کرے نرائن نے ایک ہاتھ سے اس کی شلوار نیچے کھسکائی اور مجھ سے کہا۔ "اسپرٹ لگاؤ" جانکی نے ٹانگیں چلانا شروع کیں تو نرائن نے کہا "جانکی ٹانگیں وانگیں مت چلاؤ — میں انجکشن لگا کے رہوں گا" غرض کہ پانچواں انجکشن دیدیا گیا پندرہ اور باقی تھے جو نرائن کو ہر تین گھنٹے کے بعد دینے تھے اور یہ پینتالیس گھنٹے کا کام تھا۔ پانچیں انجکشن سے بظاہر جانکی کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ لیکن نرائن کو پنسلین کے اعجاز کا یقین تھا۔ اور اسے پوری پوری امید تھی کہ وہ بچ جائیگی ہم دونوں بہت دیر تک اس نئی دوا کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب نرائن کا نوکر میرے نام ایک تار لیکر آیا پونا سے تھا۔ ایک فلم کمپنی نے مجھے فوراً بلایا تھا۔ اسلیے مجھے جانا پڑا۔

دس پندرہ دنوں کے بعد کمپنی ہی کے کام سے میں بمبئی آیا۔ کام ختم کر کے جب میں اندھیری پہنچا تو سعید سے معلوم ہوا کہ نرائن ابھی تک ہوٹل میں ہے۔ ہوٹل بہت دور شہر میں تھا۔ اسلیے رات میں وہیں اندھیری میں رہا۔ صبح آٹھ بجے وہاں پہنچا۔ تو نرائن کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرہ خالی پایا۔ دوسرے دروازے کو کھولا تو ایک دم آنکھوں کے سامنے کچھ ہوا۔ جانکی مجھے دیکھتے ہی لحاف کے اندر گھس گئی اور نرائن نے جو اس کے ساتھ لیٹا تھا۔ مجھے واپس جاتے دیکھ کر کہا "آؤ منٹو آؤ... میں ہمیشہ دروازہ بند کرنا بھول جاتا ہوں — آؤ یار آؤ —



بابو گوپی ناتھ









گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈر لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔ "منٹو صاحب۔ بابو گوپی ناتھ سے ملیے"۔

میں نے اُٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ "بابو گوپی ناتھ۔ تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے، لوگوں کا ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلا لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب۔ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ۔ ہے نا اینٹی کی پینٹی پو؟"

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی۔ دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اُس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا۔ جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ "آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے"۔

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا۔ "نمبر ون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں بس منٹو صاحب۔ یہ سمجھ لیجیے کہ بڑے انٹی فلو جسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے"۔

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا۔ "ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب"۔ پھر سینڈو سے پوچھا۔ "کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اُس کا شغل کرتے ہیں"۔

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آیئے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے اس لیے کہ مفت ملتی ہے"۔

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ لکھا دیا۔ جہاں میں حسب وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں - تہمد پوش - پنجاب کا ٹھیٹ سائیں - گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا - سینڈو نے اس کے بارے میں کہا: "آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں - میرا مطلب سمجھ جائیے آپ - ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو یا جس کے مُنہ میں سے لعاب نکلتا ہو، پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے - یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں - لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں - کیونکہ انہیں وہاں کوئی اور بیوقوف ملنے کی اُمید نہیں تھی - یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ وسکی کے پگ پی کر دُعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو-"

غفار سائیں یہ سُن کر مُسکراتا رہا -

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی - لمبا تڑنگا جوان - کسرتی بدن - مُنہ پر چیچک کے داغ - اس کے متعلق سینڈو نے کہا: "یہ میرا شاگرد ہے - اپنے اُستاد کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے - لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی - بڑی بڑی کنٹی نیوٹیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لیے مگر اس نے کہا ڈُو اور ڈائی - میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا - ایک تکیے میں بات چیت پیتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہو گئی - بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے - ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے-"

یہ سُن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا -

گول چہرے والی ایک سُرخ و سفید عورت تھی - کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کشمیر کی کبوتری ہے - جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا - بہت صاف ستھری عورت تھی - بال چھوٹے تھے - ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں - مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا - آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں - چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الھڑ اور ناتجربہ کار ہے - سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا: "زینت بیگم - بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں - ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی - بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اُڑے مقدمے بازی ہوئی تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے ——— دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگرٹ پی رہی تھی - آنکھیں سُرخ تھی جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی - بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور سینڈو سے کہا: "اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے"-

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا: "جناب یہ ہے، ٹین ٹوٹی - فل خل فوٹی - مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم ——— آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں - سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا - دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا - میں لاہور چھوڑ کر بھاگا - بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے - اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے - ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے - رنگ کالا ہے - مگر ویسے بڑی ٹٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے"-

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا: "بکواس نہ کر" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی -

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسبِ عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے - میں نے کہا: "چھوڑو یار - آؤ کچھ باتیں کریں"-

سینڈو چلایا: "بوائے - وسکی اینڈ سوڈا ——— بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سبزے کو"-

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندا نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف ——— غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا۔ "او گوڈ ——— او میرے رب العالمین ——— وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا ———، جاؤ بھئی غلام علی۔ دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔"

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا۔ "دھڑن تختہ منٹو صاحب وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے ——— جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔"

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا۔ "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ۔"

وہ چونک پڑا۔ "جی میں ——— میں ——— کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔ "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں ——— اور ہمیں کیا سوچ ہو گی۔"

سینڈو نے کہا۔ "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں ——— لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نینٹل نہ رہ چکی ہو۔"

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا۔ "اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب۔"

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی؟ کون نٹنی تھی؟ کون کس کی نوچی تھی؟ نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار۔ سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا۔ مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی پیا بغیر کسی دلچسپی کے۔ سگرٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا۔ اسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگرٹ اسی نے پیئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اسے محبت تھی؟ اس کا پتہ مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لیے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار۔ ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لیے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لیے بند کی تو بابو گوپی

ناتھ نے جواب نشے میں تھا۔ زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا۔ "منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہدیا۔ "بڑا نیک خیال ہے"۔

بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا۔ "منٹو صاحب ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا۔ جانِ من مکان بنوا دوں۔ جواب کیا دیا۔ معلوم ہے آپ کو؟ —— کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے —— منٹو صاحب موٹر کتنے میں آجائے گی؟

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں"۔

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا۔ "کیا بات کرتے ہیں منٹو صاحب —— آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ۔ زینو کے لیے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئے میں موٹر ہونی ہی چاہیئے"۔

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اُس نے مجھ سے کہا۔ "منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں —— لیکن آپ مجھے بتایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا۔ مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا بہت گنہ گار آدمی ہوں —— وسکی منگاؤں آپ کے لیے اور"۔

میں نے کہا۔ "نہیں —— بہت پی چکے ہیں"۔

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا۔ "اور پیجئے منٹو صاحب" یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندا نکالا اور ایک نوٹ جُدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اُس کے ہاتھ سے لیے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ "سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہُوا؟"

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اُس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوتے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مُسکرا کر کہنے لگا۔ "منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑے گا یا"۔

بابو گوپی ناتھ نے پُورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دُکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرامزادے نے اسکی جیب میں سے سارے روپے نکال لیے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مُسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دیکر کہا "جلدی کھانا لے آؤ"۔

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہُوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چُغد ہے غلط ثابت ہُوا۔ اُس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اُس کے مصاحب بنے ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصّے کا اظہار نہیں کرتا

تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انھیں عقلمند سمجھتا ہوں اس لیے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جن سے ان کا الو سیدھا ہو سکتا ہے، بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ بس یہ دو جگہیں ہیں۔ جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لیے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا"۔

میں نے اس سے پوچھا "رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں"۔

کچھ دیر سوچ کر اُس نے جواب دیا "اس لیے کہ ان دونوں جگہوں پہ فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اُس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے"۔

میں نے ایک اور سوال کیا "آپ کو طوائفوں کا گانا سُننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں"۔

اس نے جواب دیا "بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سُری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں ـــــــ منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اُسے لینے کے لیے ایک ادا سے اُٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اُڑس لیا۔ اس نے جھک کر اُسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے"۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے"۔

بابو گوپی ناتھ کا شجرۂ نسب تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہُوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اُسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اُڑانا شروع کر دی بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا اُس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لیے اس نے فلیٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا۔ لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی۔ لیکن اُسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گائیکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اُس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی

سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لیے۔ خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں۔ اس کی بذلہ سنج طبیعت میں جس میں میراثیوں کے مزاج کی جھلک تھی، بہت ہی جاذب نظر تھی۔ وہ کوشش کئے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا۔ مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اُسے لایا تھا۔ اُن دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا۔ وہ سگرٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا۔ جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا: "او بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گذر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟"

سینڈو نے کہا: "تشریف لے آئیے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سادہ لوح۔ صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا۔ اس کے علاوہ ——— کچھ یوں کہیئے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا۔ لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "آئیے منٹو صاحب" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا: "منٹو صاحب مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں۔ میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لُوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گرو رکھ کر گزارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایک

دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اُس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو، جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں کل مجھے بھکاری ہونا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسوگی۔ تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سُنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا اُس نے کہا بمبئی لے جاؤ۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جانے والی طوائفیں ایکٹرسیں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گُر سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہوگی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو ——— منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بنک میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی ——— آپ بھی اسے سمجھایئے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے۔ سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، اُس کے متعلق؟"

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا: "اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے ——— کیوں زینو جانی ——— پسند ہے تمہیں"؟

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دُور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے۔ جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لیے اُس نے زینت کے مستقبل کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اُس کو ایکٹرس بنانے کے لیے۔ اُس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا۔ لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا: "شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھئے۔ لیکن بے چاری زینت سے چار چادریں۔ چھ تکیئے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سُنا ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔"

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ

چلی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لیے تھے۔ مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوتے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑجھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا اُسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اُسے تلاش کیا۔ لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا۔ "مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے ——— ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات اُمید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑے کی مل کا مالک تھا زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہار نبی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یٰسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یٰسین مسکرایا۔ "تم جانتے ہو موٹر والی کو۔"

میں نے کہا "جانتا ہوں۔"

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ——— اچھی لڑکی ہے یار۔" یٰسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرایا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یٰسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑا کر چلا گیا۔ لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یٰسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گذر جائیں زینت اور یٰسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے ——— مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میوریل سے یٰسین کی آنکھ لڑ گئی چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور یٰسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی۔ میاں اگر تم نے اس کرسٹان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو ——— میں کیا کروں منٹو صاحب بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا ———

تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیئے"۔
لیئیں سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔
بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ۔ غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے روپے کا بندوبست کرنے۔ کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اُسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔
سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پالسن مکھن کی، چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا اس لیے اسے اپنی فکر کرنی چاہیے سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔
میں نے ایک دن زینت سے کہا "یہ تم کیا کر رہی ہو"۔
اُس نے بڑے الھڑپن سے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں"۔
جی چاہا تھا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں سینڈو اور سردار اپنا الّو سیدھا کرنے کے لیے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اُکتا دینے والی حد تک بے سمجھ بے اُمنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگرٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلیفون سے حتیٰ کہ اُس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ تاہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصّہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں
بابو گوپی ناتھ اب کی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔
قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا۔ "سینڈو"۔
سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اس قدر نکلا "دھڑن تختہ!"
بابو گوپی ناتھ نے اُس سے کہا "آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو" لیکن سینڈو نے کہا "ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیے۔ مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں"۔
ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دور لے گیا۔ دیر تک اُن میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہو گئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا "واپس لے چلو"۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا "منٹو صاحب زینو کی شادی ہونے والی ہے"۔

میں نے حیرت سے پوچھا "کس سے؟"

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا "حیدر آباد سندھ کا ایک دولتمند زمیندار ہے۔ خدا کرے دونوں خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں عین وقت پر آپہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائے گا ——— کیوں کیا خیال ہے آپ کا"۔

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدر آباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے؟ سینڈو اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی، کہ وہ حقیقۃً حیدر آباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدر آباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پُرزور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے

گا کر سُنائی۔ غلام حسین سو جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دونی ہو گئی۔ مجھ سے اُس نے کہا "منٹو صاحب خوبصورت۔ جوان اور بڑا لائق آدمی ہے ——— میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی ——— بھگوان کرے دونوں خوش رہیں"۔

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے اور پانچ ہزار نقد دیئے۔

محمد شفیق طوسی۔ محمد یٰسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل۔ سینڈو، میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دولہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا "دھڑن تختہ!"

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارک باد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لیے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں کہا "منٹو صاحب ذرا اندر جایئے اور دیکھئے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے"۔

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سُرخ زربفت کا شلوار کُرتہ پہنے تھی ——— دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سُرخی بہت بُری معلوم ہوتی ہے۔ مگر زینت کے

ہونٹ بجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا: "یہ کیا مسخرہ پن ہے۔"

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا: "آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان" اُس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اُس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا: "منٹو صاحب میں سمجھتا تھا آپ بڑے سمجھ دار اور لائق آدمی ہیں ——— زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔"

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اُسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا: "خدا تمہیں خوش رکھے۔"

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی ——— بہت ہی دکھ بھری ملامت ——— اور چلا گیا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہو۔ جالا صاف ہو رہا ہے۔ دماغ میں جھاڑ و سی دی جا رہی ہے۔ اور بعض وقت بحثیں اتنی طویل اور گھمن دار ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سوت کی پونیاں الجھ گئی ہیں اور واقعی سوچنے سمجھنے کی قوت پر جھاڑ دپھر گئی ہے مگر دونوں بکتے جاتے الجھے جاتے بدمزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا مگر منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا۔ آنکھیں مور پنکھوں کی طرح تن کر پھیل جاتیں۔ نتھنے پھڑکنے لگتے۔ منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حمایت میں شاہد لطیف کو پکارتا اور جنگ، ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو بھنا کر چلا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑتے کہ تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے۔ اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں۔ وہ بدتمیز آدمی ہے۔ کچھ کہہ بیٹھے گا تو میری اس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی ——— لیکن صبح لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ویسے ہی گھل مل کر باتیں ہوتیں۔



عصمت چغتائی



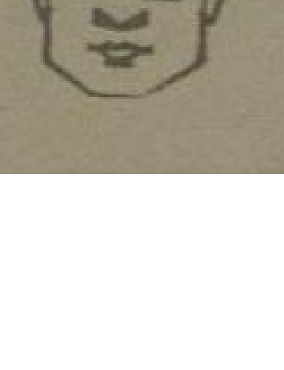
میں کیوں لکھتا ہوں

میں کیوں لکھتا ہوں — یہ ایک ایسا سوال ہے کہ میں کیوں کھاتا ہوں، میں کیوں پیتا ہوں۔ لیکن اس لحاظ سے مختلف ہے کہ کھانے اور پینے پر مجھے روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں — اور جب لکھتا ہوں تو مجھے نقدی کی صورت میں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ پر جب گہرائی میں جاتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ اس لیے کہ میں روپے کے بل بوتے پر ہی لکھتا ہوں۔ اگر مجھے کھانا پینا نہ ملے تو ظاہر ہے کہ میرے قویٰ اس حالت میں نہیں ہوں گے کہ میں قلم ہاتھ میں پکڑ سکوں۔ ہو سکتا ہے فاقہ کشی کی حالت میں دماغ چلتا رہے مگر ہاتھ کا چلنا تو ضروری ہے۔ ہاتھ نہ چلے تو زبان ہی چلنی چاہیئے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ انسان کھائے پیئے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

لوگ فن کو اتنا اونچا رتبہ دیتے ہیں۔ اس کے ڈانڈے ساتویں آسمان سے ملا دیتے ہیں۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ یہ ارفع و اعلیٰ شے ایک سوکھی روٹی کی محتاج ہے۔ میں لکھتا ہوں اس لیے کہ مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں لکھتا ہوں اس لیے کہ میں کچھ کما سکوں تاکہ میں کچھ کہنے کے قابل ہو سکوں۔ روٹی اور فن کا رشتہ بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ خداوند تعالےٰ کو یہی منظور ہے۔ وہ خود کو ہر چیز سے بے نیاز کہتا ہے۔ یہ غلط ہے وہ بے نیاز اور بے احتیاج ہرگز نہیں۔ اس کو عبادت چاہیئے اور عبادت بڑی نرم و نازک روٹی ہے بلکہ یوں کہیے کہ چپڑی ہوئی روٹی ہے۔ جس سے وہ اپنا پیٹ بھرتا ہے سعادت حسن منٹو لکھتا ہے اس لیے وہ خدا جتنا بڑا افسانہ ساز اور شاعر نہیں۔ یہ اس کا عجز ہے جو اس سے لکھواتا ہے۔

سعادت حسن منٹو اردو افسانے کا ایک اہم نام تو یقیناً ہے لیکن اردو افسانے کی تاریخ میں اس جیسی انفرادیت کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتی۔ وہ حقیقت پسند کہلاتا ہے اور یہ درست ہے مگر اس کی حقیقت نگاری بھی دوسروں سے الگ تھلگ ہے۔ وہ معاشرے کے ابنارمل کرداروں کو خصوصی طور پر قابلِ توجہ سمجھتا ہے۔ ان کی ذہنی اور نفسی کجرویوں کو ہمدردانہ انداز سے دیکھتا ہے اور انہیں مجرم سمجھنے کے بجائے ان کی انسانیت کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کرداروں میں بابو گوپی ناتھ، پھوجا حرامدا' اور ممی جیسے روشِ عام سے ہٹے ہوئے کردار زیادہ دلکش، زیادہ منفرد اور زندہ جاوید معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا





"منٹو"

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیشِ نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحبِ عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے۔ اس لیے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے۔ حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض لوگ اسے شیطان کہتے ہیں، بعض گنجا فرشتہ —— ذرا ٹھہرئیے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت سُن تو نہیں رہا —— نہیں نہیں، ٹھیک ہے، مجھے یاد آگیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیا کرتا ہے۔ اس کو شام کے چھ بجے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے، اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نبھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی ہے۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا وَن ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے۔ مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہیں جو صرف بافہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت گیارہ مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے۔ جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپا لے تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں، اس کا سراغ نہ ملے۔ لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد ہوں میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجئے۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خرذات افسانہ نگار کیسے بنا۔ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں شوپن ہار، فرائڈ، ہیگل، نٹ شے، مارکس کے حوالے دیتے ہیں مگر حقیقت سے کوسوں دور

رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ اس کے والد خدا انہیں بخشے، بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی اسکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ بہت ذہین لڑکا تھا اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ ۳½ فٹ ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں، باپ کی محبت تو میسر تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے ان سے اس کو کبھی ملاقات کا موقعہ ہی نہیں ملا تھا اس لیے کہ وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں۔ اس سے بڑے بھائیوں ایسا سلوک کریں یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنئے۔ وہ اوّل درجے کا فراڈ ہے پہلا افسانہ اس نے بعنوان "تماشہ" لکھا جو جلیانوالہ باغ کے خونین حادثہ سے متعلق تھا۔ یہ اس نے اپنے نام سے نہ چھپوایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی دست برد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اس کے متلون مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے، یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا تھا وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔ اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے اور میں یہ سن کر ہنستا ہوں، اس لیے کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں کے پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جالی والا شکاری تتلیوں کے پیچھے۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آتیں یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں خوبصورت الفاظ کی کمی ہے وہ لٹھ مار ہے۔ لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پر پڑے ہیں۔ اس نے بڑی خوشی سے برداشت کیے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے وہ بنوٹ اور پھکیت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا۔ بلکہ تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا، اب گرا — لیکن وہ کم بخت آج تک کبھی نہیں گرا — شاید گر جائے اوندھے منہ ...... کہ پھر نہ اٹھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسی لیے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے۔

میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اوّل درجے کا فراڈ ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا، خود افسانہ اسے سوچتا ہے۔ یہ بھی ایک فراڈ ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جب کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ انڈا کہیں چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے اس کے دوست یار بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیئے جاتا ہے جو بعد میں چوں چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں۔ اس کی بیوی اس سے بہت

نالاں ہے وہ اس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو ـــ کوئی دکان کھول لو لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے اس میں منیاری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے اس لیے وہ اکثر سوچا کرتا ہے اگر میں نے کبھی کوئی اسٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ اسٹوریج یعنی سرد خانہ بن جائے، جہاں اس کے تمام خیالات اور افکار منجمد ہو جائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اس کی ہر چیز برداشت کی جا سکتی ہے لیکن خفگی نہیں کی جا سکتی۔ خفگی کے عالم میں وہ بالکل شیطان بن جاتا ہے لیکن صرف چند منٹوں کے لیے۔ اور وہ چند منٹ اللہ کی پناہ......

افسانہ لکھنے کے معاملہ میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں اس لیے...... کہ اس کا ہمزاد ہوں۔ کہ وہ فراڈ کر رہا ہے ـــ اس نے ایک دفعہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب میں بے شمار افسانے پڑے ہوتے ہیں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب اسے افسانہ لکھنا ہوگا تو وہ رات کو سوچے گا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ صبح پانچ بجے اٹھے گا اور اخباروں سے کسی افسانے کا رس چوسنے کا خیال کرے گا۔ لیکن اسے ناکامی ہوگی پھر وہ غسل خانے میں جائے گا۔ وہاں وہ اپنے شوریدہ سر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سوچنے کے قابل ہو سکے۔ لیکن ناکام رہے گا۔ پھر جھنجھلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کر دے گا۔ یہاں سے بھی ناکامی ہوگی تو پان لینے کے لیے چلا جائے گا۔ پان اس کی ٹیبل پر پڑا رہے گا۔ لیکن افسانے کا موضوع اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آئے گا۔ آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے گا اور ۷۸۶ لکھ کر جو پہلا فقرہ اس کے ذہن میں آئے گا اس سے افسانے کا آغاز کر دے گا۔

بابو گوپی ناتھ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہتک۔ ممی۔ موذیل۔ یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقہ سے لکھے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجہ میں آتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گندے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا جس کا مطلب ہے بسم اللہ......

اور یہ شخص جو اکثر خدا سے منکر نظر آتا ہے کاغذ پر مومن بن جاتا ہے، یہ وہ کاغذی منٹو ہے جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی میں توڑ سکتے ہیں۔ ورنہ وہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں جو چند الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ وہ چور ہے ـــ جھوٹا ہے ـــ دغاباز ہے اور مجمع گیر ہے۔

اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اڑائے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لا کے دیئے اور چور آنکھ دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں، اور دوسرے دن ان میں سے ایک سبزہ غائب کر دیا۔ اور اس بیچاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا۔

یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے۔ لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اوّل درجے کا جھوٹا ہے۔ شروع شروع میں اس کا جھوٹ اس کے گھر چل جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہو گیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملہ کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا — جھوٹ تھا۔ منٹو جھوٹ بقدرِ کفایت بولتا ہے لیکن اس کے گھر والے، مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے — اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سُرمے سے بنا رکھا ہو۔

وہ اَن پڑھ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گذری۔ ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے۔ ہیولک ایلیس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ۔ میرا مطلب ہے تنقید نگار، یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے جہاں تک میں جانتا ہوں منٹو کسی دوسرے شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہیئے۔ اس کو خود سمجھنا چاہیئے۔

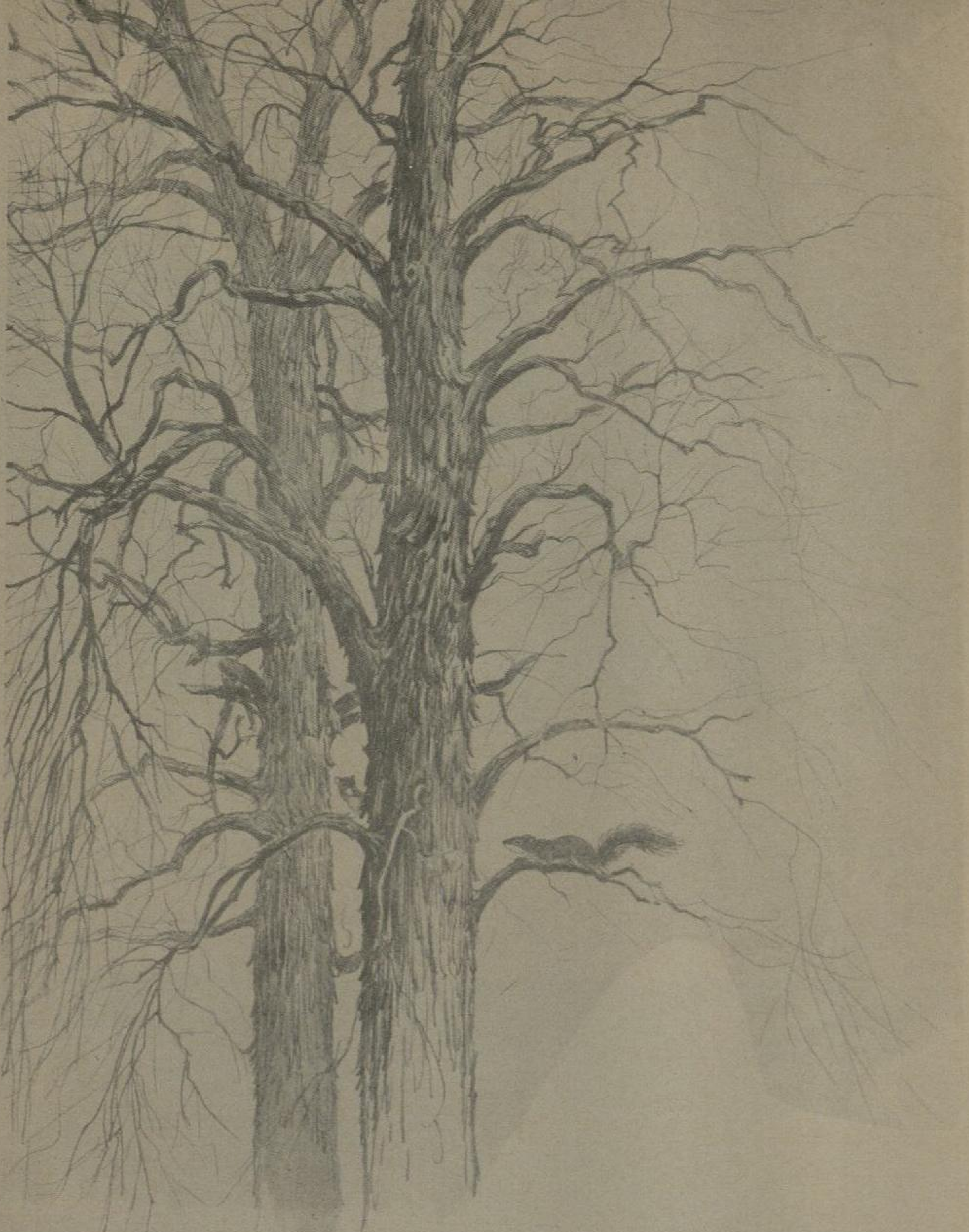
خود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔

میں آپ کو پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ منٹو، جس پر فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں، بہت طہارت پسند ہے لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پاانداز ہے جو خود کو جھاڑتا جھٹکتا رہتا ہے۔

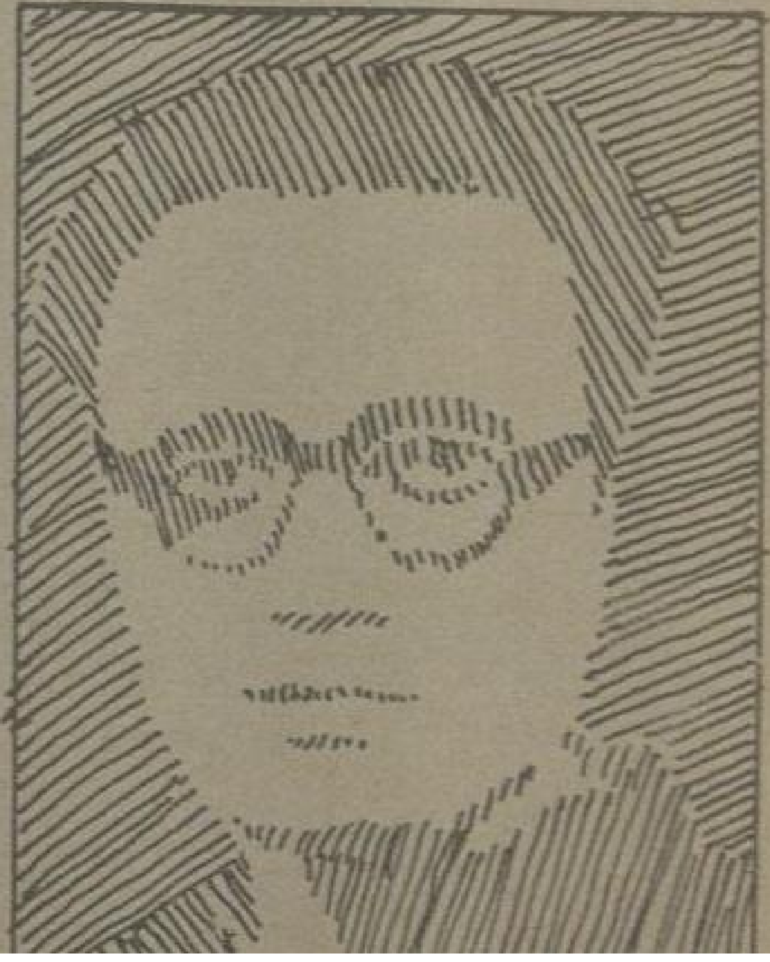
بسترِ مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انہیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا ہم معنی سمجھنے لگے تھے جس پر جسمانی فتح کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ جس طرح موت کے آگے کوئی انسان پیش نہیں پا سکتا اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہوتے تھے لیکن ان کی فطرت چونکہ ہمیشہ سے باغیانہ تھی اس لئے انہوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی — انہیں شکست سے بھی نفرت تھی خواہ وہ موت کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو اور یہی وجہ تھی کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے جہاں کوئی انہیں مرتا نہ دیکھ سکے جہاں کوئی ان کی شکست کا نظارہ نہ کر سکے۔



حامد جلال



نیا قانون





منٹو، شہزاد احمد، حسن طارق،
ہوش ترمذی، احمد مشتاق



منٹو اپنے والد کے ساتھ







منٹو کے بے تکلف دوست

کرشن چندر، باری علیگ، ندیم



نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈّے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اُس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبّرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی"۔

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈّے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقّہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اور اُستاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈّے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقّے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا ــــ

"یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی، جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ــــــ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں"۔ یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقّے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی "یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے"۔

اُستاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکّہ چلاتے

اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتے یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اُس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

'.............' یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔"

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔

شکل دیکھتے ہو نا تم اُس کی ...... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے ___ بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے "...... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیض کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا ___

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے ___

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا ___ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت اُستاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک اُنگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اُونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا چل ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مار واڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اُس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چُوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی"!

شام کو جب وہ اڈّے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سُنانے والا تھا ——— بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈّے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتّیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مار واڑی کا یہ اندیشہ "کیا باج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرّت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مار واڑیوں کو گالی دی ---- ---- "غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ——— نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہو گا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ——— سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈّے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر ...... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ——— تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں"!

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے ...... مزے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔"

اُستاد منگو موجودہ سویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا اور اُسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اُس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں پیدا ہونے والی تھیں، وہ "انہیں" "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سُرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا

"جدید آئین کا دوسرا حصّہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استاد منگو صرف اُوپر کے جملے ہی کو کچھ قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اُس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کرکے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا ——

"نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں، اگر ...... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی"۔

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے"۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں"۔

"وہ بے کار گریجوایٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہو گی"۔

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ......!" اور وہ دن میں کئی بار سوچتا "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہوئے چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا، جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں، اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک اُستاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سُنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے" اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی —— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی —— آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی، اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اُس نے نئے قانون کی خوشی میں ۱۳، مارچ کو چوہدری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی ...... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش باش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ـــــــ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا ـــ

"تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا وئی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی۔

"ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی

کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا ——

"چلو یہ بھی اچھا ہوا —— شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اُتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا —— جب اُستاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اُسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیتے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا ——

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے ،اندر اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اُترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے"۔ اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ پر چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اُسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی"۔

"کرایہ پانچ روپے ہوگا" استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا "پانچ روپے۔ کیا تم ———؟"

"ہاں ہاں" "پانچ روپے"۔ یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح اُوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا ———

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ۔۔۔ ۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ــــــ اب ہمارا راج ہے بچّہ!"

لوگ جمع ہو گئے" اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ــــ

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ــــ اب نیا قانون ہے میاں ــــ نیا قانون!"

اور بے چارا گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بیوقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

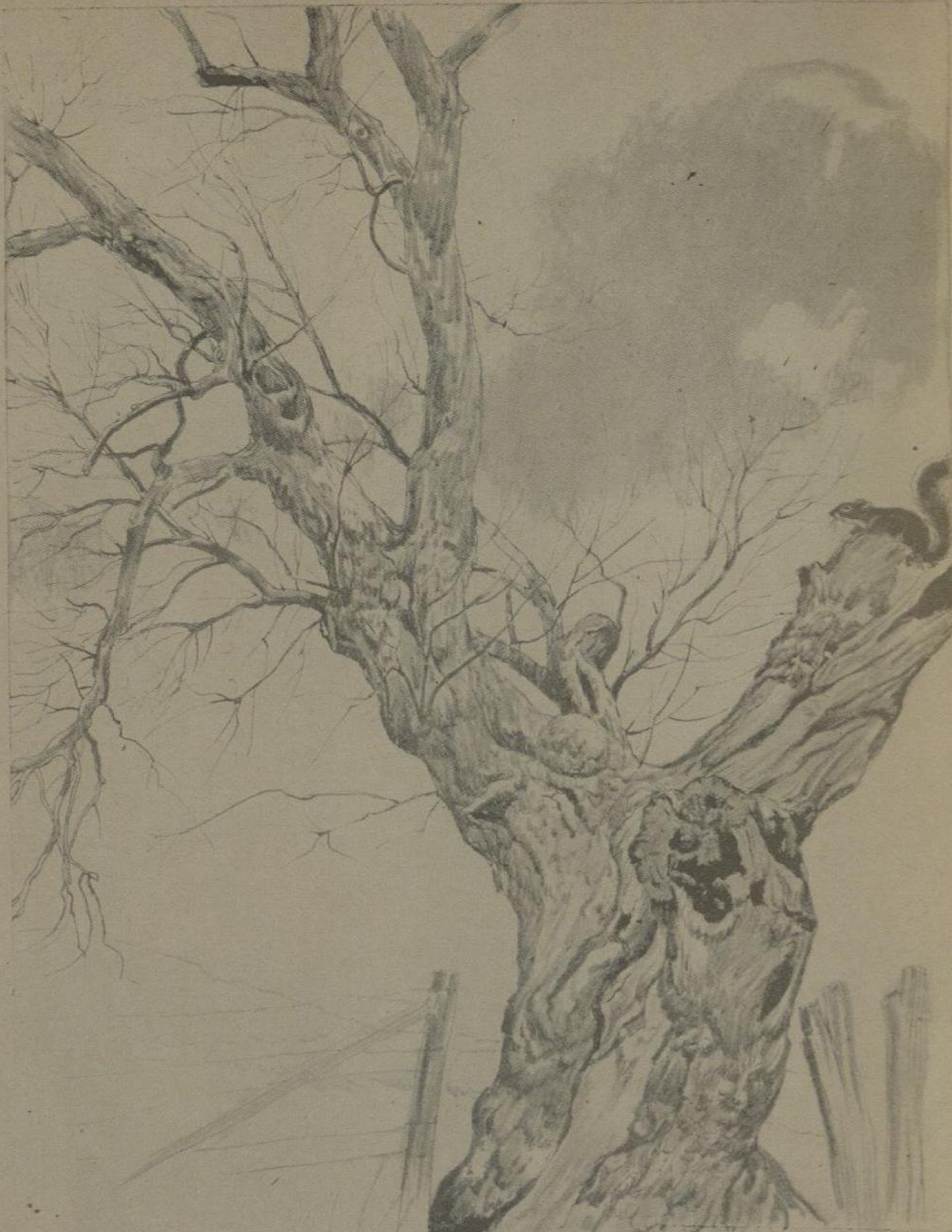
"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو ــــ قانون وہی ہے پرانا!"

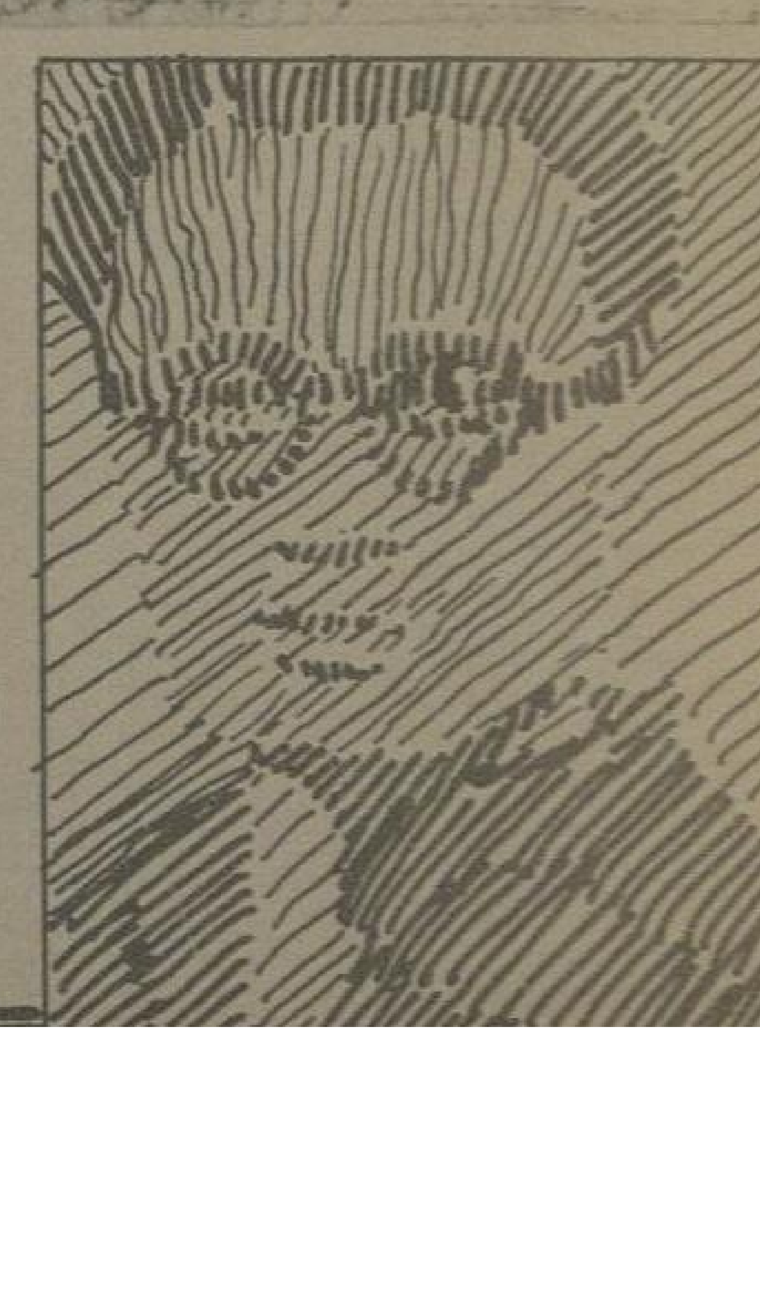
اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

پیلی رنگت، کھلی پیشانی، ٹیڑھے بال، ڈراؤنی آنکھیں، سعادت حسن منٹو کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یرقان میں مبتلا ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے بعد سب سے بڑے "سیف و سبو" اور محمود غزنوی کے بعد سب سے بڑے سترھویں حملے تھے۔ کئی بار حکومت نے گڑگڑا (گڑگڑا) کر کہا اٹھارواں حملہ چھوڑ دو اور واپس امرتسر چلے جاؤ لیکن وہ باز نہ آیا۔ اور اس نے کہا۔ خروش رفتہ باز آید کہ نیاید ــــ نہ ساختہ تھے نہ پرداختہ۔ قلم بر ــــ داشتہ تھے۔ جب ہاتھوں میں قلم اٹھانے کی سکت نہ رہی تو لکھنا بند کر دیا تھا۔ حالتِ نزع میں وصیت کی تھی کہ رہنے دو ابھی ساغر و مینا (کعبہ نہیں) مرے آگے۔ جوان تو شاید کسی عمر میں نہ تھے لیکن سننے میں آیا ہے کہ توبہ توڑتے وقت ان کے چہرے پر جوانی کی جھلک آجاتی تھی ہر قسم کے حجاب کو (حجاب امتیاز علی سمیت) پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا حادثۂ عظیم پیدا ہونا نہیں بلکہ غلط وقت پر پیدا ہو جانے کا حادثۂ صغرا تھا۔ ترقی پسند کی ترکیب سے چڑ تھی۔ مگر شعور، تحت الشعور اور لاشعور شاہ کار اقدار، بورژوا اور جدلیاتی مادیت سب کے معجون تھے (حالانکہ انہیں پھر اس سے چڑ ہے) تمام عمر بغیر عنوان کے ایک ناول لکھنے کا عزم کرتے رہے جس کا حرف سرورق آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد چھپ سکا

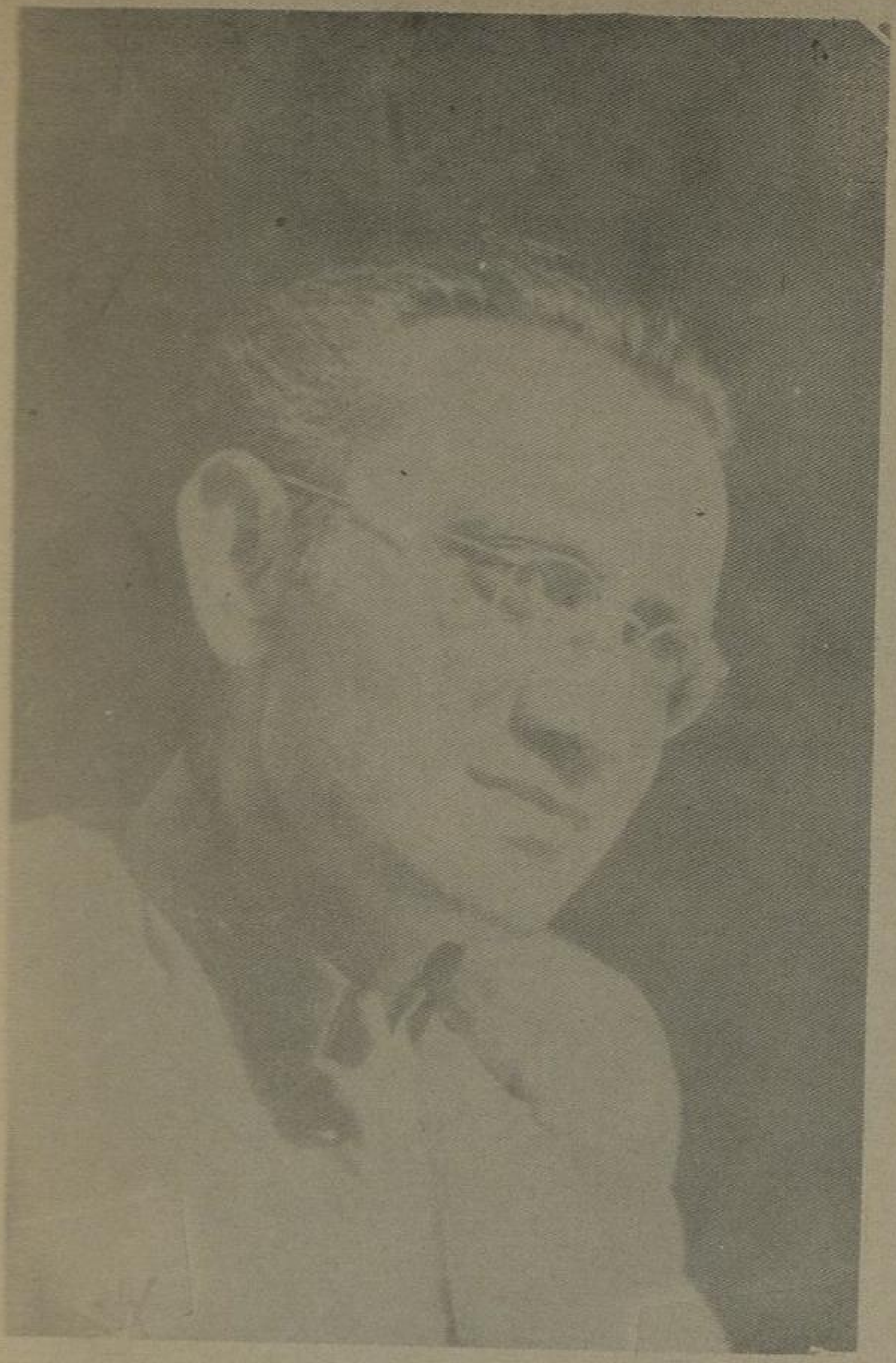
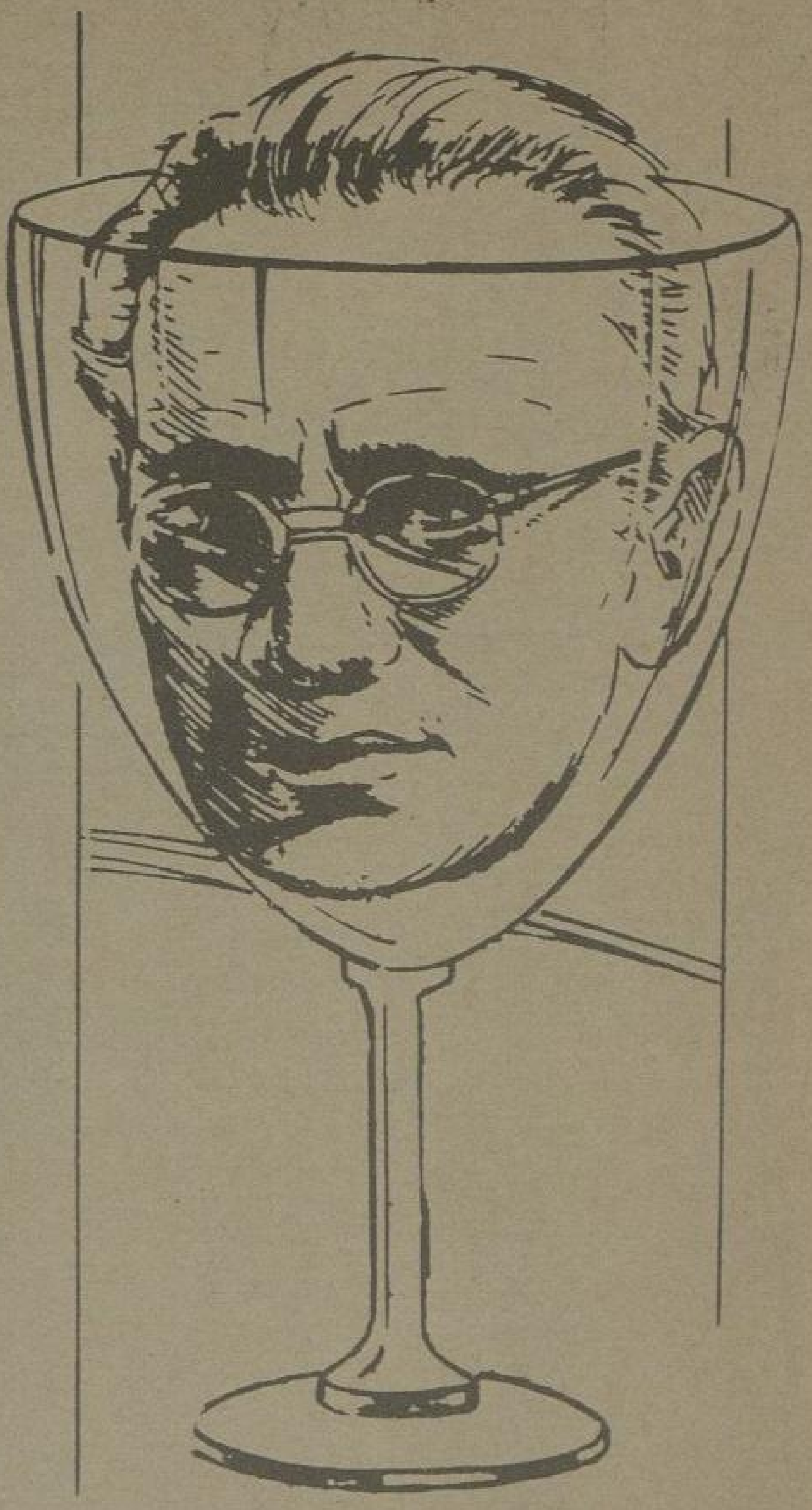
کنہیا لال کپور







مُوذیل





موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ــــــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لئے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی ــــــ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا جیسے رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں تر و تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا اور اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان ــــــ محلے میں تھا جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا ــــــ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا ــــــ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا۔ آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک مسلمان تھے اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ــــــ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لئے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا:

"نرنجن! یہ ٹھیکے دیکھے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے لیکن یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیا کرتا ہے۔"

مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا۔

"یار تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ——— میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں بمبئی ہے ——— بمبئی۔ تمہیں یہاں آئے ہوئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ——— بارہ برس سے۔"

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس کچھ منتر ہے ——— یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پہ کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہواؤں میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ——— محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لئے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لئے اچھا تھا ——— وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لئے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے کا روڑا ہی نہیں بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کی بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی ——— ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے ——— کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگر سنگھ کی بہن تھی مگر بہت ہی نرم و نازک اور لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی پیند اور نہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی سکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ سکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ——— لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا تھا شاید اس لئے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس، اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ

ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما، سنگاپور، ہانگ کانگ ___ پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی جو بری نہیں تھی ___ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزار ہا دیئے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی، اس سے ترلوچن کو گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی ۳۵ برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا اسی دن اسکی مڈبھیڑ موزیل سے ہوئی۔ جو پہلی نظر میں اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بےحد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ سٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیلی پڑی بڑی بڑی چھاتیاں چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں، بانہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ سٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ ___ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو موزیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موزیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔

ترلوچن بوکھلا گیا۔

جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موزیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موزیل اس کے اوپر تھی۔

کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی ___ بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے اِدھر اُدھر تھیں اور ___ جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موزیل ___ ساری موزیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

جب ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موزیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی۔

"یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے۔"

اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کے ساتھ والی انگلی پھنساتی کوریڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی، اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں، وہ لڑکیاں کچھ عرصے کیلئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئے پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں "گوڈے گوڈے" دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر ذرا سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لئے پر تکلف کھانے منگوائے ہیں۔ مگر اس کو کوئی پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا، جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی:

"تم سکھ ہو ــــ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں"۔

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا: "کون سی نازک باتیں ــــ تمہارے پرانے یاروں کی"۔

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی:

"یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو ــــ ہاں وہ میرے یار ہیں ــــ اور مجھے اچھے لگتے ہیں ــــ تم جلتے ہو تو جلتے رہو ــــ"

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا: "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی"۔

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی:

"تم سچ مچ سکھ ہو ــــ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ــــ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کر لو ــــ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا"۔

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہشمند تھا۔ اس

میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اکثر اس کی توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی اسے خفیف ہونا پڑتا تھا مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔

اس کو موذیل پسند تھی۔

پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اسکے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب کہ موذیل موج میں تھی، اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا:

"موذیل ___ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا:

"میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ___ یہ میرا مذاق نہیں میری محبت کا مذاق ہے۔"

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا:

"تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ___ تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے تم خوبصورت ہو۔"

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم پھوں پھوں کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی۔

"میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں ___ تم تکلیف نہ کرو۔"

ترلوچن چلایا: "موذیل!"

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں:

"خدا کی قسم ___ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ___ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو

سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ـــــ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی"۔

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آگئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کردی ـــــ اس میں جو پنیں لگی تھیں وہ اس نے ایک ایک کرکے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کے کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکہ کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لئے تھے۔ اسے اس کا احساس تھا مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرمانبردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کردے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا:

"یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی:

"تمہارے بال بہت ملائم ہیں ـــــ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا ـــــ ترلوچ ـــــ تم یہ مجھے دیدو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لئے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی"۔

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا:

"میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا ـــــ تم کیوں اڑاتی ہو ـــــ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ـــــ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا مگر صرف اس لئے کرتا رہا ہوں کہ تم سے مجھے بے پناہ محبت ہے ـــــ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں"۔

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا:

"مجھے معلوم ہے"۔

"پھر ـــــ" ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کئے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ـــــ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"مجھے معلوم ہے"۔ بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی"۔

ترلوچن اچھل پڑا۔ "سچ"۔

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لئے چمکے:

"ہاں"۔

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا ـــــ "تو ـــــ کب؟"

موذیل الگ ہٹ گئی۔ "جب ——— جب تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے"۔
ترلوچن اس وقت "جوہو سوہو" بنا ہوا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا:
"میں کل ہی کٹوا دوں گا"۔
موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی:
"تم بکواس کرتے ہو ترلوچ ——— تم میں اتنی ہمت نہیں ہے"
اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا:
"تم دیکھ لو گی"
"دیکھ لوں گی" ——— اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور پھوں پھوں کرتی باہر نکل گئی۔
ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا ——— وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لئے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیئے اور داڑھی بھی منڈوا دی۔
یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔
جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لئے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔
ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیرلیس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔
بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے آ جائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کیلئے ٹھٹھکی۔ پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچن" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔
اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا ——— موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا ——— ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا:
"نیچے کچھ پہن تو لیا کرو"
موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ سٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا: "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ——— ایسے ہی چلتا ہے"۔
ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آ گیا جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔

مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا:
"شادی کل ہو گی!"
"ضرور۔" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔
طے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی اس لئے ان کو دس، پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی اس لئے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انہیں پروگرام کے مطابق روانہ ہو جانا تھا۔
موذیل، فورٹ کے ایک سٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی سٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔
ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔
دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لئے وہیں رہے گی۔
ترلوچن پر کیا گزری؟ ___ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا۔ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوتے ہیں اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔
لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر گدگدی لگاتی غائب ہو جاتی تھی۔
وہ بے حیا تھی ___ بے مروت تھی ___ اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہو گی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔
وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا لیکن اپنی مرضی سے، ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے۔ مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مرمٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انہیں خرید دے۔
ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی تھی۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا مگر وہ اس کو اس سے آگے

ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی:

"تم سکھ ہو — مجھے تم سے نفرت ہے!"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دو ٹک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اسکو ناپسند تھے۔ اس لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی:

"یہ حیا ویا کیا بکواس ہے — اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو — تم مجھے یہ بتاؤ کہ کونسا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا — یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں — مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو — تم سکھ ہو — مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے — یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے — شرم آنی چاہئے تمہیں — اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے۔"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا۔ اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں۔ اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔

کرپال کور — ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی۔ وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں — لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا مگر کرفیو کی کون پرواہ کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اسکے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا۔ وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری — اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے — بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاویں پہنتی تھیں — آواز قریب آتی گئی۔ یک لخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا جو یہودیوں

کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ____ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا بھنچ جائے گی۔

ترلوچن، پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا" یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ____ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟"

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی ____ اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کُرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں۔

ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا۔ موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِ عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی:

"تم پھر سکھ بن گئے ترلوچ"۔

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا:

"اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیوی بلو سکرٹ صاف کر سکے ____ مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے"۔

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی: "بولتے کیوں نہیں سردار صاحب"۔

ترلوچن اپنی پچھلی بے وقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ____ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔

ترلوچن نے اس سے پوچھا: "بیمار رہی ہو"۔

"نہیں"۔ موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو"۔

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں"۔ موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی ____

"تم گویا کہ ____ اب پھر ____ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو"۔

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا: "ہاں"۔

"مبارک ہو"۔ موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی: "کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کر دی"۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا: "ہاں"۔

"مبارک ہو ____ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی"۔

"نہیں"۔

"یہ بہت بری بات ہے۔" موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔ "ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہئے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا:

"کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے"۔

"نہیں"۔

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موذیل کے ہونٹوں پر لپ سٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی:

"تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی"۔

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا ——— موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے، بدصورت ہے، بے وقوف ہے، بے مروت ہے ——— مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا:

"موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں ——— میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ——— جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لئے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا:

"وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی ——— کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو"۔

"اس کو ابھی تک معلوم نہیں ——— داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی ——— محض انتقامی طور پر ——— اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں ——— مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے"۔ ——— ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی:

"یہ بہت اچھا ہے ——— مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے ——— دیکھا کس زور سے کاٹا ہے"۔

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کُرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"کب ہو رہی ہے تمہاری شادی"؟

"ابھی کچھ پتہ نہیں" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔

"ترلوچن ____ تم کیا سوچ رہے ہو"؟

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی۔ "تم اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو ____ جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے"؟

"مشکل ____ موذیل۔ تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں ____ کسی بھی معاملے کی نزاکت ____ تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو ____ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا"۔

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری:

"افسوس بی ڈیمڈ ____ سلی ایڈیٹ ____ تم یہ سوچو کہ تمہاری اس ____ کیا نام ہے اس کا ____ اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے ____ تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے ____ تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے ____ تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو۔ اور بہت ڈرپوک ____ مجھے نڈر مرد چاہئے ____ لیکن چھوڑو ان باتوں کو ____ چلو آؤ تمہاری اس کور کو لے آئیں"۔

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا۔

ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا: "کہاں سے!"

"وہیں سے جہاں وہ ہے ____ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں ____ چلو آؤ میرے ساتھ"۔

"مگر سنو تو ____ کرفیو ہے"۔

"موذیل کے لئے نہیں ____ چلو آؤ"۔

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے لگی کہ رک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی:

ترلوچن نے پوچھا: "کیا بات ہے"؟

موذیل نے کہا: "یہ تمہاری داڑھی ____ لیکن خیر ٹھیک ہے اتنی بڑی نہیں ہے ____ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو"۔

"ننگے سر" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا: "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا"۔

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا: "کیوں"؟

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی: "تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں"۔

"کیوں ٹھیک نہیں"۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ـــــ وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا"۔

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری:

"تم واقعی اول درجے کے ایڈیٹ ہو ـــــ گدھے کہیں کے ـــــ اس کی جان کا سوال ہے ـــــ کیا نام ہے تمہاری اس کور کا، جس سے تم محبت کرتے ہو"۔

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی: "موذیل۔ وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے ـــــ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی"۔

موذیل چڑ گئی:

"اوہ تمہاری محبت بی ڈیمڈ ـــــ میں پوچھتی ہوں کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں ـــــ اسکی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے ـــــ اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے"۔

ترلوچن نے کہا۔ "وہ تو میں ہر وقت پہنے رہتا ہوں"۔

"بہت اچھا کرتے ہو ـــــ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے یہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ـــــ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے"۔

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا: "مجھے اس کی پروا نہیں ـــــ اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا ـــــ میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا"۔

موذیل بھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔

"گدھے ـــــ تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے ـــــ تمہاری وہ ـــــ کیا نام ہے اس بھڑوی کا ـــــ جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک۔ نہ رہے گا ـــــ تم سکھ ہو ـــــ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو"۔

ترلوچن بھنا گیا۔ "بکواس نہ کرو"۔

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا:

"ڈارلنگ چلو، جیسے تمہاری مرضی ـــــ جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا: "تم کپڑے نہیں پہنو گی"۔

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا ـــــ "نہیں ـــــ چلے گا اسی طرح"۔

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔

ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے

اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تنگڑی ٹانگیں چوڑی کئے سگریٹ پی رہی تھی، بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔

ترلوچن نے غصے سے کہا: "تم بہت ذلیل ہو۔"

موذیل مسکرائی: "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی ـــ اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے ـــ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔"

بازار بالکل سنسان تھا ـــ ایک طرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے، جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹرامیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتہ کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی: "اے ـــ کدھر جا رہا ہے؟"

ترلوچن سہم گیا ـــ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی۔ بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا ـــ "اوہ، تم ـــ ہم کو پہچانا نہیں تم نے ـــ موذیل ـــ" پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا ـــ "ادھر اس باجو ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے ـــ ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے۔"

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر اس کو دیا ـــ "لو پیو۔"

سپاہی نے سگریٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگریٹ نکالا اور اس سے کہا: "ہیئر از لائٹ۔"

سپاہی نے سگریٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی ـــ جس سے گزر کر انہیں ـــ محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے ـــ خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔

سمندر کی چیل تن لہروں سے ٹکراتی ابھرتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا:

"ترلوچ ڈیئر ـــــ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں ـــــ تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا ـــــ سچ کہتی ہوں یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے"۔

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی ـــــ کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لحظے کے لئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا:

"کوئی بات نہیں ـــــ چلو آؤ"۔

دونوں چلنے لگے۔

ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا کہ موذیل آ گئی ـــــ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے۔ اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا:

"اے کیا کر رہا ہے ـــــ اپنے بھائی کو مارتا ہے ـــــ ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے"۔ ـــــ پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی ـــــ "کریم۔ اٹھاؤ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر"۔

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ٹھوکا دیا۔ "عیش کر سالی ـــــ عیش کر" ـــــ پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا: "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرام زادے نے"۔

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔

"کوئی ذلیل حرکت نہیں ـــــ سب چلتا ہے ـــــ آؤ"۔

اور وہ تیز تیز چلنے لگی ـــــ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے جہاں کرپال کور رہتی تھی۔

موذیل نے پوچھا: "کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا: "تیسری گلی میں۔ نکڑ والی بلڈنگ"۔

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے

رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ــــ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ نٹ پاتھ پر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا:

"ترلوچ ڈیئر ــــ یہ پگڑی اتار دو"۔

ترلوچن نے جواب دیا: "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا"۔

موذیل جھنجھلا گئی۔ "تمہاری مرضی ــــ لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے"۔

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ــــ صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا:

"دیکھو۔ ایسا کرو ــــ میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ــــ تم میرے پیچھے آنا ــــ بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔ سمجھے ــــ مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو"۔

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹ کھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے ــــ سیڑھیوں کے پاس ــــ ترلوچن ہانپ رہا تھا مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔

اس نے ترلوچن سے پوچھا: "کون سا مالا"۔

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری: "دوسرا"۔

"چلو"۔

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوریڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی: "مہنگا سنگھ جی ــــ مہنگا سنگھ جی"۔

اندر سے مہین سی آواز آئی: "کون"۔

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا ــــ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے ــــ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا۔ پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہوگیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا: "ڈرو نہیں۔ ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے"۔

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہوگئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا: "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہوجائیں ــــ اور ماتا جی سے بھی ــــ لیکن جلدی کرو"۔

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہورہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی: "اسے پکڑ لیا انہوں نے"۔

ترلوچن نے پوچھا: "کسے"۔

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی: "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ــــ تم یہ کپڑے اتارو"۔

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور وحشت زدہ ہوگئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتہ اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر ترلوچن سے کہنے لگی:

"جاؤ لے جاؤ ــــ لیکن ٹھہرو"۔

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے اور اس سے کہا: "جاؤ ــــ جلدی نکل جاؤ"۔

ترلوچن نے اس سے کہا: "آؤ" ــــ مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں"۔ موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں"۔

"جہنم میں جائیں وہ ــــ تم اسے لے جاؤ"۔

"اور تم!"

"میں آجاؤں گی"۔

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آکر انہوں نے کوٹنا شروع کر دیا

جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا:

"سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے ـــــ میں دروازہ کھولتی ہوں"۔

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔ "دروازہ"۔

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی:

"میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں ـــــ تم میرے پیچھے بھاگنا ـــــ میں اوپر چڑھ جاؤں گی ـــــ تم بھی اوپر چلے آنا۔ یہ لوگ دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے۔"

ترلوچن نے پوچھا: "پھر!"

موذیل نے کہا۔ "یہ تمہاری ـــــ کیا نام ہے اس کا ـــــ موقع پا کر نکل جائے ـــــ اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا"۔

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔

موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری ـــــ سب بوکھلا گئے۔ اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا ـــــ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا ـــــ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی ـــــ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی ـــــ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے ـــــ موذیل کا پاؤں پھسلا ـــــ اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آ رہی ـــــ پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا، کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے ارد گرد جمع ہو گئے ـــــ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے ـــــ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی:

"موذیل ـــــ موذیل!"

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا:

"جاؤ دیکھو ـــــ میرا انڈرویر وہاں ہے کہ نہیں ـــــ میرا مطلب ہے وہ ـــــ"

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے سے کہا: "تم سچ مچ سکھ ہو ـــــ جاؤ، دیکھ کر آؤ۔"

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا:

"یہ میاں بھائی ہے — لیکن بہت دادا قسم کا — میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں"۔

ترلوچن واپس آگیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے — موذیل نے اطمینان کا سانس لیا — لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا:

"اوہ ڈیم اِٹ — " یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی — "آل رائٹ ڈارلنگ — بائی بائی"۔

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

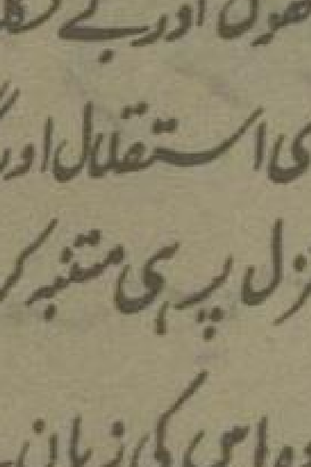
موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی:

"لے جاؤ اس کو — اپنے اس مذہب کو — "

اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

منٹو کو سارا ہندوستان جانتا ہے مگر اسے بہت کم لوگ پہچانتے ہیں۔ منٹو سے جن لوگوں کی ملاقات نہیں ہوئی وہ اسے ہتک، خوشبا اور کالی شلوار کے کرداروں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ جن لوگوں نے منٹو سے بالمشافہ باتیں کی ہیں وہ اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں اور بے تکلفانہ اندازِ گفتگو سے اسے ایک مغرور اور خود پرست انسان سمجھتے ہیں لیکن دراصل منٹو کا دل فولادی استقلال اور گلابی خلوص کا ایک دلآویز مرکب ہے۔ جن لوگوں کو منٹو پسند نہیں کرتا انہیں تعارف کی اوّلین منزل پر ہی متنبہ کر دیتا ہے "مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی" — اور جن لوگوں سے منٹو کو اُنس ہے وہ اس کی زبان سے رواجی اُنس کی اصطلاحات سننے کے لئے ترستے رہ جاتے ہیں۔ وہ بحیثیت انسان ایک محبوب شخصیت کا مالک ہے اور بحیثیت فنکار صداقت کا علمبردار ہے۔

احمد ندیم قاسمی



نقوش لاہور

مکرمی طفیل صاحب

السلام علیکم۔ برادرم شفیق شفائی

صاحب نے مجھے اپنا مجموعۂ کلام بعنوان "بازار" اس غرض

سے دیا تھا کہ میں اس کا دیباچہ لکھ دوں۔ یہ مسوّدہ چوہدری نذیر احمد

کی دکان یعنی نیا ادارہ میں پڑا رہا۔ اس دوران میں

میں بیمار ہو گیا۔ صحت یاب ہونے پر جب میں نے نذیر صاحب

سے مسوّدے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میری غفلت کے باعث شفیق صاحب

کا مسوّدہ گم ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے آپ میری طرف سے

اُن کی خدمت میں معذرت پیش کر دیں۔

میں چوہدری نذیر صاحب سے پھر گذارش کروں گا کہ وہ

تلاش کریں۔ شاید وہ مسوّدہ مل جائے۔ اگر بشرطیکہ انہوں

نے اس کو کسی اشاعت کے لیے نہ دیا ہو۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۲ دسمبر ۱۹۵۲

DAR-UL-FAROGH-I-URDU, AIBAK ROAD, ANARKALI - LAHORE

حاجرہ مسرور کے نام

منٹو کے غیر مطبوعہ خطوط

حاجرہ مسرور، شاد امرتسری اور ماہنامہ شاہراہ دہلی کے پبلشر یوسف دہلوی کے نام

معطیٰ: احمد ندیم قاسمی

خاتونِ مکرم!

تسلیمات۔ لاہور کی عدالت میں میرے ایک افسانے بعنوان "دھواں" پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے آپ کو گواہِ صفائی کے طور پر بلانے کی جرأت کی ہے۔

متذکرہ صدر افسانے کے متعلق آپ کی جو رائے بھی ہے مجھے منظور ہوگی اسلئے کہ فحاشی اور غیر فحاشی کے اہم موضوع پر آپ جیسی اہل الرائے خاتون کے خیالات نہ صرف میرے لئے بلکہ ملکی ادب کے لئے مفید ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ دعوت قبول فرمائیں گی۔

نیاز کیش:

سعادت حسن منٹو

۱۷۔ اڈلفی چیمبرز، کلیئر روڈ بمبئی ۸

میرے تحریری بیان کی نقل:

"میں ساقی بکڈپو دہلی کی مطبوعہ کتاب بعنوان "دھواں" کا مصنف ہوں۔ یہ کتاب میں نے سن ۱۹۴۱ء میں جبکہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا ساقی بکڈپو کے مالک میاں شاہد احمد صاحب کے پاس غالباً ساڑھے تین سو روپے میں فروخت کی تھی۔ اس کے جملہ حقوق اشاعت اب ساقی بکڈپو کے پاس ہیں۔

اس کتاب کے جو نسخے میں نے عدالت میں دیکھے ہیں ان کے ملاحظے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

چوبیس افسانوں کے اس مجموعے میں سے جو انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں دو افسانے بعنوان "دھواں" اور "کالی شلوار" استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ دونوں کہانیاں عریاں اور فحش نہیں ہیں۔

کسی ادب پارے کے متعلق ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر، ایک اشتہار فراہم کرنے والے مینجر اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہو سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تینوں کسی خاص اثر، کسی خاص غرض کے ماتحت اپنی رائے قائم کر رہے ہوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں حضرات ایسی رائے دینے کے اہل ہی نہ ہوں کیونکہ کسی بڑے شاعر، کسی بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کر سکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب و عواطف سے آگاہ ہو۔

استغاثے نے میرے ان دو افسانوں پر کوئی بصیرت افروز تنقید نہیں کی۔ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ یہ دونوں افسانے فحش ہیں اس آدمی کی جو روشنی کا خواہشمند ہے۔ جو اپنے عیوب و محاسن جاننا چاہتا ہے اور ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہے ہرگز ہرگز تسکین نہیں ہوتی ــــ میں اگر جواب میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاؤں کہ یہ دونوں افسانے فحش نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ میں اندھیرے میں اور بھی اضافہ کروں گا۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا اور جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

زبان میں بہت کم لفظ فحش ہوتے ہیں۔ طریقہ استعمال ہی ایک ایسی چیز ہے جو پاکیزہ سے پاکیزہ الفاظ کو بھی فحش بنا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کوئی بھی چیز فحش نہیں لیکن گھر کی کرسی اور ہانڈی بھی فحش ہو سکتی ہے۔ اگر ان کو فحش طریقے سے پیش کیا جائے گا ــــ چیزیں فحش بنائی جاتی ہیں کسی خاص غرض کے ماتحت۔

عورت اور مرد کا رشتہ فحش نہیں۔ اس کا ذکر بھی فحش نہیں۔ لیکن جب اس رشتے کو چوراسی آسنوں یا جوڑ دار خفیہ تصویروں میں تبدیل کر دیا جائے اور لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ تخلیے میں اس رشتے کو غلط زاویے سے دیکھیں تو میں اس فعل کو صرف فحش ہی نہیں بلکہ نہایت گھناؤنا، مکروہ اور غیر صحت مند کہوں گا۔

فحش اور غیر فحش میں تمیز کرنے کے لئے شاید یہ مثال کام دے سکے۔

ایک آرٹ گیلری میں نمائش کے لئے ننگی عورتوں کی بہت سی تصویریں پیش ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے بھی جیسا کہ ظاہر ہے دیکھنے والوں کا اخلاق خراب نہ کیا اور نہ ان کے شہوانی جذبات ہی کو ابھارا۔ البتہ ایک تصویر جس میں عورت کا سارا بدن کپڑوں میں مستور تھا اور ایک خاص حصہ اس ترکیب سے نیم عریاں چھوڑ دیا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کے جذبات میں گدگدی پیدا ہو، متفقہ طور پر فحش قرار دی گئی ــــ کیوں ــــ اس لئے کہ آرٹسٹ کی نیت میں فرق تھا اور اس نے جان بوجھ کر لباس کو کچھ اس طرح اوپر اٹھا دیا تھا کہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ جائے اور وہ اپنے تصور سے مدد لیکر اس نیم عریاں حصے کو عریاں دیکھنے کی کوشش کریں۔

بنگال کی وہ ستم رسیدہ عورت جس کے پاس تن ڈھانکنے کو صرف چند چیتھڑے میسر ہیں ہرگز عریاں قرار نہیں دی جا سکتی۔ مگر کلب گھر کی وہ تیتری یقیناً فحش اور عریاں ہے جو نمائش کی خاطر بلاؤز میں سے اپنے پیٹ اور اپنی چھاتیوں کو باہر جھانکنے کی اجازت دیتی ہے۔

تحریر و تقریر میں، شعر و شاعری میں، سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہئے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے۔ اگر اس کا شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر، وہ بت قطعی طور پر فحش ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ ترغیب "دھواں" میں موجود ہے یا نہیں۔ آیئے ہم اس افسانے کا تجزیہ کریں۔

مسعود ایک کم سن لڑکا ہے غالباً دس بارہ برس کا ــــ اس کے جسم میں جنسی بیداری کی پہلی لہر کس طرح پیدا ہوتی ہے یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ ایک خاص فضا اور چند خاص چیزوں کا اثر بیان کیا گیا ہے جو مسعود کے جسم میں دھندلے دھندلے خیالات پیدا کرتا ہے۔

ایسے خیالات، جن کا رجحان جنسی بیداری کی طرف ہے۔ یہ بیداری وہ سمجھ نہیں سکتا لیکن غیر شعوری طور پر محسوس ضرور کرتا ہے۔ بے کھال کا بکرا جس میں سے دھوآں نکلتا ہے۔ سردیوں کا ایک دن جب بادل گھرے ہوتے ہیں اور آدمی سردی کے باوجود ایک میٹھی میٹھی حرارت محسوس کرتا ہے۔ ہانڈی جس میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ بہن جس کی وہ ٹانگیں دباتا ہے —— یہ سب عناصر مل کر مسعود کے جسم میں جنسی بیداری کرتے ہیں۔ جوانی کی اس پہلی انگڑائی کو وہ غریب سمجھ نہیں سکتا اور انجام کار اپنی ہاکی سٹک توڑنے کی ناکام سعی کرتا کرتا تھک جاتا ہے —— یہ تھکاوٹ اس بے نام چنگاری کو۔ اس 'کچھ کرنے' کی تحریک کو دبا دیتی ہے۔

"دھوآں" میں شروع سے لے کر آخر تک ایک کیفیت۔ ایک جذبے۔ ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے۔ اس موضوع سے ہٹ کر اس میں دوراز کار باتیں نہیں کی گئیں۔ اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جائے۔ اس لیے کہ افسانے کا موضوع "شہوت" نہیں ہے۔ استغاثہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم نظری ہے —— خشخاش کے دانے افیم کی گولی بننے تک کافی مراحل طے کرتے ہیں۔

میں نے اس کہانی میں کوئی سبق نہیں دیا۔ اخلاقیات پر یہ کوئی لکچر بھی نہیں کیونکہ میں خود کو نام نہاد ناصح یا معلم اخلاق نہیں سمجھتا۔ البتہ اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اس لڑکے کو مضطرب کرنے والی چیزیں خارجی تھیں۔

میرے نزدیک قصائیوں کی دکانیں فحش ہیں کیونکہ ان میں ننگے گوشت کی بہت بدنما اور کھلے طور پر نمائش کی جاتی ہے —— میرے نزدیک وہ ماں باپ اپنی اولاد کو جنسی بیداری کا موقعہ دیتے ہیں جو دن کو بند کمروں میں کئی کئی گھنٹے اپنی بیوی سے سر دبوانے کا بہانہ لگا کر اس سے ہم بستری کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بچوں کے اندر بہت کم سنی ہی میں جنسی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ کسی حد تک آپ کو میرے افسانے کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہے —— اتنی چھوٹی عمر میں جنسی بیداری کا پیدا ہونا میرے نزدیک بہت ہی بھونڈی چیز ہے۔ یعنی اگر میں کسی چھوٹے بچے کو جنسیات کی طرف راغب دیکھوں تو مجھے کوفت ہوگی —— میرے صناعانہ جذبات کو صدمہ پہنچے گا۔

افسانہ نگار اس وقت اپنا قلم اٹھاتا ہے جب اس کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کیونکہ بہت عرصہ گزر چکا ہے لیکن "دھوآں" لکھنے سے پہلے مجھے کوئی منظر، کوئی اشارہ یا کوئی واقعہ دیکھ کر ضرور ایسا صدمہ پہنچا ہوگا جو افسانہ نگار کے قلم کو حرکت بخشتا ہے۔

افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس بے نام سی لذت میں جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی خود کو یا قارئین کو کہیں شریک نہیں کیا —— یہ ایک اچھے فنکار کے قلم کی خوبی ہے۔

اس افسانے میں سے میں چند سطور پیش کرتا ہوں جن سے افسانہ نگار کے غائت درجہ محتاط ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے کہیں بھی مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا —— ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیتی۔

۱۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہوا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

۲۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار سکول میں

تنے ہوئے رسے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسہ اس طرح پھسلتا ہوگا۔

۳۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا: "کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اترنے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا" ـــــ لیکن ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جس طرح وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ اس بات کے ضامن ہیں کہ مسعود کا ذہن کہیں بھی شہوت سے ملوث نہیں ہوا۔ وہ اپنی بہن کی کمر دباتا ہے جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ ٹانگیں دباتا ہے تو اس کا خیال بازیگر کی طرف چلا جاتا ہے جس کا تماشا اس نے ایک بار اپنے سکول میں دیکھا تھا اور جب یہ سوچتا ہے کہ اگر اس کی بہن ذبح کر دی جائے تو کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا تو فوراً اسے بری بات سمجھ کر اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے اور خود کو مجرم سمجھتا ہے۔

خدا جانے استغاثہ اس افسانے کو فحش کیوں کہتا ہے جس میں فحاشی کا شائبہ تک موجود نہیں ـــــ اگر میں کسی عورت کے سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ ہی کہوں گا۔ عورت کی چھاتیوں کو آپ مونگ پھلی، میز یا استرہ نہیں کہہ سکتے یوں تو بعض حضرات کے نزدیک عورت کا وجود ہی فحش ہے مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کو بکری کا ایک معصوم بچہ ہی معصیت کی طرف لے جاتا ہے ـــــ دنیا میں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے شہوانی لذت حاصل کرتے ہیں اور ایسے انسان بھی آپ کو مل جائیں گے لوہے کی مشینیں جن کے جسم میں شہوت کی حرارت پیدا کر دیتی ہیں ـــــ مگر لوہے کی ان مشینوں کا جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں کوئی قصور نہیں ہے اسی طرح نہ بکری کے معصوم بچے کا اور نہ مقدس کتابوں کا۔

ایک مریض جسم، ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں اصل میں انہی کے لئے شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔

میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لئے ہیں۔ نارمل انسانوں کے لئے جو عورت کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے ہیں [illegible] سے آگے نہیں بڑھتے ـــــ جو عورت اور مرد کے رشتے کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے ـــــ جو کسی ادب پارے کو ایک ہی دفعہ نگل نہیں جاتے۔

روٹی کھانے کے متعلق ایک موٹا سا اصول ہے کہ ہر لقمہ اچھی طرح چبا کر کھاؤ۔ لعاب دہن میں اسے خوب حل ہونے دو تاکہ معدے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور اس کی غذائیت برقرار رہے ـــــ پڑھنے کے لئے بھی یہ موٹا اصول ہے۔ ہر لفظ کو، ہر سطر کو، ہر خیال کو اچھی طرح ذہن میں چباؤ۔ اس لعاب کو جو پڑھنے سے تمہارے دماغ میں پیدا ہوگا، اچھی طرح حل کرو تاکہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے اچھی طرح ہضم ہو سکے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے نتائج برے ہوں گے جس کے لئے تم لکھنے والے کو ذمہ دار نہ ٹھہرا سکو گے۔ وہ روٹی جو اچھی طرح چبا کر نہیں کھائی گئی تمہاری بدہضمی کی ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہے۔

میں یہاں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں ـــــ فرانس میں ایک بہت بڑا افسانہ نگار گائی دی

موپاساں گزرا ہے۔ جنسیات اس کا محبوب موضوع تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور سائنسدانوں نے اس کے افسانوں کا اپنی علمی کتابوں میں حوالہ دیا ہے۔ اپنے ایک افسانے میں وہ ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی داستان بیان کرتا ہے جو بے حد الٹر تھے۔ پہلی رات کے متعلق دونوں نے سنی سنائی باتوں سے ایک عجیب وغریب تصویر اپنے ذہن میں کھینچ رکھی تھی۔ دونوں اس خیال سے کپکپا رہے تھے کہ خدا معلوم کتنی بڑی لذت ان کو پہلی رات کے ملاپ سے ہوگی۔

دونوں کی شادی ہوگئی —— دولہا ماہِ عسل منانے کی خاطر دلہن کو ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں پہلی رات کو —— اس رات کو جس میں دونوں کے خیال کے مطابق شاید فرشتے اتر کر ان کو لوریاں دینے والے تھے دلہا اور دلہن ہم بستر ہوگئے.... دونوں لیٹے تھے اور بس —— دلہن نے شامتِ اعمال اتنا کہہ دیا۔ "بس —— کیا یہی ہماری پہلی رات تھی جس کے ہم دونوں اتنے شیریں خواب دیکھا کرتے تھے" —— دلہا کو یہ بات کھا گئی۔ آخر مرد ہی تو تھا۔ اس نے سوچا یہ میری مردانگی پر حملہ ہے چنانچہ اس کی مردانگی بالکل ہی ختم ہوگئی —— عرقِ ندامت میں غرق وہ حجرۂ عروسی سے باہر نکل گیا۔ اس غرض سے کہ اپنی ناکام زندگی کسی دریا کے سپرد کردے۔ عین اس وقت جب یہ نیا نویلا دلہا اس خطرناک فیصلے پر پہنچا فرانس کی ایک کسبی —— ایک ویشیا پاس سے گزری جو غالباً گاہک تلاش کر رہی تھی۔ اس عصمت باختہ عورت نے اس کو اشارہ کیا۔ دلہا نے محض انتقام لینے کے لئے —— ساری عورت ذات سے بدلہ لینے کیلئے اس کو اس اشارے کا جواب دیا کہ ہاں میں تیار ہوں۔ وہ ٹکھیائی اسے اپنے گھر لے گئی —— اس غلیظ گھر میں دلہا وہ کام کرنے میں کامیاب ہوگیا جو وہ اپنے نفیس ہوٹل کے حجرۂ عروسی میں نہ کرسکا تھا —— اب وہ اس ویشیا کو بھول گیا —— دوڑا دوڑا اپنی نئی بیاہتا بیوی کے پاس پہنچا جیسے اسے اپنی کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے —— دونوں پاس پاس لیٹے تھے مگر اب اس کی بیوی کو وہ شیریں خواب دیکھنے کی خواہش باقی نہیں رہی تھی جس کا اس نے پہلے گلہ کیا تھا۔

یہ افسانہ پڑھ کر اگر کوئی شخص جو پہلی رات کو ناکام رہا ہو سیدھا ویشیا کے کوٹھے کا رخ کرے تو میں سمجھتا ہوں اس جیسا چغد اور کوئی نہیں ہوگا —— میرے ایک دوست نے یہی بے وقوفی کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنا کھویا ہوا وقار تو مل گیا پر اس کے ساتھ ہی ایک مکروہ مرض چمٹ گیا جس کے علاج کے لئے اسے کافی سے زیادہ زحمت اٹھانا پڑی۔

پچھلے دنوں میں نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کی تھی۔ اس میں میں نے کہا تھا:

"ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ پیش نہیں کرتا۔ اپنی ذاتی خواہشوں، خوشیوں، رنجشوں، بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی قلمی تصویروں میں بہت ممکن ہے آنسو اس کی دکھی بہن کے ہوں، مسکراہٹیں آپ کی ہوں اور قہقہے خستہ حال مزدور کے —— اس لئے اپنی مسکراہٹوں، اپنے آنسوؤں اور اپنے قہقہوں کے ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت بڑی غلطی ہے —— ہر ادب پارہ ایک خاص فضا، ایک خاص اثر، ایک خاص مقصد کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں سے یہ خاص فضا، یہ خاص اثر اور یہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو یہ ایک بیجان لاش رہ جائے گی۔"

میں ایک زمانے سے لکھ رہا ہوں۔ گیارہ کتابوں کا مصنف و مؤلف ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو کے تقریباً ہر سٹیشن سے میرے ڈرامے اور فیچر براڈکاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد سو سے اوپر ہے ــــ میں تحریر و تصنیف کے جملہ آداب سے واقف ہوں میرے قلم سے بے ادبی شاذونادر ہی ہو سکتی ہے ــــ میں فحش نگار نہیں۔ افسانہ نگار ہوں۔

دوسرے افسانے "کالی شلوار" کے متعلق میں نے اس لئے کچھ نہیں کہا کہ لاہور کی سیشن کورٹ میں فحاشی سے بری قرار دی جا چکی ہے ــــ!

راقم:

سعادت حسن منٹو!

فارم نمبر ۴۳ فوجداری (طبع شدہ)

سمن بنام گواہ

(دیکھو دفعات ۶۸ و ۲۵۲ و ۲۵۴ مجموعہ ضابطہ فوجداری)

جدول پنجم فارم ۳۱ ق

ضلع

بعدالت صاحب مجسٹریٹ درجہ

بنام [illegible]

چونکہ ہمارے روبرو نالش ہوئی ہے کہ [illegible] ساکن [illegible] نے جرم [illegible] 292 [illegible] مرتکب ہوا ہے (یا اسکے ارتکاب کا اس پر شبہ کیا گیا ہے) اور ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ مستغیث (یا ملزم) کی طرف سے شہادت متعلقہ اور اہم غالباً دے سکینگے لہٰذا آپ کے نام سمن بھیجا جاتا ہے کہ تاریخ [illegible] ماہ [illegible] آئندہ دوپہر سے پہلے وقت دس بجے کے اس عدالت میں اس غرض سے حاضر ہو کر نالش مذکور کی بابت جو کچھ آپکو معلوم ہے اسکی نسبت شہادت دیں اور بلا اجازت عدالت کے وہاں سے چلے نہ جائیں اور آپکو بذریعہ اسکے تنبیہ کیا جاتا ہے کہ اگر بلاوجہ جائز تاریخ مذکور پر ہونے سے غفلت یا انکار کرینگے تو آپ کی حاضری کے لئے بجبر وارنٹ جاری کیا جاویگا۔

آج بتاریخ 29 [illegible] ماہ [illegible] ہمارے دستخط اور عدالت کی مہر سے جاری کیا گیا

دستخط

صاحب مجسٹریٹ درجہ اول

[illegible] سنٹرل نیل پریس لاہور

لاہور۔ ۷۸۶

یوسف صاحب!

السلام علیکم۔ مجھے بےحد افسوس ہے کہ میرے بار بار خط لکھنے پر بھی آپ نے میری درخواستوں پر کوئی توجہ نہ دی ___ آپ نے یہاں مجھ سے پانچ ہزار روپے کا معاہدہ کیا تھا کہ آپ میری تمام کتابوں کے حقوق کی وہاں نگہداشت کریں گے اور جو کتاب وہاں چھپے گی اس کا معاوضہ وصول کرتے رہیں گے ___ وہاں میری کئی کتابیں شائع ہوئیں ہیں ظاہر ہے کہ آپ نے کافی روپیہ وصول کیا ہوگا۔

اگر آپ میری شرافت سے اور زیادہ فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تو ازراہِ کرم قتیل شفائی صاحب کو معاہدے کی رقم میں سے کم از کم دو ہزار روپے ادا کر دیں ورنہ مجھے کوئی دوسری صورت اختیار کرنی پڑے گی یعنی مجھے خود وہاں آنے کی تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔

یاد رہے کہ میں ابھی تک بقیدِ حیات ہوں اور اپنا حق وصول کرنا جانتا ہوں۔

خاکسار: سعادت حسن منٹو ۳۰، فروری ۱۹۵۴ء

مکرر: میں نے قتیل صاحب کو اپنی طرف سے مکمل اختیارات دیدیئے ہیں وہ جو مناسب سمجھیں گے کریں گے۔

___ سعادت حسن منٹو

○

پیارے شاد! ___ حامل رقعہ کو گانے کا شوق ہے۔ ان کا ٹسٹ لو۔ اگر تمہارے معیار پر پورے اتریں تو ان کو پروگرام ملنے چاہئیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم سے اتنی دیر نہ مل سکا۔ دراصل میں بہت مصروف تھا۔ اس دوران میں دو کتابیں لکھ چکا ہوں۔

غالباً کل ریڈیو سٹیشن آؤں گا۔ سوچا ہے کہ ملازمت کر لوں۔ تمہارا:

___ سعادت حسن منٹو

منٹو نے جو دکھایا بھی ہے، دو طریقے سے۔ ایک تو اس کے اچھے افسانے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ انسانی حقیقت ہمارے لئے کچھ بدل سی گئی ہے۔ دوسری طرف اس کے بُرے افسانے ہیں۔ منٹو کا ڈھنڈورچی ہونے کے باوجود مجھے تسلیم ہے کہ اس نے بعض بہت ہی خراب افسانے لکھے ہیں۔ لیکن اس کے بُرے سے بُرے افسانے میں بھی آپ کو دو ایک فقرے ایسے ضرور ملیں گے جو کسی نہ کسی آدمی یا چیز یا خیال یا احساس کو منوّر کر کے رکھ دیں گے۔ چاہے یہ روشنی ایسی ہو جو آپکو پسند نہ آئے۔

حسن عسکری



منٹو کے نام

احمد ندیم قاسمی

پیارے سعادت!

جب میں نے دوماہی "اردو ادب" کے اجرا کے متعلق سنا، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ ادارے میں آپ اور محمد حسن عسکری شامل ہیں تو متعدد احباب کو میں نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ "آخر اس میں حرج ہی کیا ہے"۔ اور جب احباب نے تفصیل پوچھی تو میں نے کہا:

"اردو کے تمام زندہ افسانہ نگاروں میں منٹو کی فنی اور شخصی انفرادیت نمایاں ترین ہے۔ اس کی شخصیت کا کسی دوسرے پیکر میں مدغم ہونا غیر ممکن ہے اور اس کے فنی نظریات کچھ ایسے کٹیلے اور جاندار ہیں کہ محمد حسن عسکری کی مادہ رائٹ انہیں ہضم کرنے کے لئے ترقی پسندی ہی کا چورن استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے گی"۔

معترضین میں سے چند ایک تو مجھ سے متفق ہو گئے اور باقیوں نے میرے اس اعلان کی تائید کو "اردو ادب" کے پہلے شمارے کی اشاعت تک، ملتوی کر دیا۔ دراصل میں تو آگ اور پانی کے اس اشتراک کو نئے ادب کے لئے نیک فال سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ محمد حسن عسکری، جن کی ذہانت کا میں معترف ہوں اور جن کے تنقیدی اندازِ بیان میں فراق اور عبدالغفار کا سارچاؤ اور نکھار ہے جب آپ کے قریب ہوں گے تو آپ کی خوفناک صاف گوئی اور آپ کے ادبی نظریات کی شدید ہمہ گیری سے متاثر ہو کر اچانک ادیب کی فنی اور سماجی حیثیت کی اکائی کے قائل ہوں گے اور ترقی پسند ادیبوں کو باایں ہمہ سنجیدگی و وضعداری، برا بھلا کہنے ان کا مضحکہ اڑانے اور ان کو کیمونزم کے غیر ادبی پرچارک کی "گالی" دینے سے باز آ جائیں گے۔ میں نے اس یقین کا اعلان کئی ادبی شخصیتوں کے سامنے کیا اور اسی لئے "اردو ادب" کے لئے میں نے ایک نظم بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔

یکم اگست ۱۹۴۸ء کو ہاجرہ بہن کے نام آپ کا ایک خط آیا۔ آپ نے ان سے "اردو ادب" کے لئے ان کی "نگارشات" طلب کی تھیں۔ اس خط پر آپ کے علاوہ محمد حسن عسکری کے دستخط تھے۔ میں نے اس خط کو نہایت شوق سے پڑھنا شروع کیا کیونکہ اس میں "اردو ادب" کی پالیسی کے اعلان کی توقع تھی۔ ہاجرہ بہن سے میں نے شرط بھی بدھی۔ وہ کہتی تھیں کہ محمد حسن عسکری کی فہم کو بین کی تنکر چڑھی گولی کے مترادف ہے اور منٹو ایسا سخت گیر انسان بھی اس کا فریب کھا سکتا ہے۔ مجھے ان سے اتفاق نہ تھا لیکن پہلی ہی سطر پڑھ کر کہ "یہ رسالہ کسی مخصوص مدرسۂ فکر کا پابند نہیں"۔ میں چونکا۔ میں شرط ہار گیا تھا۔ میری بہن کو شرط جیت لینے کی کوئی خوشی نہ تھی بلکہ وہ نہایت اداس ہو کر بولیں:

"یہ تو عسکری صاحب بول رہے ہیں"۔

اور میں نے اپنے غیر متزلزل یقین کے سہارے کہا: "آگے چل کر منٹو بھی کوئی بات کہے گا اور ہمیشہ کی طرح کوئی ایسی بات اور کچھ اس انداز سے کہے گا کہ عسکری کی آواز دب جائے گی"۔

میں خط پڑھتا گیا اور میری آواز مدھم ہوتی گئی اور جب میں خط ختم کر چکا تو مجھے احساس ہوا کہ آج میں ایک بہت بڑی ذہنی شکست سے دوچار ہوا ہوں۔ بحیثیت انسان آپ مجھے ہمیشہ بہت عزیز رہے ہیں لیکن میری نظروں میں بحیثیت ادیب بھی آپکی وقعت کچھ کم نہیں اور شاید آپ پہلے ادیب ہیں جن کی زندگی اور آرٹ میں نہایت خوش گوار تعاون کارفرما ہے۔۔۔۔ میں دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کاش اس خط پر آپ کے دستخط نہ ہوتے۔ کاش آپ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہوتا۔ کاش آپ دستخط کرنا بھول گئے ہوتے۔ کاش آپ کی انفرادیت یوں بے خبری میں کچلی نہ جاتی اور کاش آپ سوچتے کہ آپ نے ہوش میں لانے والا انجکشن دینے کے بجائے ایک نیند آور دوا کے نسخے پر دستخط ثبت کر دیئے ہیں اور منٹو جس کو صدیوں تک زندہ رہنا ہے پیچھے ہٹ گیا ہے اور عسکری (کاش عسکری نے فرانسیسی زبان نہ پڑھی ہوتی) جس کی ذہانت اندھادھند مطالعے کے صحراؤں میں بھٹک چکی ہے۔ اس شان سے ابھرا ہے کہ منٹو کے خدوخال صرف بےنمایاں ہی نہیں بگڑے بگڑے سے بھی ہیں۔

صدمہ اس بات کا نہیں کہ آپ نے جدید ادب کو "ایت" قرار دے کر اسے "غوغائے محض" کے نام سے پکارا ہے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ سالنامہ ادب لطیف ۱۹۴۴ء میں (جسے میں نے ہی مرتب کیا تھا) آپ کا ایک مضمون 'ادبِ جدید' کے عنوان سے چھپا ہے۔ جس میں آپ نے لکھا تھا: "وہ وقت بھی آجائے گا جب اس جدید ادب کا صحیح مطلب واضح ہو جائے گا۔" اور اس جدید ادب کو آپ نے ایک عام مروجہ اصطلاح کی صورت میں استعمال نہیں کیا تھا بلکہ اس کو اپنے آپ میں مجسّم پایا تھا اور لکھا تھا:

"بعض لوگ ادبِ جدید المعروف نئے ادب یعنی ترقی پسند ادب کو سعادت حسن منٹو بھی کہتے ہیں اور جنہیں صنفِ کرخت پسند نہیں وہ اسے عصمت چغتائی کہہ لیتے ہیں"۔

اور اسی مضمون میں آپ نے اعلان کیا تھا کہ آپ اس "ایت" کو ختم نہیں ہونے دیں گے بلکہ آپ نے لوگوں کو مشورہ دیا تھا کہ پہلے اس ماحول، ان حالات کا خاتمہ کیا جائے جنھوں نے آپ کو "ایت" اختیار کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ "وہ لوگ جو ادبِ جدید کا — ترقی پسند ادب کا، فحش ادب کا، جو بھی کچھ یہ ہے، خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں تو صحیح راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کر دیا جائے جو اس ادب کے محرک ہیں"!

مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا آج ان حالات کا حسن عسکری کے زیدی اور بودلیئری اور فلابیری نظریات نے خاتمہ کر دیا ہے؟ کیا بقول آپ کے 'عورتوں اور مردوں کے درمیان جو موٹی دیوار حائل تھی وہ دیوار گر چکی ہے'؟ وہ دیوار جس کے چڑھنے کو عصمت چغتائی نے اپنے تیز ناخنوں سے کریدنے کا "عزم" کیا تھا، کیا کشمیر کے حسین دیہات میں سے شہروں کی "گندگی" غائب ہو چکی ہے جسے ہر طرف منتشر دیکھ کر "غریب کرشن چندر ہولے ہولے رویا کرتا تھا" — کیا "انسانوں کی اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو کی وہ کمزوریاں" دور ہو چکی ہیں جنھیں آپ نے "خورد بین سے دیکھ دیکھ کر باہر نکالنے اور دوسروں کو دکھاتے رہنے" کا تہیہ کیا تھا؟ — اگر سماج کی یہ سب شکایتیں ختم ہو چکی ہیں تو ترقی پسند ادب کو خوشی سے خیرباد کہہ لیجئے۔ لیکن اگر عورت اور مرد

کے درمیان جو موٹی دیوار حائل تھی وہ اور اونچی اور موٹی ہو گئی ہے۔ اور اگر اب ہمارے دیہات میں شہروں کی گندگی کے ڈھیر ولے کے بجائے پہاڑ ابھر آئے ہیں اور ہوا وس تک میں تعفن بس چکا ہے اور اگر انسان اب سراسر کمزوری بن کر رہ گیا ہے تو میرے بھائی یہ "آیت" اسی طرح قائم ہے اور عصمت، کرشن اور منٹو کے فرائض ابھی ختم نہیں ہوئے اور محمد حسن عسکری کی عبارت پر ابھی آپ کے دستخط بھلے معلوم نہیں ہوتے۔

میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ مسلمان کہا ہے۔ میں کمیونسٹ بھی نہیں ہوں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ ممبر بھی نہیں ہوں۔ کشمیر پر ہندوستانی فوجوں کی چڑھائی کو استبدادی اقدام سمجھتا ہوں۔ سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین میں ہر سیاسی خیال کے ادیب کی شمولیت کا ذکر کرتے ہوئے فیض احمد فیض کو اور مجھے لیگی قرار دے چکے ہیں۔ میں اپنے وطن کا وفادار ہوں۔ پاکستان میری رگ و جان ہے مگر میں محمد حسن عسکری کے ادبی نظریات سے متفق نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ جس ادب کو رواج دینا چاہتے ہیں وہ پاکستانی عوام کے ارتقا کا قاتل ہے۔ شاید آپ نے غور نہیں کیا کہ وہ ادب کو ایک ایسے طبقے کی جاگیر بنانے پر تُلے ہوئے ہیں جس کو مارکسی اصطلاح میں بورژوا اور عام طور سے درمیانہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ اس خطرناک مہم کو سر کرنے کے لئے انہوں نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ کچھ ایسا ہے کہ عوام مذہب کا نام پڑھ کر چونک اٹھتے ہیں اور اُن سے اونچا طبقہ مذہب کی اس دہائی کی تہ میں اپنے مفاد کو پھلتا پھولتا دیکھ کر مسکراتا ہے اور محمد حسن عسکری اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ اس طرح قوم کی کوئی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں یا اس گمان میں مگن رہتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے ایک بہت بڑے ادبی مصلح کا تاج اپنے سر پہ جما لیا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ پاکستانیوں کے ذہنوں کو ہمیشہ کے لئے منفعل اور مضمحل رکھنے کی اس سے بڑھ کر اور کوئی سازش نہیں ہو سکتی۔ محمد حسن عسکری کو شکایت ہے کہ ترقی پسند ادیب مسلم قوم کے وجود ہی کے قائل نہیں بلکہ وہ اپنی "نام نہاد" انسان پرستی کے جوش میں ہند و پاکستان کو پھر یکجا کر کے نہرو اور پٹیل کے قدموں میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں عموماً ہندوستان کے ترقی پسندوں کی تحریروں کے حوالے دیتے ہیں۔ شاید اب تک انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان ایک قطعی الگ ادارہ ہے اور ہندوستان کی انجمن سے اس کا صرف اتنا تعلق ہے جتنا مشرق و مغرب کی تمام دوسری ترقی پسند انجمنوں سے اتنا تعلق جتنا محمد حسن عسکری کو یا آپ کو یا مجھے کسی ہندوستانی دوست سے ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے ترقی پسند کشمیر، حیدرآباد، جوناگڑھ وغیرہ کے مسائل کو جس انداز سے پرکھیں ہمیں اس سے غرض نہیں۔ اس لئے کہ یہ ان کے اپنے وطن کے مسائل ہیں اور وہ انہیں اپنے ملک کی مصلحتوں کی روشنی میں سوچتے ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں۔ ہماری مصلحتیں مختلف ہیں۔ ہم ان مسائل کے بارے میں اپنے ملک کی بھلائی اور ترقی کی روشنی میں سوچتے ہیں۔ آپ کو ایک بھی ایسی مثال نہیں ملے گی جب پاکستان کے کسی ترقی پسند ادیب نے اپنی تحریر میں پاکستان سے غداری کا اعلان کیا ہو۔ پھر آپ کے شریکِ کار محمد حسن عسکری بار بار یہ اعلان کرنے پر کیوں مجبور ہیں کہ ترقی پسند ادیب (جنہیں انہوں نے "کپلنگ" کی "بندر لوگ" اصطلاح کے مطابق "ادب لوگ" کے نام سے محض اپنی ذہنی آسودگی کے لئے یاد فرمایا ہے) نوجوانوں اور طالب علموں کو ورغلا کر پاکستان کی جڑیں کھود رہے ہیں۔ دراصل ترقی ادب ایک ہوّا بن کر حسن عسکری کی تمام نقادانہ قوتوں پر سوار ہو چکا ہے ورنہ سعادت بھائی! کیا پاکستان کے عوام کو (جو ننانویں فی صدی مسلمان ہیں) ان کا حق دلانا پاکستان سے غداری کہلاتا ہے؟ کیا فتنہ و فساد کے واقعات پر نفرین بھیج کر آئندہ کے لئے اس غیر انسانی مشغلے کی

رد کہ تمام پاکستان سے غداری ہے؟ کیا جاگیرداری اور سرمایہ داری کے اداروں کی بیخ کنی پاکستان سے غداری ہے؟....
اور کیا یہ غداری نہیں کہ ہندوستانی ترقی پسندوں کا سہارا لے کر پاکستانی ترقی پسندوں کے خلاف زہر اگلا جائے؟ کیا یہ غداری نہیں کہ پاکستانی ادیب کے سامنے آندرے ژید کی سی مثال رکھی جائے اور انہیں بتایا جائے کہ وفاداری ملک سے نہیں حکومت سے وابستہ ہونی چاہئے؟ اور کیا یہ غداری کی انتہا نہیں کہ ہر نئے حملہ آور کو ملک کی حکومت سونپ دینے کے بعد اس کے حق میں قصیدہ خوانی کی ترغیب دی جائے؟

مصیبت یہ ہے کہ محمد حسن عسکری، ترقی پسند ادیبوں میں جن قوتوں کے فقدان کا ماتم کرتے ہیں ان ہی قوتوں کے فنی اظہار پر بوکھلا بھی جاتے ہیں۔ وہ ترقی پسندوں سے پوچھتے ہیں "آپ کے دل میں اپنے عوام کا کتنا درد اور ان کی کتنی عزت ہے" میرے خیال میں اس سوال کا صرف یہ جواب کافی ہے۔" ہماری تحریک کی بنیاد ہی عوام کے درد کو اپنا درد سمجھنے اور ان کے احترام پر مبنی ہے"۔
—— وہ پوچھتے ہیں۔ "ان کے عزائم اور ان کے آدرشوں کی آپ کیا وقعت کرتے ہیں؟" —— جواب یہ ہے کہ "ان کے عزائم اور آدرشوں کا تجزیہ ہی تو ارباب اختیار کو اور آپکو آتش زیر پا کر دیتا ہے" —— ترقی پسند ادیب اپنی قوم سے حسن عسکری کی طرح بے تعلق نہیں۔ وہ پاکستان کے کروڑوں عوام کے سچے بہی خواہ اور مخلص ہمدرد ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا احساس اور اعتراف ہے کہ پاکستان کے تحفظ اور عظمت ہی میں ہمارا تحفظ و عظمت پوشیدہ ہے اور حسن عسکری نے ان کے اسی تصور کی بنا پر ان کی کتابوں کا الاؤ لگانے اور ان کو چومیخہ کر کے چھوڑ دینے کے خواب دیکھے ہیں۔

اور پھر انسانیت پرستی کوئی ایسی لعنت تو نہیں کہ حسن عسکری اپنی "جھلکیوں" اور اپنی "وفاداریوں" میں اس سے بدک بدک اٹھتے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت میں انہیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ مسلمان سے بڑا انسانیت پرست اور کون ہوگا؟ انسانیت پرستی ہمیں یقیناً اپنے وطن سے غداری کرنا نہیں سکھاتی۔ دراصل جب بھی کوئی ادیب طبقاتی تقسیم، جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری کے خاتمے اور انسان پرستی کا ذکر کرتا ہے۔ ایک محمد حسن عسکری ہی ہیں (کہ ان کی تو یہ عادت ہو چکی ہے) ہر وہ انسان جس کا مفاد ان غیر انسانی اداروں سے وابستہ ہے چونک اٹھتا ہے اور اسے سچا مسلمان کہنے کے بجائے "اشتراکی" کی گالی داغ دیتا ہے اور جب حسن عسکری ترقی پسندوں کو روس کے ایجنٹ ثابت کرنے بیٹھتے ہیں تو سجاد ظہیر اور احتشام حسین کے علاوہ فیض، خدیجہ، ہاجرہ، آپ کا اور میرا نام کیوں نہیں لیتے؟

لیکن آپ کا تو انھوں نے گزشتہ دنوں بڑے پیارے انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ "امروز" ۱۵۔ اگست ۱۹۴۸ء میں لکھتے ہیں (آپ نے اسے صرف پڑھا ہی نہیں ہوگا بلکہ سنا بھی ہوگا):

"منٹو کے افسانوں میں پہلے مجھے کوئی گہری دلچسپی نہیں رہی مگر اب جب وقت نے کھرا کھوٹا الگ کرنا شروع کر دیا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں میں منٹو ہی ایک ایسا آدمی تھا جسے براہ راست انسانی دماغ اور اس کی کیفیات سے دلچسپی تھی"۔

کیوں صاحب، آج سے پہلے جب آپ اردو افسانے کی دنیا کو خالی ڈھنڈار سمجھتے تھے ان دنوں بھی تو منٹو کے وہی مجموعے بازاروں میں بکتے تھے جو آج بک رہے ہیں۔ اور ۱۵۔ اگست ۱۹۴۸ء تک وہی بک رہے تھے۔ اس روز تک منٹو کے افسانوں کا

کوئی نیا مجموعہ نہیں آیا تھا لیکن اچانک آپ کو منٹو سے یہ گہری دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی؟ —— حسن عسکری سے کبھی یہ سوال پوچھا ہے آپ نے؟

یقیناً نہیں پوچھا ہوگا۔ اب بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ جواب میں عرض کیے دیتا ہوں۔ تنقید کی چٹان سے اچانک جو منٹو کے فنی کمالات کا فوارہ بلند ہوا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ محمد حسن عسکری کو آپ سے ایک ضروری کام ہے اور وہ ہے ترقی پسندوں کی صفوں میں انتشار۔

وہ اس انتشار کے اس قدر خواہش مند کیوں ہیں؟ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ تقسیمِ ہند سے پہلے انکے سیاسی نظریات کمیونسٹ ادیبوں سے مختلف رہے ہیں اور وہ اب تک ان کا ڈھنڈورا پیٹتے چلے آ رہے ہیں۔ سیاسی نظریات کے اختلاف پر صحت مند بحث و تمحیص نہایت مفید رہتی ہے لیکن ادب کو خالص سیاسی یا ذاتی دشمنیوں کے جنگل میں گھسیٹنے اور رگیدنے کا مقصد؟ . . . . اس طرح محمد حسن عسکری پاکستان سے دشمنی کر رہے ہیں۔ اور پاکستانی ادیبوں کی صفوں کو منتشر کرنے کے مرتکب ہونا چاہتے ہیں۔ وہ "اتحاد اتحاد" ضرور پکارتے ہیں لیکن اتحاد ہی کا نعرہ تو ہٹلر نے بھی بلند کیا تھا۔ اور برطانوی شہنشاہیت نے بھی اور امریکی سرمایہ داروں نے بھی اور روسی جمہوریت نے بھی . . . . قول و عمل کا اتحاد ہی سب سے مؤثر حربہ ہے لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ امروز میں اتحاد کا نعرہ بلند ہو رہا ہے اور ساقی میں وہ وہ "دشنام" دیئے جا رہے ہیں کہ ان میں "نزاکتِ آواز" کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ذرا سوچیے اور ساتھ ہی محسوس بھی کیجئے بھائی۔ آپ تو بے حد حساس ہیں۔

ایک اور بات خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ محمد حسن عسکری نے ترقی پسند ادیبوں کی زبان بندی کے ضمن میں نظام اور دوسرے اخبارات و رسائل کے کافی کالم سیاہ کیے ہیں۔ سول ملٹری گزٹ کے ڈاکٹر حجازی کا انداز بھی یہی رہا ہے لیکن جب ان کی تمنائیں پوری ہوئیں اور نقوش، سویرا اور ادبِ لطیف کو ایک نہ دو پورے چھ مہینوں کے لئے بند کر دیا گیا تو پاکستان ٹائمز میں سب سے پہلے حکومت کے اس طرزِ عمل پر احتجاج کیا وہ محمد حسن عسکری ہی تھے۔ جن نظموں، افسانوں اور مضامین کو پڑھ کر ان کی تنقیدی رگیں پھڑک گئی اور ایک برس تک جھنجھناتی رہیں وہ کیا مست قلندر اور حسن پرست وغیرہ میں چھپتے تھے؟ انہیں نمایاں رسالوں کی زبان بندی ہی کے لئے تو حسن عسکری نے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی اور زبان بندی کے فوراً بعد انہیں رسالوں کی پشت پناہی کے لئے اس زور سے اٹھے۔ یہ بھی ایک مصلحت کا کرشمہ ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس سے حسن عسکری کی رہنمایانہ امنگوں اور ادبی شہنشاہیت کی آرزوؤں کا سراغ ملتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھانا اسی کا نام ہے۔ مبتدی اور معصوم قسم کے ادیبوں کے ذہنوں کو یوں گرفت میں لیا جاتا ہے۔ عقب سے آ کر چھرا گھونپنا اسے کہتے ہیں۔ اور سعادت بھائی اگر "کھول دو" درمیان میں حائل نہ ہوتا تو حسن عسکری حکومت کے اس اقدام کو سراہتے نہ تھکتے۔ مگر مصیبت یہ آن پڑی کہ منٹو بھی ماخوذ تھا اور اسی لئے خود عسکری کا دامن الجھ گیا تھا۔ کوئی پوچھے کہ عسکری صاحب یہ فقرہ آپ نے کس کی خاطر لکھا تھا بلکہ قوم کو ادب اور ادیبوں سے پانچویں کالم کی طرح نمٹنا پڑے گا۔ اب قوم ان سے نمٹی ہے تو آپ نے ان کے تحفظ کا علم کیوں بلند کر لیا؟ خلوت میں بیٹھ کر مسکرائیے اور کسی فاشسٹ فن کار کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کیجئے کہ جو کچھ ہوا خوب ہوا۔

دراصل تقسیم کے بعد ہمارے ہاں اچھے اور نامور فنکاروں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے جو چند ایک ہیں ان میں آپ نمایاں

مقام رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر حسن عسکری کو اچانک آپ کی فنی عظمت کا عرفان والہام ہوا۔ اور انہیں پتہ چلا کہ منٹو تو بہت اچھا افسانہ نگار ہے۔ اور آپ نے جانے یکایک کیسے بھانپ لیا کہ حسن عسکری تو پاکستان کا بہت ہی بڑا نقاد ہے ــــ لطف یہ ہے کہ اس تعریف و توصیف کے عین وسط میں اردو ادب خیمہ زن ہے جس کو آپ دونوں مرتب کر رہے ہیں ــــ منٹو اور عسکری۔ ــــ زندگی اور خوابیدگی ــــ آگ اور پانی!

بُرا نہ مانیے گا بھائی! ــــ آپ حسن عسکری کو راہِ راست پہ لانے نکلے تھے مگر ان کے فنی باغیچے میں مصنوعی پھولوں کی زرک پھڑک دیکھ کر اپنی راہ ہی سے دور ہٹتے جا رہے ہیں۔ میں تو تصور تک نہیں کر سکتا کہ آپ کو بھی کسی دوسری شخصیت میں گھُل مِل کر غائب ہو جانا آتا ہے۔ مجھے حسن عسکری سے کوئی بَیر نہیں۔ میرے دل میں ان کی سنجیدگی اور علمی قابلیت کی عزت ہے۔ چار پانچ برس تک ہمارے درمیان نہایت باقاعدہ خط و کتابت رہی ہے اور اس میں ہم نے ایک دوسرے کو گالیاں نہیں دیں بلکہ علمی و ادبی بحثیں کی ہیں۔ وہ ترقی پسندوں کی نظموں اور افسانوں کے منتخب مجموعے تیار کرنے کے بعد ان سے الگ ہو گئے ہیں تو (بُرا ہو فرانسیسی زبان کا کہ یہ اسی کا کیا دھرا ہے) وہ پھر سے ان کے قریب آ سکتے ہیں اور یہ آپ کا فرض ہے۔ آپ جو ان دونوں ان کے ممدوح اور دوست ہیں۔ آپ ہی ان پر یہ حقیقت واضح کر سکتے ہیں کہ "بھئی اگر آپ کو تقسیم سے پہلے چند ترقی پسندوں سے شکایتیں رہیں تو وہ مٹنا آپ اب تک کیوں چلاتے جا رہے ہیں۔ آپ ہر چیز کے پیچھے لٹھ لے کر کیوں پڑ جاتے ہیں۔ فراق کو آپ نے اردو کا سب سے بڑا شاعر مانا ہے مگر آپ کے "اعتراضات" کا یہی عالم رہا تو عنقریب آپ ہر اس شاعر کے کلام کو "انسانی دماغ اور اس کی کیفیات" کا شاہکار کہنے لگیں گے جو رسالہ "اردو ادب" کے ادارے میں شامل ہو جائے۔ یا جس کی آپ کو دوستی میسر آ جائے"؛ عسکری کو پھر سے اپنے افسانوں کے بجائے اپنے نظریات سے متاثر کر کے اپنی صفوں میں لائیے۔ اور اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اس تحریک سے آپ تو دامن نہ چھڑائیے جسے آپ کے فن اور آپ کے اثبات پر ہمیشہ ناز رہے گا۔ اور پھر بُرا نہ مانیے گا ترقی پسند انجمن نے آپ سے کبھی مجاہدہ تاؤ تو نہیں کیا؟ حسن عسکری اعلانیہ "ادب برائے ادب" کے قائل ہیں۔ مگر ان کے خیال میں:

> "پاکستانی ادیب اب اس مہم کا آغاز کرنے والے ہیں کہ جن اقدار اور تصورات کا نام پاکستان ہے۔ انہیں افسانے اور نظمیں لکھ کر خود سمجھیں، دوسروں کو سمجھنے کا موقع دیں۔ ہم صرف اسی طرح پاکستان کے استحکام میں مدد دے سکتے ہیں۔"

یہی ادب برائے زندگی اور ادب برائے پروپیگنڈا اور ادب برائے انسان ہے۔ اگر حسن عسکری نے یہ الفاظ پورے خلوص سے لکھے ہیں تو وہ سب سے الگ ایک ٹھنٹھ پر بیٹھے کیوں اونگھ رہے ہیں۔ یہی تو ترقی پسندی ہے۔ اسی کے تو آپ علمبردار ہیں۔ اور اب آپ کو ترقی پسندی کے نام تک سے چڑ ہے۔ اردو ادب میں آپ صرف اردو ادب درج کرنا چاہتے ہیں مگر خالص اردو ادب تو انہیں موثرات کا اظہار ہو گا جو حسن عسکری نے اوپر کے الفاظ میں نمایاں کئے ہیں اور اسی کو ترقی پسندی کہا جاتا ہے۔ آخر اس دوغلی پالیسی کا مطلب کیا ہے؟ حسن عسکری صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ پاکستان کے ادبی ڈکٹیٹر بننا چاہتے ہیں (اور یہ سلطانیٔ جمہور کا نغمہ ہے) اور ادب برائے ادب کے نقارے پر تعمیرِ پاکستان یعنی ترقی پسندی کی چوب بہت بھونڈا شور پیدا کرتی ہے۔

سعادت بھائی! میں آپ کو دس برس سے جانتا ہوں۔ آپ کے خلوص کا معترف اور آپ کی صاف دلی کا مداح ہوں۔ مجھے آپ کی

فنی عظمت سے بھی انکار نہیں۔ لیکن بحیثیت ایک ادیب کے آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الفاظ کے الٹ پھیر اور نطق کی بھول بھلیوں میں نہ الجھیے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک آتشیں قلم اور آپ کے ذہن میں ایک شدید جذبہ ہے۔ اس جذبے اور اس قلم کا خوشگوار تعاون آپ کو جبھی میسّر آسکتا ہے جب آپ زندگی کے عکاس اور نباض رہیں (جیسا کہ آپ اب تک ہیں) آپ کی ذات سے پاکستان کو ان گنت توقعات ہیں۔ اس تعمیری دور میں ادب برائے ادب کی افیون سے بچیئے۔ اردو ادب ضرور لکھئے مگر ایک معین نظریے کے ساتھ۔ حسن عسکری سے ضرور تعاون کیجیے مگر ان کے نظریات کو مشرف بہ زندگی کرنے کے بعد ــــــ اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی جن سرگرمیوں سے آپ کو شکایت ہے ان کا اعلانیہ اظہار کیجیے۔ انجمن کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیے۔ ساحل پر بیٹھ کر ملاحوں کے ڈوبنے کا نظارہ کرنے والوں سے کہیئے کہ بعض اوقات طوفانی موجیں ساحل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ہمارے قریب آیئے اور اس ترقی پسندی کو سہارا دیجئے جسے پاکستان کا استحکام چاہیے۔ پاکستانی عوام کی فلاح چاہیئے۔ جمہوریت اور مساوات چاہیئے۔ اور یقین رکھئے کہ آپ فن کی اس بلندی پر ہیں جہاں کسی نقاد کو آپ کے فنی کمالات کا اچانک الہام ہونے لگے تو یوں سمجھئے کہ اسے آپ سے کچھ کام ہے ورنہ میرے بھائی! سورج کو سورج کہہ دینے سے سورج کے انوار میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔

آپ کا بھائی:

ندیم

لاہور ۱۵ ستمبر ۱۹۴۸ء

منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کے بول چال کے جملوں سے ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں بالکل حقیر اور بے حیثیت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے جن میں سنجیدگی اور متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور موثر سے موثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عمومیت کو تصور آفریں، فکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لئے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں آورد نام کو نہیں۔ ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور بے لوث خلوص کی مظہر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر یہی بے تکلفی اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا پرتو ہمیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے ترکشِ فن کے بڑے انگن تیر ہیں۔ ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔



سید وقار عظیم

منٹو کے نام دو خط

جاوید اقبال ۔
عبد السلام خورشید

بھائی سعادت ۔ سلام مسنون!

میں اپنا وعدہ نہیں بھولا۔ انگلستان جانے سے پیشتر ضرور آپ سے مل کر جاؤں گا اور جب تک سعادت حسن منٹو کیمونسٹوں سے الگ ہے، جب تک سعادت حسن منٹو کے دل میں پاکستان کے مسلمانوں کے لئے درد ہے میں اس پر اپنے نظریات کی تبلیغ کرتا رہوں گا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں ایک طویل عرصے کے بعد اپنے وطن کو خیر باد کہہ رہا ہوں لیکن مجھے یہ تسلی ضرور ہے کہ سعادت حسن منٹو، عسکری کی معیت میں ہے اور عسکری اسے غلط رستے پہ چلنے سے ٹوکے گا، عسکری اسے بچا لے گا۔

اب ڈرامے لکھنے پر کچھ طبیعت جمتی نہیں۔ میری تمام تر توجہ اب فقہ اسلامی اور فلسفے پہ ہے اور میرے دشمن ابھی بہت سے پیدا ہونے ہیں کیونکہ میں نے فقہ کے متعلق ابھی تک اپنے نظریات کا اظہار نہیں کیا۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ آپ کا ایمان برقرار رکھے — ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور قلب انسانی نیت کا مسکن۔ یہ نیت یا تو فرد خود جانتا ہے یا خدا۔ دنیوی مسائل خیر و شر سے نیتِ انسانی ماورا ہے۔ خلوص نفسیاتی طور پہ حقارت اور طنز سے شروع ہوتا ہے۔

اللہ آپ کو اس درد سے آشنا کر دے کیونکہ مجھے درد سے شناسائی کی اہلیت آپ میں دکھائی دیتی ہے۔

جاوید اقبال

لاہور - ۱۲ - اگست ۴۹ء

○

بھائی منٹو!

آپ نے مضمون لکھنے کو کہا، اور میں مخمصے میں پڑ گیا کیونکہ آپ جانتے ہیں میں ایک ترقی پسند لکھاری ہوں۔ ادیب کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کر رہا۔ اگرچہ میرے ترقی پسند بھائیوں نے اس لفظ کو ہر لکھاری کے نام سے وابستہ کر دیا ہے لیکن میں اپنے آپ کو "ادیب" کہہ کر لسانی بد دیانتی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ "نقوش" کے پچھلے جشنِ آزادی نمبر میں بھائی احمد ندیم قاسمی نے ڈاکٹر تاثیر کی تصویر کے نیچے لکھا: "جو ادب کے ہر گوشے پر حاوی ہیں"۔ بس یہی ادیب کی تعریف ہے۔ میں افسانہ نگار ہوں نہ شاعر۔ کبھی کبھی ہلکی پھلکی تنقید کر لیتا ہوں لیکن برا ہو اس نالائقی کا کہ شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے سے الفاظ استعمال کرنے کا شعور نہیں۔ مارکسیت اور جدلیات سے بے بہرہ ہوں اس لئے وہ جو "ترقی پسند تنقید" ہوتی ہے میرے بس کا روگ نہیں۔ سیاسی اور صحافتی مقالے

لکھ لیتا ہوں اور میرے ترقی پسند دوست انہیں کبھی کبھی اپنی ترازو میں تول کر کہتے ہیں ترقی پسند تو ہے لیکن بورژوائی بُو ابھی تک آتی ہے۔
ہاں تو میں ایک ترقی پسند لکھاری ہوں۔ آپ جانتے ہیں آجکل رسالوں کی ترقی کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ اس میں ترقی پسندوں کی نگارشات چھپیں۔ اس لئے ہم ترقی پسند لوگ عام طور پر احتیاط برتتے ہیں کہ کسی غیر ترقی پسند یا رجعت پسند رسالے میں مضمون نہ لکھا جائے۔ اس سے ایسے رسالے خواہ مخواہ بازار میں زیادہ بکنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے ہم رجعت پسندوں کا فروغ نہیں چاہتے۔ اندر ہی اندر ہم ترقی پسندوں میں کھچڑی پکتی رہی کہ فلاں فلاں رسالے کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ اس سے وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ بعض پرولتاری ساتھی ذرا تیز تھے۔ انہوں نے اخبارات اور رسائل کے مقاطعہ کا تخلیقی پس منظر جو دیکھا تو علامہ مشرقی کی ایک حرکت دیکھ کر پھڑک اٹھے۔ علامہ مشرقی کی پتنگ کسی زمانے میں خوب چڑھی ہوئی تھی اس نے ایک اخبار کے بائیکاٹ کا حکم جاری کیا، خاکساروں سے کہا اس میں کوئی خبر اشاعت کے لئے نہ بھیجو۔ اور ہر شخص سے کہو کہ وہ اس اخبار کو کبھی نہ پڑھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بائیکاٹ کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن پرولتاری ساتھیوں نے کہا۔ ہم اس نسخے کو ضرور آزمائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین مغربی پنجاب کی مجلس عاملہ نے پچھلے دنوں ایک قرارداد منظور کر دی جس کے آخر میں لکھا تھا:

"اس کے ساتھ ہی ہم ترقی پسند ادیبوں اور صحافیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ سرکاری رسائل اور ان پرچوں کے ساتھ تعاون کر کے عوام کو غلط فہمی کا موقع نہ دیں جو اپنے اداریوں میں تحریک کی مخالفت کرتے ہیں اور انتشار پھیلاتے ہیں"۔

مجھے یاد نہیں کہ آپ نے اپنے کسی اداریے میں تحریک کی مخالفت کی یا نہیں لیکن اس کے باوجود "اردو ادب" میں مضمون لکھنے سے میں گھبراتا تھا کہ اسی قرارداد میں ترقی پسند ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ رجعت پسند رجحانات کے علمبردار ادیبوں کے خلاف سخت جدوجہد کریں اور انہیں مکمل طور پر بے نقاب کریں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"آج پاکستان میں ان رجعت پسند اور عوام دشمن ادیبوں کی پوزیشن یہ ہے کہ ایک طرف تو ادبی لیڈروں کا وہ سرغنہ ہے جو انجمن کی مخالفت میں تنظیمی طور پر ایڑی چوٹی کا پسینہ صرف کئے دے رہا ہے (ادبی قیادت کا محاورہ ملاحظہ ہو) اس سرغنے میں عزیز احمد، حسن عسکری، ڈاکٹر تاثیر، ممتاز شیریں اور اس کے شوہر ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اونچی ملازمتوں سے فیض یاب ہو کر اس سرغنے کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اس گروہ میں احمد علی اور اختر حسین رائے پوری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ تیسرا گروہ ان ادیبوں کا ہے جو اپنی رجعت پسندی میں گھٹنوں دھنسے رہنے کے باعث ترقی پسند ادب سے نفرت کرتے ہیں اور چونکہ وہ خلا میں نہیں رہ سکتا اس لئے ادبی لیڈروں کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ اس گروہ میں سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی (کچھ نام جو اصل کاغذ پر کاٹ دیئے گئے ان میں قرۃ العین حیدر اور اس خاکسار کے اسماء شامل تھے۔ قرۃ العین حیدر کا نام اس لئے کٹا کہ "نقوش" کے تازہ پرچے میں غلطی سے ان کی تصویر چھپ چکی ہے اور خاکسار کا نام اس وجہ سے کاٹا گیا کہ مجلس عاملہ کے کچھ ممبروں نے اصرار کیا) وغیرہ شامل ہیں"۔

منٹو صاحب!

اب آپ ہی فرمائیے میں "اردو ادب" کے لئے کیسے کوئی مضمون لکھوں؟ آپ کے ایک ایڈیٹر میرے ترقی پسند ساتھیوں کے

نزدیک ادبی لیٹرے ہیں اور آپ ادبی لیٹروں سے تعاون کر رہے ہیں۔ اگر میں نے آپ کے لئے مضمون لکھ دیا تو انجمن سے نکالا جاؤں گا۔ خدارا میری حالت پر رحم کیجئے۔ میں لیٹروں کا ساتھی بننے سے بال بال بچا اور اب آپ مجھے گمراہ کر رہے ہیں۔

میں آپ سے "ترقی پسندی" کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ آپ اپنے موجودہ مشاغل سے باز آ جایئے اور اچھی چیزیں مت لکھئے۔ آپ کے اچھے افسانوں اور مقالوں سے میرے ساتھیوں کی چودھراہٹ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ انہیں چودھری بنا رہنے دیجئے۔ آپ کا کیا حرج ہے اور اگر آپ موجودہ حرکتیں جاری رکھیں گے تو یاد رکھئے ہماری قرارداد میں یہ بھی لکھا ہے:

"ہم ترقی پسند رسائل اور ان کے مدیروں سے خاص طور پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان رجعت پسند اور حکمرانوں کے نفاپچی ادیبوں اور ان کے حالی موالیوں کی گمراہ کن تحریروں کو اپنے صفحات میں جگہ نہ دیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ "نقوش" اور "سویرا" میں ادبی پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت آپ کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے گا۔ پھر آپ کو کون پوچھے گا؟ اس عبرت ناک انجام پر اچھی طرح سوچ بچار کر لیجئے۔

ممکن ہے آپ کے دل میں سوال اٹھے کہ اگر میں لیٹروں کا ساتھی ہوں تو انجمن ترقی پسند مصنفین مغربی پنجاب نے پہلے یوم اقبال کی صدارت مجھے کیوں سونپی؟ صاحب! ہم نے جھک ماری۔ برا کیا کہ آپ کو بلا لیا۔ اور کیا کہتے ہیں؟ آپ سوچیں گے کہ مجھے تو ترقی پسند نقاد بانس پر چڑھائے پھرتے تھے۔ لیکن ہم ایسی باتیں سننے کو تیار نہیں۔ جو شخص ادبی تخلیق کے بہتر نمونے پیش کر کے اپنے پرانے ساتھیوں کو احساسِ کمتری دلاتا ہے وہ فاشی ہے، رجعت پسند ہے، لیٹرا ہے۔ ہم آپ کی ایک بات بھی سننے کو تیار نہیں —— آپکو غصہ آ گیا؟ —— یہ سب کچھ حکمران طاقت کے اشارے پر کیا جا رہا ہے۔ یہ عوام دشمنی ہے۔ یاد رکھئے آج عوام دوستی اسی کا نام ہے کہ ترقی پسند مصنفین کے دائرے کو محدود کیا جائے۔ صرف وہی لوگ لئے جائیں جو پارٹی لائین پر چلنے کو تیار ہوں۔ آپ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تو آپ کبھی ترقی پسند نہیں بن سکتے! —— بھائی منٹو! دیکھا آپ نے میرے ساتھیوں کا غصہ ان اصول پسند لوگوں کے حلقے سے الگ ہو کر میں کہاں جاؤں؟ میں کیسے آپ کے لئے مضمون لکھوں؟

لیجئے۔ اب اجازت چاہتا ہوں اور جاتے جاتے یہ مشورہ دیئے جاتا ہوں کہ "آمریت" کو ہمیشہ "عامریت" لکھا کیجئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین مغربی پنجاب کی قرارداد میں یونہی لکھا ہے اس لئے "آمریت" لکھنا رجعت پسندی ہے۔

عبدالسلام خورشید

لاہور۔ ۲۰۔ اگست ۴۹ء

منٹو مر گیا۔ چلو ایک فحش نگار سے دنیا کو نجات مل گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستانیوں کو ہو کیا گیا ہے۔ ایک فحش نگار مرا ہے تو جلسے ہو رہے ہیں۔ قراردادیں پاس ہو رہی ہیں۔ مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ رسالوں کے نمبر نکل رہے ہیں۔ آخر یہ کس خوشی میں ——

مولانا عبدالماجد دریابادی



تماشا

دو تین روز سے طیارے سیاہ عقابوں کی طرح پر پھیلائے خاموش فضا میں منڈلا رہے تھے جیسے وہ کسی شکار کی جستجو میں ہوں۔ سرخ آندھیاں وقتاً فوقتاً کسی آنے والے خونی حادثہ کا پیغام لا رہی تھیں۔ سنسان بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت ایک عجیب ہیبت ناک سماں پیش کر رہی تھی۔ وہ بازار جو صبح سے کچھ عرصہ پہلے لوگوں کے اژدحام سے پُر ہوا کرتے تھے اب کسی نہ معلوم خوف کی وجہ سے سُونے پڑے تھے ـــــ شہر کی فضا پر ایک پُر اسرار خاموشی مسلط تھی۔ بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔

خالد گھر کی خاموش و پُر سکون فضا سے سہما ہوا اپنے والد کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"ابا۔ آپ مجھے سکول کیوں نہیں جانے دیتے"۔

"بیٹا۔ آج سکول میں چھٹی ہے"۔

"ماسٹر صاحب نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں۔ وہ تو کل کہہ رہے تھے کہ جو لڑکا آج سکول کا کام ختم کر کے اپنی کاپی نہ دکھائے گا اسے سخت سزا دی جائے گی"۔

"وہ اطلاع دینی بھول گئے ہوں گے"۔

"آپ کے دفتر میں بھی چھٹی ہو گی"۔

"ہاں ـ دفتر بھی آج بند ہے"۔

"چلو اچھا ہوا ـــــ آج میں آپ سے کوئی اچھی سی کہانی سنوں گا"۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تین چار طیارے چیختے ہوئے ان کے سر پر سے گزر گئے۔ خالد ان کو دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا۔ وہ تین چار روز سے ان طیاروں کی پرواز کو بغور دیکھ رہا تھا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ جہاز سارا دن دھوپ میں کیوں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ ان کی روزانہ نقل و حرکت سے تنگ آ کر بولا:

"ابا۔ مجھے ان جہازوں سے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔ آپ اُن کے چلانے والوں سے کہہ دیں کہ وہ ہمارے گھر پر سے نہ گزرا کریں"۔

"خوف ـــــ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے خالد"۔

"ابا۔ یہ جہاز بہت خوف ناک ہیں۔ آپ نہیں جانتے، یہ کسی نہ کسی روز ہمارے گھر پر گولہ پھینک دیں گے.... کل صبح ماما امی جان سے کہہ رہی تھی کہ ان جہاز والوں کے پاس بہت سے گولے ہیں۔ اگر انہوں نے اس قسم کی کوئی شرارت کی تو یاد رکھیں میرے پاس بھی ایک بندوق ہے ـــــ وہی جو آپ نے پچھلی عید پر مجھے دی تھی"۔

خالد کا باپ اپنے لڑکے کی غیر معمولی جسارت پر ہنسا: "ماما تو پاگل ہے۔ میں اس سے دریافت کروں گا کہ وہ گھر میں ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہے۔ اطمینان رکھو، وہ ایسی بات ہرگز نہیں کریں گے"۔

اپنے والد سے رخصت ہو کر خالد اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہوائی بندوق نکال کر نشانہ لگانے کی مشق کرنے لگا تاکہ اس روز جب ہوائی جہاز والے گولے پھینکیں تو اس کا نشانہ خطا نہ جائے اور وہ پوری طرح انتقام لے سکے ـــــ کاش! انتقام کا یہ ننھا جذبہ ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔

اسی عرصے میں جبکہ ایک ننھا بچہ اپنے انتقام لینے کی فکر میں ڈوبا ہوا طرح طرح کے منصوبے بنا رہا تھا گھر کے دوسرے حصے میں خالد کا باپ اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا ماما کو ہدایت کر رہا تھا کہ وہ آئندہ گھر میں اس قسم کی کوئی بات نہ کرے جس سے خالد کو دہشت ہو۔

ماما اور بیوی کو اسی قسم کی مزید ہدایات دیکر وہ ابھی بڑے دروازے سے باہر جا رہا تھا کہ خادم ایک دہشت ناک خبر لایا کہ شہر کے لوگ بادشاہ کے منع کرنے پر بھی شام کے قریب ایک عام جلسہ کرنے والے ہیں اور یہ توقع کی جا رہی ہے کہ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش آ کر رہے گا۔

خالد کا باپ یہ خبر سن کر بہت خوفزدہ ہوا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ فضا کا غیر معمولی سکون، طیاروں کی پرواز، بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت، لوگوں کے چہروں پر اداسی کا عالم اور خونی آندھیوں کی آمد کسی خوف ناک حادثے کا پیش خیمہ تھے۔

وہ حادثہ کس نوعیت کا ہوگا؟ ـــــ یہ خالد کے باپ کی طرح کسی کو بھی معلوم نہ تھا مگر پھر بھی سارا شہر کسی نہ معلوم خوف میں لپٹا ہوا تھا۔

باہر جانے کے خیال کو ملتوی کر کے خالد کا باپ ابھی کپڑے تبدیل کرنے بھی نہ پایا تھا کہ طیاروں کا شور بلند ہوا۔ وہ سہم گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے سینکڑوں انسان ہم آہنگ آواز میں درد کی شدت سے کراہ رہے ہیں۔

خالد طیاروں کا شور و غل سن کر اپنی ہوائی بندوق سنبھالتا ہوا کمرے سے باہر دوڑا آیا اور انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ تاکہ وہ جس وقت گولے پھینکنے لگیں تو وہ اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے انہیں نیچے گرا دے ـــــ اس وقت چھ سال کے بچے کے چہرے پر آہنی ارادہ و استقلال کے آثار نمایاں تھے جو کم حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں تھامے ایک جری سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج اس چیز کو جو اسے عرصے سے خوفزدہ کر رہی تھی مٹانے پر تلا ہوا ہے۔

خالد کے دیکھتے دیکھتے ایک جہاز سے کچھ چیز گری جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے مشابہ تھی۔ گرتے ہی یہ ٹکڑے ہوا میں پتنگوں کی طرح اڑنے لگے۔ ان میں سے چند خالد کے مکان کی بالائی چھت پر بھی گرے۔

خالد بھاگا ہوا اوپر گیا اور وہ کاغذ اٹھا لایا۔

"اباجی —— ماما سچ سچ جھوٹ بک رہی تھی۔ جہاز نے تو گولوں کی بجائے یہ کاغذ پھینکے ہیں۔"
خالد کے باپ نے وہ کاغذ لے کر پڑھنا شروع کیا تو رنگ زرد ہو گیا —— ہونے والے حادثے کی تصویر اب اسے عیاں طور پر نظر آنے لگی۔ اس اشتہار میں صاف لکھا تھا کہ بادشاہ کسی جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر اس کی مرضی کے خلاف کوئی جلسہ کیا گیا تو نتائج کی ذمہ دار خود رعایا ہوگی۔
اپنے والد کو اشتہار پڑھنے کے بعد اسقدر حیران و پریشان دیکھ کر خالد نے گھبراتے ہوئے کہا: "اس کاغذ میں یہ تو نہیں لکھا کہ وہ ہمارے گھر پہ گولے پھینکیں گے۔"
"خالد۔ اس وقت تم جاؤ —— جاؤ اپنی بندوق کے ساتھ کھیلو۔"
"مگر اس پر لکھا کیا ہے۔"
"لکھا ہے کہ آج شام کو ایک تماشہ ہوگا۔" خالد کے باپ نے گفتگو کو مزید طول دینے کے خوف سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔
"تماشا ہوگا —— پھر تو ہم بھی چلیں گے ناں۔"
"کیا کہا۔"
"کیا اس تماشے میں آپ مجھے نہ لے چلیں گے!"
"لے چلیں گے —— اب جاؤ جا کر کھیلو۔"
"کہاں کھیلوں —— بازار میں آپ جانے نہیں دیتے۔ ماما مجھ سے کھیلتی نہیں۔ میرا ہم جماعت طفیل بھی تو آج کل یہاں نہیں آتا۔ اب میں کھیلوں تو کس سے کھیلوں —— شام کے وقت تماشا دیکھنے تو ضرور چلیں گے ناں۔"
کسی جواب کا انتظار کئے بغیر خالد کمرے سے باہر چلا گیا اور مختلف کمروں میں آوارہ پھرتا ہوا اپنے والد کی نشست گاہ میں پہنچا جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھ کر وہ بازار کی طرف جھانکنے لگا۔
کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں مگر آمد و رفت جاری ہے —— لوگ جلسے میں شریک ہونے کے لئے جا رہے تھے۔ وہ سخت حیران تھا کہ دو تین روز سے دکانیں کیوں بند رہتی ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے اس نے اپنے ننھے دماغ پر بہتیرا زور دیا مگر کوئی نتیجہ نہ برآمد کر سکا۔
بہت غور و فکر کے بعد اس نے سوچا کہ لوگوں نے اس تماشا کو دیکھنے کی خاطر، جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے دکانیں بند کر رکھی ہیں۔ اب اس نے خیال کیا کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہوگا جس کے لئے تمام بازار بند ہیں۔ اس خیال نے خالد کو سخت بے چین کر دیا۔ اور وہ اس وقت کا نہایت بے قراری سے انتظار کرنے لگا جب اس کا ابا اسے تماشا دکھلانے کو لے چلے۔
وقت گزرتا گیا۔
وہ خونی گھڑی قریب تر آتی گئی۔
سہ پہر کا وقت تھا۔ خالد، اس کا باپ اور والدہ صحن میں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے تک رہے

تھے ـــــ ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔
تڑ تڑ تڑ تڑ ...."

یہ آواز سنتے ہی خالد کے باپ کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا۔ زبان سے بمشکل اس قدر کہہ سکا: "گولی"۔ خالد کی ماں فرطِ خوف سے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔ گولی کا نام سنتے ہی اسے ایسا معلوم ہوا جیسے خود اس کی چھاتی سے گولی اتر رہی ہے۔

خالد بھی آواز کو سنتے ہی اپنے والد کی انگلی پکڑ کر کہنے لگا:

"ابا جی۔ چلو چلیں۔ تماشا تو شروع ہو گیا ہے"۔

"کونسا تماشا!" خالد کے باپ نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"وہی تماشا جس کے اشتہار صبح بانٹ رہے تھے ـــــ کھیل شروع ہو گیا ہے تبھی تو اتنے پٹاخوں کی آواز سنائی دے رہی ہے"۔

"ابھی بہت وقت باقی ہے تم شور مت کرو۔ خدا کے لئے اب جاؤ ماما کے پاس جا کر کھیلو"۔

خالد یہ سنتے ہی باورچی خانے کی طرف گیا مگر وہاں ماما کو نہ پا کر اپنے والد کی نشست گاہ میں چلا گیا اور کھڑکی سے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔

بازار آمد و رفت بند ہو جانے کی وجہ سے سائیں سائیں کر رہا تھا ـــــ دور فاصلے سے کتوں کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحات کے بعد ان چیخوں میں انسانوں کی دردناک آواز بھی شامل ہو گئی۔

خالد کسی کو کراہتے سن کر بہت حیران ہوا۔ ابھی وہ اس آواز کی جستجو کے لئے کوشش ہی کر رہا تھا کہ چوک میں اسے ایک لڑکا دکھائی دیا جو چیختا چلاتا بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

خالد کے گھر کے عین مقابل وہ لڑکا لڑکھڑا کر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا ـــــ اس کی پنڈلی پر ایک گہرا زخم تھا جس سے فوارہ خون نکل رہا تھا۔

یہ سماں دیکھ کر خالد بہت خوفزدہ ہوا۔ بھاگ کر اپنے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"ابا ابا۔ بازار میں ایک لڑکا گرا پڑا ہے ـــــ اس کی ٹانگ سے بہت خون نکل رہا ہے"۔

یہ سنتے ہی خالد کا باپ کھڑکی کی طرف گیا۔ اور دیکھا کہ واقعی ایک نوجوان لڑکا بازار میں اوندھے منہ پڑا ہے۔ بادشاہ کے خوف سے اسے جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس لڑکے کو سڑک پر سے اٹھا کر سامنے والی دکان کے پٹڑے پر لٹا دے۔

بے ساز و برگ افراد کو اٹھانے کے لئے حکومت کے اربابِ حل و عقد نے آہنی گاڑیاں مہیا کر رکھی تھیں مگر اس معصوم بچے کی نعش جوانی کی تیغ ستم کا شکار تھی۔ وہ ننھا پودا جو انہی کے ہاتھوں مسلا گیا تھا۔ وہ کونپل جو کھلنے سے پہلے انہی کی عطا کردہ بادِ سموم سے جھلس گئی تھی۔ کسی کے دل کی راحت جو انہی کے جور و استبداد نے چھین لی تھی۔ اب انہی کی تیار کردہ سڑک پر ـــــ آہ! موت بھیانک ہے مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور بھیانک ہے!

"ابا۔ اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے"۔

خالد کا باپ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب خالد اکیلا کمرے میں رہ گیا تو سوچنے لگا کہ اس لڑکے کو اتنے بڑے زخم سے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی جبکہ ایک دفعہ اسے قلمتراش کی نوک چبھنے سے تمام رات نیند نہ آئی تھی اور اس کا باپ اور ماں تمام رات اس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے اس خیال کے آتے ہی اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ زخم خود اس کی پنڈلی میں ہے اور اس میں شدت کا درد ہے —— یک لخت وہ رونے لگ گیا۔

اس کے رونے کی آواز سن کر اس کی والدہ دوڑی آئی اور اسے گود میں لے کر پوچھنے لگی: "میرے بچے۔ رو کیوں رہا ہو"۔

"امی۔ اس لڑکے کو کسی نے مارا ہے"۔

"شرارت کی ہوگی اس نے"۔

خالد کی والدہ اپنے خاوند کی زبانی زخمی لڑکے کی داستان سن چکی تھی۔

"مگر سکول میں تو شرارت کرنے پر چھڑی سے سزا دیتے ہیں لہو تو نہیں نکالتے"۔ خالد نے روتے ہوئے کہا۔

"چھڑی زور سے لگ گئی ہوگی"۔

"تو پھر کیا اس لڑکے کا والد سکول میں جا کر اس استاد پر خفا نہ ہوگا جس نے اس کے لڑکے کو اس قدر مارا ہے۔ ایک روز جب ماسٹر صاحب نے میرے کان کھینچ کر سرخ کر دیئے تھے تو ابا جی نے ہیڈ ماسٹر کے پاس جا کر شکایت کی تھی نا:

"اس لڑکے کا ماسٹر بہت بڑا آدمی ہے"۔

"اللہ میاں سے بھی بڑا"۔

"نہیں۔ ان سے چھوٹا ہے"۔

"تو پھر وہ اللہ میاں کے پاس شکایت کرے گا"۔

"خالد۔ اب دیر ہوگئی ہے چلو سوئیں"۔

"اللہ میاں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تو اس ماسٹر کو جس نے اس لڑکے کو پیٹا ہے اچھی طرح سزا دے اور اس چھڑی کو چھین لے جس کے استعمال سے خون نکل آتا ہے —— میں نے پہاڑے یاد نہیں کئے اس لئے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہی چھڑی میرے استاد کے ہاتھ نہ آجائے —— اگر تم نے میری باتیں نہ مانیں تو پھر میں بھی تم سے نہ بولوں گا"۔

سوتے وقت خالد دل میں دعا مانگ رہا تھا۔

منٹو کو ہر ایک نے کیش کیا۔ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بھی کر میں نے "پھندنے" سے کہانی لکھنا سیکھا اور یوں انہیں کیش کیا۔

انور سجاد



بلاؤز

کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کرسکتا۔

بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم چونک پڑتا۔ دھندلے دھندلے خیالات جو عام حالتوں میں بے آواز بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر مٹ جایا کرتے ہیں۔ مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے اور شور ہی کے ساتھ پھٹتے۔ اس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پردوں پر ہر وقت جیسے خاردار پاؤں والی چیونٹیاں سی رینگتی رہتی تھیں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ اس کے اعضاء میں پیدا ہو گیا تھا۔ جس کے باعث اسے بہت تکلیف ہوتی تھی اس تکلیف کی شدت جب بڑھ جاتی تو اس کے جی میں آتا کہ اپنے آپ کو ایک بڑے سے ہاون میں ڈال دے اور کسی سے کہے مجھے کوٹنا شروع کردیں۔

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکیوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔ پیروں کے ذریعے سے یہ لرزش اس کی تنی ہوئی پنڈلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جاتی، جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دیئے کی لو کی طرح کانپنا شروع کر دیتا۔

مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی شاید سولھواں بھی لگا ہو۔ اسے اپنی عمر کے متعلق صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند اور تندرست لڑکا تھا۔ جس کا لڑکپن تیزی سے جوانی کے میدان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی دوڑ نے جس سے مومن بالکل غافل تھا اس کے لہو کے ہر قطرے میں سنسنی پیدا کر دی۔ وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔

اس کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گردن جو پہلے پتلی تھی۔ اب موٹی ہو گئی تھی۔ بانہوں کے پٹھوں میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تہ موٹی ہو گئی تھی اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سی پڑ گئی تھیں۔ جگہ ابھر آئی تھی جیسے کسی نے ایک ایک بنٹا اندر داخل کر دیا ہے۔ ان

ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت درد محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں غیر ارادی طور پر جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھو جاتا تو وہ تڑپ اٹھتا۔ قمیض کے موٹے اور کھردرے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی

غسل خانے میں نہاتے وقت یا باورچی خانہ میں جب کوئی اور موجود نہ ہوتا۔ مومن اپنے قمیض کے بٹن کھول کر ان گولیوں کو غور سے دیکھتا۔ ہاتھوں سے مسلتا۔ درد ہوتا۔ ٹیسیں اٹھتیں جیسے جسم پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ کی طرح زور سے ہلایا گیا ہو۔ کانپ کانپ جاتا، مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا۔ کبھی کبھی زیادہ دبانے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے ایک لیسدار لعاب نکل آتا۔ اس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا۔ وہ یہ سمجھتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے نہ کر سکتا ہو۔ اس کے خیال کے مطابق گناہ تھا۔ چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا تو وہ جھٹ سے اپنی قمیص کے بٹن بند کر لیتا اور دل میں عہد کرتا کہ آئندہ ایسی فضول حرکت کبھی نہیں کرے گا لیکن اس عہد کے باوجود دوسرے یا تیسرے روز تخلیئے میں وہ پھر اس کھیل میں مشغول ہو جاتا۔

مومن سے سب گھر والے خوش تھے بڑا محنتی لڑکا تھا جب ہر کام وقت پر کر دیتا تو کسی کو شکایت کا موقع کیسے ملتا۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں اُسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کر لیا تھا۔ چھ روپے مہینے پر نوکر ہوا تھا۔ مگر دوسرے مہینے ہی اس کی تنخواہ میں دو روپے بڑھا دیئے گئے تھے۔ وہ اس گھر میں بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ اس کی یہاں قدر کی جاتی تھی مگر اب کچھ دنوں سے وہ بے قرار تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا دن بے مطلب بازاروں میں گھومتا پھرے یا کسی سنسان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔

اب کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس بے دلی کے ہوتے ہوئے بھی وہ کاہلی نہیں برتتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے اندرونی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی سو وہ دن بھر باجہ بجانے، نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہ کی تھی۔ شکیلہ البتہ مومن سے ادھر اُدھر کے کام لیتی تھی اور کبھی کبھی اسے ڈانٹتی بھی تھی مگر اب دنوں سے وہ بھی چند بلاؤزوں کے نمونے اتارنے میں بے طرح مشغول تھی یہ بلاؤز اس کی ایک سہیلی کے تھے جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بے حد شوق تھا۔ شکیلہ اس سے آٹھ بلاؤز مانگ کر لائی تھی اور کاغذوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی چنانچہ اس نے بھی کچھ دنوں سے مومن کی طرف دھیان نہیں دیا تھا

ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دو نوکر تھے یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی جو زیادہ تر باورچی خانے کا کام کرتی تھی۔ مومن کبھی کبھی اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے ممکن ہے

مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو مگر اس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ انقلاب جس میں مومن کا دل و دماغ اور جسم گزر رہا تھا۔ اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لیے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی اور پھر مومن نوکر تھا...... نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔

مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مڑتا زندگی کے ایک ایسے راستے پر آنکلا تھا جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا مگر بے حد پر خطر تھا۔ اس راستے پر اس کے قدم کبھی تیز تیز اٹھتے تھے۔ کبھی ہولے ہولے۔ وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہیئے۔ انہیں جلدی طے کرنا چاہیئے یا کچھ وقت لے کر آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کی چیزوں کا سہارا لے کر طے کرنا چاہیئے۔ مومن کے ننگے پاؤں کے نیچے آنے والے شباب کی گول گول چکنی بٹیاں پھسل رہی تھیں وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا اسی لیے بے حد مضطرب تھا۔ اس اضطراب کے باعث کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر وہ غیر ارادی طور پر کسی کھونٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا اور اس کے ساتھ لٹک جاتا۔ پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے پکڑ کر اسے کوئی اتنا کھینچے، اتنا کھینچے کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اس کے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوئی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

غیر شعوری طور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو...... کیا ہو؟...... بس کچھ ہو۔ میز پر قرینے سے چنی ہوئی پلیٹیں ایک دم اچھلنا شروع کر دیں۔ کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی ابال سے اوپر کو اڑ جائے۔ نل کی جستی نالی پر دباؤ ڈالے تو وہ دُہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ سا پھوٹ نکلے اسے ایک ایسی زبردست انگڑائی آئے اس کے سارے جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں۔ اور اس میں ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے۔

- .... کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔

مومن بہت بے قرار تھا۔

رضیہ نئی طرز سیکھنے میں مشغول تھی اور شکیلہ کاغذوں پر بلاؤزوں کے نمونے اتار رہی تھی۔ جب اس نے کام ختم کر لیا تو وہ نمونہ جو ان سب میں اچھا تھا سامنے رکھ کر اپنے لیے اودی ساٹن کا بلاؤز بنانا شروع کر دیا۔ اب رضیہ کو بھی اپنا باجا اور فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پرونے بیٹھتی تو اس کی نشست بڑی پُر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح وہ افراتفری پسند نہیں کرتی تھی ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیمائش بھی اس کی بہت صحیح تھی۔ اس لیے کہ پہلے کاغذ کاٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی۔ یوں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے مگر چیز بالکل فِٹ تیار ہوتی تھی۔

شکیلہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی۔ ہاتھ بہت گدگدے تھے۔ گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک ایک ننھا گڑھا تھا جب مشین چلاتی تھی تو یہ ننھے ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی غائب

بھی ہو جاتے تھے۔

تنکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی دو یا تین انگلیاں بڑی صفائی کے ساتھ مشین کی ہتھی گھماتی تھیں۔ کلائی میں ایک ہلکا سا خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا اس طرف جھک جاتی تھی اور بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لیے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی۔ نیچے پھسل آتی تھی۔ تنکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک رہتی کہ اسے ہٹانے یا جھٹکنے کی کوشش ہی نہیں کرتی تھی۔

جب شکیلہ اودی ساٹن سامنے پھیلا کر اپنے ماپ کا بلاؤز تراشنے لگی تو اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیوں کہ ان کا اپنا ٹیپ گھس گھسا کر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لوہے کا گز موجود تھا مگر اس سے کمر اور سینے کی پیمائش کیسے ہو سکتی ہے اس کے اپنے کئی بلاؤز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی تھی۔ اس لیے ساری پیمائش دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔

قمیص اتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا۔" جاؤ مومن دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہے"۔

مومن کی نگاہیں شکیلہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں۔ وہ کئی بار شکیلہ بی بی کو ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا۔ مگر آج اسے ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور گھبراہٹ میں کہا "کیسا گز بی بی جی"۔

شکیلہ نے جواب دیا" کپڑے کا گز ۔۔۔۔۔ ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ یہ لوہے کا ہے۔ ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے، کپڑے کا ۔۔۔ جاؤ چھ نمبر میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہے ۔"

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لے کر آ گیا۔ شکیلہ نے یہ گز اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا" یہیں ٹھہر جاؤ۔ اسے ابھی واپس لے جانا" پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی" ان لوگوں کی کوئی چیز۔ پاس رکھ لی جائے تو وہ بڑھیا تقاضا کر کر کے پریشان کر دیتی ہے ۔۔۔۔۔ ادھر آؤ یہ گز لو اور یہاں سے میرا ماپ لو۔"

رضیہ نے شکیلہ کی کمر اور سینے کا ماپ لینا شروع کیا تو ان کے درمیان کئی باتیں ہوئیں۔ مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔

"رضیہ تم گز کو کھینچ کر ماپ کیوں نہیں لیتیں ۔۔۔۔۔ پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا۔ تم نے ماپ لیا اور میرے بلاؤز کا ستیاناس ہو گیا۔ اوپر کے حصے پر اگر کپڑا فٹ نہ آئے تو ادھر ادھر بغلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔"

"کہاں کا لوں، کہاں کا نہ لوں، تم عجب مخمصے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کا ماپ لینا شروع کیا تھا تو تم نے کہا ذرا اور نیچے کا لو ۔۔۔۔۔ ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا۔ تو کون سی آفت آ جائے گی"۔

"بھئی واہ"...... جینز کے فٹ ہونے ہی میں تو ساری خوبصورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو کیسے فٹ کپڑے پہنتی ہے مجال ہے کہیں شکن پڑے، کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے...... لو اب تم ماپ لو......

یہ کہہ کر شکیلہ نے سانس کے ذریعے سے اپنا سینہ پھلانا شروع کیا۔ جب اچھی طرح پھول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "لو اب جلدی کرو۔"

جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا۔ اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں اس نے گھبرا کر کہا: "گز لائیے بی بی جی...... دے آؤں۔"

شکیلہ نے اسے جھڑک دیا۔ "ذرا ٹھہر جاؤ۔"

یہ کہتے ہوئے کپڑے کا گز اس کے ننگے بازو سے لپٹ گیا۔ جب شکیلہ نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو اس کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی ایسے ہی بال اُگ رہے تھے۔ مگر یہ گچھا اُسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔

بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہری بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو سرسراہٹ اسے محسوس ہوا کرتی تھی۔ اسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور ناک میں پیدا کر دی۔

شکیلہ کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا اور بغل چھپ گئی تھی مگر مومن اب بھی کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا اس کے تصور میں شکیلہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اٹھا رہا۔ اور بغل میں اس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دے دیا اور کہا۔ "جاؤ، واپس دے آؤ۔ کہنا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔"

مومن گز واپس دے کر باہر صحن میں بیٹھ گیا اس کے دل و دماغ میں دھندلے دھندلے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرنک کھولا جس میں اس نے عید کے لیے نئے کپڑے بنوا کر رکھے تھے۔

جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھے کی بو اس کی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہا دھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر وہ سیدھا شکیلہ بی بی کے پاس جائے اور اسے سلام کرے...... اس کی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑ کھڑ کرے گی اور اس کی رومی ٹوپی......"

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا پھندنا آگیا اور وہ پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم اور لچکیلے پھندنے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ اندر سے شکیلہ بی بی کی آواز آئی "مومن!"

مومن نے ٹوپی ٹرنک میں رکھی، ڈھکنا بند کیا اور اندر چلا گیا۔ جہاں تسکینہ نمونے کے مطابق اودی ساٹن کے کئی ٹکڑے کاٹ چکی تھی۔ ان چمکیلے اور پھسل پھسل جانے والے ٹکڑے کو ایک جگہ رکھ کر وہ مومن کی طرف متوجہ ہوئی۔ میں نے تمہیں اتنی آوازیں دیں۔ سو گئے تھے کیا؟"

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ "نہیں بی بی جی۔"

"تو کیا کر رہے تھے؟"

"کچھ ------ کچھ بھی نہیں؟"

"کچھ تو ضرور کرتے ہو گے۔" شکیلہ یہ سوال کیے جا رہی تھی مگر اس کا دھیان اصل میں بلاؤز کی طرف تھا جسے اب اسے کچا کرنا تھا۔

مومن نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ "ٹرنک کھول کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہا تھا۔"

تسکینہ کھکھلا کر ہنسی۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

تسکینہ کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی اور اسی تسکین نے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی مضحکہ خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے جس سے تسکینہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے۔ چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں تتلاہٹ پیدا کر کے اس نے کہا "بڑی بی بی جی سے پیسے لے کر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا۔"

تسکینہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا "کیا کرو گے اس رومال کو؟"

مومن نے جھینپ کر جواب دیا "گلے میں باندھ لوں گا بی بی جی ------ بڑا اچھا معلوم ہو گا۔"

یہ سن کر تسکینہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

"گلے میں باندھو گے تو یاد رکھنا اسی سے پھانسی دے دوں گی۔" یہ کہہ کر شکیلہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ سے کہا "کم بخت نے مجھے کام ہی بھلا دیا۔ رضیہ میں نے اسے کیوں بلایا تھا؟"

رضیہ نے جواب نہ دیا اور وہ نئی فلمی طرز گنگنانا شروع کر دی جو وہ دو روز سے سیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں تسکینہ کو خود ہی یاد آ گیا کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا۔

"دیکھو مومن۔ میں تمہیں یہ بنیان اتار کر دیتی ہوں۔ دوائیوں والے کے پاس جو ایک دکان نئی کھلی ہے نا، وہی جہاں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے۔ وہاں جاؤ اور پوچھ کے آؤ کہ ایسی چھ بنیانوں کا وہ کیا لے گا ---- کہنا ہم پوچھ لیں گے۔ اس لیے کچھ رعایت ضرور کرے ...... سمجھ لیا نا؟"

مومن نے جواب دیا "جی ہاں۔"

"اب تم پرے ہٹ جاؤ۔"

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس آ گرا اور اندر

سے شکیلہ کی آواز آئی، "کہنا ہم اسی قسم کی اسی ڈیزائن کی بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہیئے۔"

مومن نے بہت اچھا کہہ کر بنیان اٹھا لیا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹا لیا ہو۔ بدن کی بُو بھی اس میں بسی ہوئی تھی میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔

وہ اس بنیان کو جو بلی کے بچے کی طرح ملائم تھا، اپنے ہاتھوں میں مسلتا باہر چلا گیا، جب بھاؤ داؤ دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو شکیلہ بلاؤز کی سلائی شروع کر چکی تھی۔ اس اودی اودی ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی روئی ٹوپی کے پھندنے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور لچکدار تھی۔

یہ بلاؤز شائد عید کے لیے تیار کیا جا رہا تھا کیوں کہ عید اب بالکل قریب آ گئی تھی۔ مومن کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کے لیے، استری نکلنے کے لیے، سوئی ٹوٹ گئی تو نئی سوئی لانے کے لیے شام کے قریب جب شکیلہ نے دوسرے روز پر باقی کام اٹھا دیا تو دھاگے کے ٹکڑے اور اودی ساٹن کی بیکار کترنیں اٹھانے کے لیے بھی اسے بلایا گیا۔

مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی۔ باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ مگر ساٹن کی چمکیلی کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں .... بالکل بے مطلب، کیوں کہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کو کیا کرے گا؟!

دوسرے روز اس نے جیب سے کترنیں نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا۔ حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا، مسلتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔

اس دن بھی اسے شکیلہ نے کئی بار بلایا .... اودی ساٹن کے بلاؤز کی ہر شکل اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اسے کچا کیا گیا تھا تو اس پر سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانکے جا بجا پھیلے ہوئے تھے پھر اس پر استری کی گئی جس سے سب شکنیں دور ہو گئیں اور چمک بھی دوبالا ہو گئی۔ اس کے بعد کچی حالت ہی میں شکیلہ نے اُسے پہنا۔ رضیہ کو دکھایا۔ دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس آئینے میں خود اس کو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا۔ جب پورا اطمینان ہو گیا تو اسے اتارا۔ جہاں جہاں تنگ یا کھلا تھا وہاں نشان بنائے، اس کی ساری خامیاں دور کیں۔ ایک بار پھر پہن کر دیکھا جب بالکل فٹ ہو گیا تو پکی سلائی شروع کی۔

ادھر ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا۔ ادھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانکے سے ادھڑ رہے تھے .... جب اسے کمرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے صرف چھو کر ہی نہیں .... بلکہ اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے، اپنے کھردرے ہاتھ۔

اس نے ان ساٹن کے ٹکڑوں سے اس کی ملائمت کا اندازہ کر لیا تھا۔ دھاگے جو اس نے ان ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے۔ جب اس نے ان کا گچھا بنایا تو دباتے وقت اسے معلوم ہوا تھا کہ ان میں ربڑ کی سی لچک بھی ہے .... وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا۔ اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ کالے کالے بال۔ مومن سوچتا تھا کیا وہ بھی اس ساٹن ہی کی طرح ملائم ہوں گے۔؟۔

بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا .... مومن کمرے کے فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا۔ کہ شکیلہ اندر آئی۔ قمیص اتار کر اس نے پلنگ پر رکھی۔ اس کے نیچے اسی قسم کا سفید بنیان تھا۔ جس کا نمونہ لے کر مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا .... اس کے اوپر شکیلہ نے اپنے ہاتھ کا سلا ہوا بلاؤز پہنا۔ سامنے کے ہک لگائے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

مومن نے فرش صاف کرتے ہوئے آئینہ کی طرف دیکھا۔ بلاؤز میں اب جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہو گیا ہے .... شکیلہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی جھری بلاؤز فٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھیں۔ مومن سے رہا نہ گیا۔ چنانچہ اس نے کہا۔ "بی بی جی۔ آپ نے درزیوں کو بھی مات کر دیا ہے!"

شکیلہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کے لیے بیقرار تھی۔ اس لیے وہ صرف "اچھا ہے نا" کہہ کر باہر دوڑ گئی .... مومن آئینے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جس میں بلاؤز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔

رات کو جب وہ پھر اس کمرے میں صراحی رکھنے کے لیے آیا تو اس نے کھونٹی پر لکڑی کے ہینگر میں اس بلاؤز کو دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے یوں لگا کہ کوئی اس کے جسم کے ملائم روئیں پر ہولے ہولے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے۔

رات کو جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے ....

ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اسے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا .... یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولا بنا ہوا تھا .... پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنا شروع ہوئے .... بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے .... پھر آندھی آ گئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا .... پھندنے کی تلاش میں نکلا .... دیکھی اور ان دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا .... نئے لٹھے کی بو بھی یہیں کہیں سے آنا شروع ہوئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا .... ایک کالی ساٹن کی بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا .... کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اسے خوف، تعجّب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا۔ اس کی حالت اس وقت عجیب و غریب تھی .... پہلے اسے تکلیف وہ حرارت محسوس ہوتی۔ مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم پر رینگنے لگی۔

منٹو نے حقیقت نگاری کی روش کے باوصف سپاٹ پن سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ منٹو نے اپنے لئے ایک ایسا میدان منتخب کیا جو ایک عام قاری کے لئے بے حد دلچسپ تھا۔ اس میدان میں جب منٹو نے کردار کے جنسی پہلو کو اجاگر کیا تو اسے بے حد کامیابی ہوئی اور اس کی آواز کو قطعاً منفرد قرار دے دیا گیا۔ تاہم اس بات کو عام طور پر فراموش کر دیا گیا کہ منٹو نے نہ صرف ایک محدود سے میدان کو اپنے لئے منتخب کیا تھا بلکہ زندگی کو بھی غسل خانے کے روزن سے دیکھا تھا۔ چنانچہ اسے زندگی کا صرف ایک خاص پہلو ہی نظر آیا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس خاص پہلو کی عکاسی میں منٹو نے دیانت، خلوص اور گہری نظر کا ثبوت دیا۔

وزیر آغا



منٹو کے افسانوں کے کردار زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دلّال ہیں، مولوی ہیں، استاد ہیں، پہلوان ہیں، کالج کے لڑکے لڑکیاں ہیں، قریب قریب ہر معاشری طبقے کے افراد منٹو کے افسانوں میں ملیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس معاشرت کو منٹو نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جس کے افراد کم و بیش، منٹو کے حمام میں سب ننگے ہیں وہ متوسط الحال طبقہ ہے جو غریبوں اور امیروں کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح متحرک رہتا ہے۔ اس طبقے میں سے کچھ اوپر کے طبقے میں چلے جاتے ہیں اور نودولتئے کہلاتے ہیں۔ کچھ نیچے اترتے ہیں اور اس قسم کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ مزدور، کسان، کلرک وغیرہ۔ منٹو کے افسانوں میں دو خصوصیات ایسی ہیں جو اسے اپنے معاصروں سے بالکل علیحدہ کر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کبھی ایسی چیز کو افسانے کا موضوع نہیں بناتا جس کے کیف و کم سے وہ بخوبی آگاہ نہ ہو۔ اس کی حیرت انگیز قوتِ مشاہدہ اس کے ذہن میں واقعات کا تحفظ، اس کی تیز بینی یہ چیزیں اسی سلسلے میں نظر آتی ہیں۔ اس کی دوسری خصوصیات جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، یہ ہے کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں۔ ذہنی طور پر غالباً عصرِ حاضر کا سب سے زیادہ توانا اور صحت مند ادیب ہے اسی لئے ذہنی بیماری اور نفسیاتی الجھن کو وہ فوراً پہچانتا ہے۔ یعنی ان چیزوں کو وہ اپنی ذات کی نسبت سے پہچانتا ہے۔

عابد علی عابد



شہید ساز

میں کاٹھیاواڑ گجرات کا رہنے والا ہوں۔ ذات کا بنیا ہوں۔ پچھلے برس جب تقسیم ہندوستان پر ٹنٹا ہوا تو میں بالکل بیکار تھا۔ معاف کیجیے گا میں نے لفظ ٹنٹا استعمال کیا مگر اس کا کوئی حرج نہیں اس لیے کہ اردو زبان میں باہر کے الفاظ آنے ہی چاہئیں چاہے گجراتی ہی کیوں نہ ہوں۔

جی ہاں، میں بالکل بیکار تھا لیکن کوکین کا تھوڑا سا کاروبار چل رہا تھا جس سے آمدن کی کچھ صورت ہو ہی جاتی تھی۔ جب بٹوارہ ہوا اور ادھر کے آدمی ادھر اور ادھر کے آدمی ادھر ہزاروں کی تعداد میں آنے جانے لگے تو میں نے سوچا چلو پاکستان چلیں۔ کوکین کا نہ سہی کوئی اور کاروبار شروع کر دوں گا۔ چنانچہ وہاں سے چل پڑا اور راستے میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے دھندے کرتا پاکستان پہنچ گیا۔

میں تو چلا ہی اس نیت سے تھا کہ کوئی موٹا کاروبار کروں گا۔ چنانچہ پاکستان پہنچتے ہی میں نے حالات کو اچھی طرح جانچا۔ اور الاٹمنٹوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسکہ پالش مجھے آتا ہی تھا۔ چکنی چپڑی باتیں کیں۔ ایک دو آدمیوں کے ساتھ یارانہ گانٹھا اور ایک چھوٹا سا مکان الاٹ کرا لیا۔ اس سے کافی منافع ہوا تو میں مختلف شہروں میں پھر کر مکان اور دکانیں الاٹ کرانے کا دھندا کرنے لگا۔

کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنی پڑتی ہے۔ مجھے بھی چنانچہ الاٹمنٹوں کے سلسلے میں کافی تگ و دو کرنی پڑی۔ کسی کے مسکہ لگایا کسی کی مٹھی گرم کی، کسی کو کھانے کی دعوت دی، کسی کو ناچ رنگ کی غرضیکہ بے شمار بکھیڑے تھے۔ دن بھر خاک پھانکتا بڑی کوٹھیوں کے پھیرے کرتا اور شہر کا چپہ چپہ دیکھ کر اچھا سا مکان تلاش کرتا جس کے الاٹ کرانے سے زیادہ منافع ہو۔

انسان کی محنت کبھی خالی نہیں جاتی چنانچہ ایک برس کے اندر اندر میں نے لاکھوں روپے پیدا کر لیے۔ اب خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی، بینک میں بے اندازہ مال پانی —— معاف کیجیے گا۔ میں کاٹھیاواڑ گجرات کا روزمرہ استعمال کر گیا مگر کوئی مائدہ نہیں۔ اردو زبان میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہونے چاہئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ہاں، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی، نوکر چاکر، پیکارڈ موٹر، بینک میں ڈھائی لاکھ روپے۔ کارخانے اور دکانیں الگ —— یہ سب کچھ تھا لیکن میرے دل کا چین جانے کہاں اڑ گیا۔ یوں تو کوکین کا دھندا کرتے ہوئے بھی دل پہ کبھی کبھی بوجھ محسوس ہوتا تھا لیکن اب تو جیسے دل رہا ہی نہیں تھا یا پھر یوں کہیے کہ بوجھ اتنا آن پڑا کہ دل اس کے نیچے دب گیا۔ پر یہ بوجھ کس بات کا تھا؟

آدمی ذہین ہوں۔ دماغ میں کوئی سوال پیدا ہو جائے تو میں اس کا جواب ڈھونڈ ہی نکالتا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے (حالانکہ دل کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا) میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس گڑبڑ گھوٹالے کی وجہ کیا ہے؟

عورت؟ ——— ہوسکتی ہے۔ میری اپنی تو کوئی تھی ہی نہیں۔ جو تھی وہ کاٹھیاواڑ گجرات میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئی تھی لیکن دوسروں کی عورتیں موجود تھیں۔ مثال کے طور پر اپنے مالی ہی کی تھی۔ اپنا اپنا ٹیسٹ ہے۔ سچ پوچھئے تو عورت جوان ہونی چاہئے اور یہ ضروری نہیں کہ پڑھی لکھی ہو۔ ڈانس کرنا جانتی ہو۔ اپن کو تو ساری جوان عورتیں چلتی ہیں (کاٹھیاواڑ گجرات کا محاورہ ہے جس کا اردو میں نعم البدل موجود نہیں)

عورت کا تو سوال ہی اٹھ گیا اور دولت کا پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ اسلئے کہ بندہ زیادہ لالچی نہیں۔ جو کچھ ہے اسی پر قناعت ہے لیکن پھر یہ دل والی بات کیوں پیدا ہوگئی تھی۔

آدمی ذہین ہوں۔ کوئی مسئلہ سامنے آجائے تو اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کارخانے چل رہے تھے، دکانیں بھی چل رہی تھیں۔ روپیہ اپنے آپ پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے الگ تھلگ ہو کر سوچنا شروع کیا اور بہت دیر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دل کی گڑبڑ صرف اس لئے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔

کاٹھیاواڑ گجرات میں تو میں نے بیسیوں نیک کام کئے تھے۔ مثال کے طور پہ جب میرا دوست پانڈو رنگ مر گیا تو میں نے اس کی رانڈ کو اپنے گھر ڈال لیا اور دو برس تک اس کو دھندا کرنے سے روکے رکھا۔

ونائک کی لکڑی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو اسے نئی خرید دی۔ تقریباً چالیس روپے اس پر اٹھ گئے تھے۔ جمنا بائی کو گرمی ہوگئی۔ سالی کو (معاف کیجئے گا) کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ چھ مہینے برابر اس کا علاج کراتا رہا ——— لیکن پاکستان آکر میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا اور دل کی گڑبڑ کی یہی وجہ تھی ورنہ اور سب ٹھیک تھا۔

میں نے سوچا، کیا کروں؟ ——— خیرات دینے کا خیال آیا لیکن ایک روز شہر میں گھوما تو دیکھا کہ قریب قریب ہر شخص بھکاری ہے۔ کوئی بھوکا ہے کوئی ننگا۔ کس کس کا پیٹ بھروں، کس کس کا انگ ڈھانکوں؟ ——— سوچا ایک لنگر خانہ کھول دوں لیکن ایک لنگر خانے سے کیا ہوتا اور پھر اناج کہاں سے لاتا۔ بلیک مارکیٹ سے خریدنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ سوال بھی ساتھ ہی پیدا ہو گیا کہ ایک طرف گناہ کر کے دوسری طرف کارِ ثواب کا مطلب ہی کیا ہے۔

گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر میں نے لوگوں کے دکھ درد سنے۔ سچ پوچھئے تو ہر شخص دکھی تھا۔ وہ بھی جو دکانوں کے تھڑوں پر سوتے ہیں اور وہ بھی جو اونچی اونچی حویلیوں میں رہتے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کام کا کوئی جوتا نہیں۔ موٹر میں بیٹھنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کار کا نیا ماڈل نہیں۔ ہر شخص کی شکایت اپنی اپنی جگہ درست تھی۔ ہر شخص کی حاجت اپنی اپنی جگہ معقول تھی۔

میں نے غالب کی ایک غزل اللہ بخشے شولاپور کی امینہ بائی چلکے کر سے سنی تھی۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

کس کی حاجت روا کرے کوئی

——— معاف کیجئے گا یہ اس کا دوسرا مصرعہ ہے اور ہوسکتا ہے پہلا ہی ہو۔

جی ہاں، میں کس کس کی حاجت روا کرتا۔ جب سو میں سے سو ہی حاجت مند تھے۔ میں نے پھر بھی یہ سوچا کہ خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں۔ ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں لیکن میں نے مہاجرین کے کیمپوں میں جا جا کر جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ خیرات نے بہت سے مہاجرین کو بالکل ہی نکما بنا دیا ہے۔ دن بھر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں۔ جگار ہو رہی ہے (معاف کیجئے گا جگار کا مطلب ہے جوا یعنی قمار بازی) گالیاں بک رہے ہیں اور فوکٹ یعنی مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں —— ایسے لوگ بھلا پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ بھیک دینا ہرگز ہرگز نیکی کا کام نہیں لیکن پھر نیکی کے کام کے لئے اور کونسا رستہ ہے۔

کیمپوں میں دھڑا دھڑ آدمی مر رہے تھے۔ کبھی ہیضہ پھوٹتا تھا کبھی پلیگ۔ ہسپتالوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ مجھے بڑا ترس آیا۔ قریب تھا کہ ایک ہسپتال بنوا دوں مگر سوچنے پر ارادہ ترک کر دیا۔ پوری سکیم تیار کر چکا تھا۔ عمارت کے لئے ٹنڈر طلب کرتا۔ داخلے کی فیسوں کا روپیہ جمع ہو جاتا۔ اپنی ہی ایک کمپنی کھڑی کر دیتا اور ٹنڈر اس کے نام نکال دیتا۔ خیال تھا ایک لاکھ روپے عمارت پر صرف کر دوں گا۔ ظاہر ہے کہ ستر ہزار روپے میں بلڈنگ کھڑی کر دیتا اور پورے تیس ہزار روپے بچا لیتا مگر یہ ساری سکیم دھری کی دھری رہ گئی جب میں نے سوچا کہ اگر مرنے والوں کو بچا لیا گیا تو یہ جو زاید آبادی ہے وہ کیسے کم ہو گی۔

غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی فالتو آبادی کا ہے۔ لفڑا کا مطلب ہے جھگڑا، وہ جھگڑا جس میں فضیحتا بھی ہو لیکن اس سے بھی اس لفظ کی پوری معنویت میں بیان نہیں کر سکا۔

جی ہاں، غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی اس فالتو آبادی کا باعث ہے۔ اب لوگ بڑھتے جائیں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمینیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی، آسمان بھی ساتھ ساتھ پھیلتا جائے گا۔ بارشیں زیادہ ہوں گی۔ اناج زیادہ پیدا ہو گا اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہسپتال بنانا ہرگز ہرگز نیک کام نہیں۔

پھر سوچا مسجد بنوا دوں لیکن اللہ بخشے شولا پور کی امینہ بائی چلکے کر کا گایا ہوا ایک شعر یاد آ گیا۔

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا

وہ منظور کو منجور اور فیض کو فیج کہا کرتی تھی۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا۔

کس کم بخت کو نام و نمود کی خواہش ہے۔ وہ جو نام اچھالنے کے لئے پل بناتے ہیں نیکی کا کیا کام کرتے ہیں؟ —— خاک؟ میں نے کہا۔ نہیں یہ مسجد بنوانے کا خیال بالکل غلط ہے۔ بہت سی الگ الگ مسجدوں کا ہونا بھی قوم کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتا اس لئے کہ عوام بٹ جاتے ہیں۔

تھک ہار کر میں حج کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے خود ہی ایک راستہ بتا دیا۔ شہر میں ایک جلسہ ہوا۔ جب ختم ہوا تو لوگوں میں بدنظمی پھیل گئی۔ اتنی بھگدڑ مچی کہ تیس آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کی خبر دوسرے روز اخباروں میں چھپی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاک نہیں بلکہ شہید ہوئے تھے۔

میں نے سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کے علاوہ میں کئی مولویوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اچانک حادثوں کا شکار ہوتے

ہیں انہیں شہادت کا رتبہ ملتا ہے یعنی وہ رتبہ جس سے بڑا کوئی اور رتبہ ہی نہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر لوگ مرنے کے بجائے شہید ہوا کریں تو کتنا اچھا ہے۔ وہ جو عام موت مرتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کی موت بالکل اکارت جاتی ہے اگر وہ شہید ہو جاتے تو کوئی بات بنتی۔

میں نے اس باریک بات پر اور غور کرنا شروع کیا۔

چاروں طرف دیکھو خستہ حال انسان تھے۔ چہرے زرد، فکر و تردد اور غمِ روزگار کے بوجھ تلے پسے ہوئے، دھنسی ہوئی آنکھیں بے جان چال، کپڑے تار تار، ریل گاڑی کے کنڈم مال کی طرح یا تو کسی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پڑے ہیں یا بازاروں میں بے مالک مویشیوں کی طرح منہ اٹھائے بے مطلب گھوم رہے ہیں۔ کیوں جی رہے ہیں کس کے لئے جی رہے ہیں اور کیسے جی رہے ہیں۔ اس کا کچھ پتا نہیں۔ کوئی وبا پھیلی ہزاروں مر گئے۔ اور کچھ نہیں تو بھوک اور پیاس ہی سے گھل گھل مرے۔ سردیوں میں اکڑ گئے۔ گرمیوں میں سوکھ گئے۔ کسی کی موت پر کسی نے دو آنسو بہا دیئے۔ اکثریت کی موت خشک ہی رہی۔

زندگی سمجھ میں نہ آئی۔ ٹھیک ہے، اس سے حظ نہ اٹھایا۔ یہ بھی ٹھیک ہے ——— وہ کس کا شعر ہے۔ اللہ بخشے شولاپور کی امینہ بائی چتلنے کر کیا درد بھری آواز میں گایا کرتی تھی ؎

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میرا مطلب ہے اگر مرنے کے بعد بھی زندگی نہ سُدھری تو لعنت ہے گُسری پر۔

میں نے سوچا کیوں نہ یہ بے چارے، یہ قسمت کے مارے، دردھ کے ٹھکرائے ہوئے انسان جو اس دنیا میں ہر اچھی چیز کے لئے ترستے ہیں اس دنیا میں ایسا رتبہ حاصل کریں کہ وہ جو یہاں ان کی طرف نگاہ اٹھانا پسند نہیں کرتے وہاں ان کو دیکھیں اور رشک کریں۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ عام موت نہ مریں بلکہ شہید ہوں۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ لوگ شہید ہونے کے لئے راضی ہوں گے؟ میں نے سوچا کیوں نہیں، وہ کون مسلمان ہے جس میں ذوقِ شہادت نہیں۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی تو ہندوؤں اور سکھوں میں بھی یہ رتبہ پیدا کر دیا گیا ہے لیکن مجھے سخت ناامیدی ہوئی جب میں نے ایک مریل آدمی سے پوچھا: "کیا تم شہید ہونا چاہتے ہو؟ ——— تو اس نے جواب دیا۔ "نہیں!"

سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص جی کر کیا کرے گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھو بڑے میاں زیادہ سے زیادہ، زیادہ سے زیادہ تم ڈیڑھ مہینہ اور جیو گے۔ چلنے کی تم میں سکت نہیں۔ کھانستے کھانستے غوطے میں چلے جاتے ہو تو ایسا لگتا ہے کہ بس دم نکل گیا۔ پھوٹی کوڑی تک تمہارے پاس نہیں۔ زندگی بھر تم نے سُکھ نہیں دیکھا۔ مستقبل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اور جی کر کیا کرو گے۔ فوج میں تم بھرتی ہو نہیں سکتے اس لئے محاذ پر اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دینے کا خیال بھی عبث ہے۔ اس لئے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم کوشش کر کے یہیں بازار میں یا ڈیرے میں جہاں تم سوتے ہو اپنی شہادت کا بندوبست کر لو۔"

اس نے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے جواب دیا: "یہ سامنے کیلے کا چھلکا پڑا ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ تم اس پر سے پھسل جاؤ ——— ظاہر ہے کہ تم مر جاؤ گے اور شہادت کا رتبہ پاؤ گے۔"

پر یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہنے لگا: "میں کیوں آنکھوں دیکھے کیلے کے چھلکے پر پاؤں دھرنے لگا۔ کیا مجھے اپنی جان عزیز نہیں"۔

اللہ اللہ کیا جان تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچا۔ جھریوں کی گٹھڑی!

مجھے بہت افسوس ہوا اور اس وقت اور بھی زیادہ ہوا جب میں نے سنا کہ وہ کم بخت جو بڑی آسانی سے شہادت کا رتبہ اختیار کر سکتا تھا خیراتی ہسپتال میں لوہے کی چارپائی پہ کھانستا کھنکارتا مر گیا۔

ایک بڑھیا تھی۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ آخری سانس لے رہی تھی۔ مجھے بہت ترس آیا۔ ساری عمر غریب کی مفلسی اور رنج و غم میں گزری تھی۔ میں اسے اٹھا کر ریل کے پاٹے پہ لے گیا۔ معاف کیجئے گا ہمارے یہاں پٹڑی کو پاٹا کہتے ہیں۔ لیکن جناب جونہی اس نے ٹرین کی آواز سنی ہوش میں آگئی اور کوک بھرے کھلونے کی طرح اٹھ کر بھاگ گئی۔

میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ بنیا کا بیٹا اپنی دھن کا پکا ہوتا ہے۔ نیکی کا جو صاف اور سیدھا راستہ مجھے نظر آیا تھا میں نے اس کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

مغلوں کے وقت کا ایک بہت بڑا احاطہ خالی پڑا تھا۔ اس میں ایک سو اکاون چھوٹے کمرے تھے۔ بہت ہی خستہ حالت میں۔ میری تجربہ کار آنکھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کی چھتیں ڈھے جائیں گی۔ چنانچہ میں نے اس احاطے کو ساڑھے دس ہزار روپے میں خرید لیا اور اس میں ایک ہزار مفلوک الحال آدمی بسا دیئے۔ دو مہینے کرایہ وصول کیا۔ ایک روپیہ ماہوار کے حساب سے۔ تیسرے مہینے جیسا کہ میرا اندازہ تھا پہلی ہی بڑی بارش میں سب کمروں کی چھتیں نیچے آ رہیں اور سات سو آدمی جن میں بچے بوڑھے سبھی شامل تھے شہید ہو گئے۔

وہ جو میرے دل پر بوجھ سا تھا کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ آبادی میں سے سات سو آدمی کم ہو گئے لیکن انہیں شہادت کا رتبہ بھی مل گیا ——

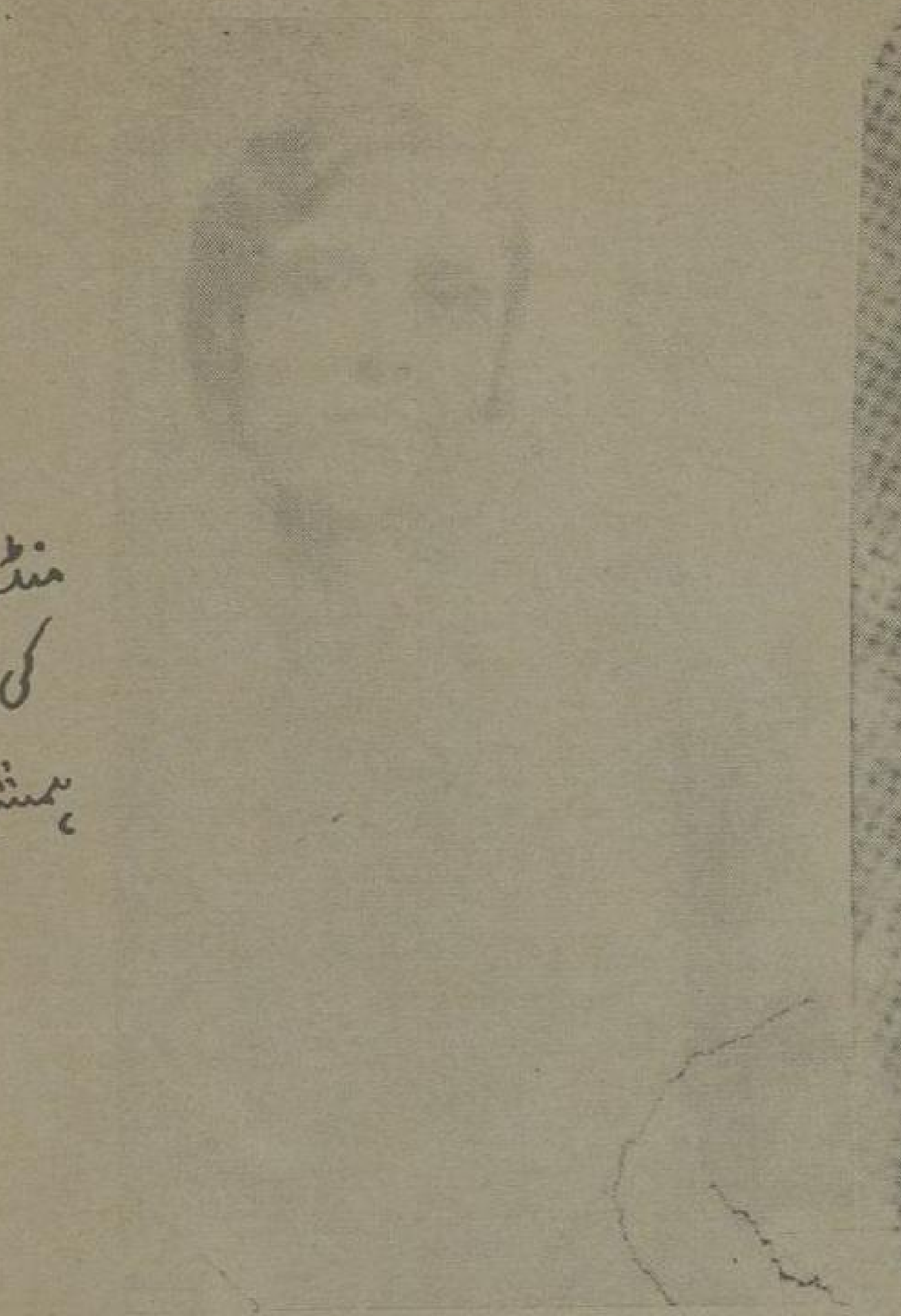
ادھر کا پلڑا بھاری ہی رہا۔

جب سے میں یہی کام کر رہا ہوں۔ ہر روز حسب توفیق دو تین آدمیوں کو جام شہادت پلا دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ بخشے شولاپور کی امینہ بائی چپلے کر ایک شعر گایا کرتی تھی لیکن معاف کیجئے گا۔ شعر یہاں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ کچھ بھی ہو۔ کہنا یہ ہے کہ مجھے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پہ ایک آدمی کو جس کا وجود چھکڑے کے پانچویں پہیے کی طرح بے معنی اور بیکار تھا جام شہادت پلانے کے لئے مجھے پورے دس دن جگہ جگہ کیلے کے چھلکے گرانے پڑے لیکن موت کی طرح جہاں تک میں سمجھتا ہوں شہادت کا بھی ایک دن مقرر ہے۔ دسویں روز جا کر وہ پتھریلے فرش پر کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا اور شہید ہوا۔

آجکل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے۔ دو لاکھ کا ہے۔ اس میں سے ۷۵، ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ بیمہ بھی کرا لیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ اڑا اڑا دھڑام گر پڑے گی کیونکہ میں نے مصالحہ ہی ایسا لگوایا ہے۔ اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے۔ خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ پرلے درجے کا گنہگار ہے جس کی شہادت اللہ تبارک و تعالیٰ کو منظور نہیں تھی۔



منٹو کی والدہ



منٹو کی ہمشیرہ



منٹو اپنی بیگم، خواہر نسبتی اور بیٹی کے ساتھ



ٹوبہ ٹیک سنگھ





ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیئے یعنی جو مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاگل پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں ان کو ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے وہیں رہنے دیئے گئے تھے جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان سے چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے اس لئے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے وہ سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بورڈر پر پہنچا دیئے گئے۔

اُدھر کا معلوم نہیں لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ "زمیندار" پڑھتا تھا اس کے ایک دوست نے پوچھا:

"مولبی ساب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے"۔

اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا: "ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں اُسترے بنتے ہیں"۔

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے پاگل سے پوچھا: "سردار جی۔ ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی"۔

دوسرا مسکرایا: "مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے۔۔۔۔ ہندوستانی بڑے شیطانی، اکڑ اکڑ کر پھرتے ہیں"۔

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ

پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ . . . . یہ کہاں ہے اس کا محل وقوع کیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن وہ درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا:

"میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں ——— میں اس درخت ہی پہ رہوں گا"۔

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس سی پاس ریڈیو انجینئر میں، جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کا ایک موٹا مسلمان پاگل تھا جو مسلم لیگ کا سرگرم رکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے ——— اس کی دیکھا دیکھی ایک پاگل سکھ ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اس نے وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے ——— اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ تھی مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لئے کہ اس کا خیال تھا کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو

بہت صدمہ ہوا۔ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یوریپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روٹی کی بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنی پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے:

"اوپڑدی گڑگڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین"

دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے بھی نہیں سویا، لیٹتا بھی نہیں تھا البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر وہ اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا اور کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیا:

"اوپڑدی گڑگڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ"۔

لیکن بعد میں آف دی پاکستان گورنمنٹ کی جگہ آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ، نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتہ کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ھندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لئے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک سی ہو گئی تھی مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے مہینہ کون سا یا کتنے سال بیت چکے ہیں لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا

چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا۔ بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو خاموش رہتا یا کبھی کبھار "او پڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی ــــ جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں۔ پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لئے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ اسے یقیناً بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا.......... کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور کہا: "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔"

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دیدے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اس پر برس پڑا۔

"او پڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح۔ جو بولے سو نہال ... ست سری اکال۔"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو ــــ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا:

"یہ تم سے ملنے آیا ہے ــــ تمہارا دوست فضل دین ہے۔"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا:

"میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ــــ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ــــ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی میں نے کی تمہاری بیٹی روپ کور ....."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ جیسے کچھ یاد کرنے لگا: "بیٹی روپ کور۔"

فضل دین نے رک رک کر کہا: "ہاں ــــ وہ ــــ وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے ــــ ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔"

بشن سنگھ خاموش رہا۔

فضل دین نے کہنا شروع کیا:

"انہوں نے مجھ سے کہا تھا تمہاری خیر خیریت پوچھتے رہنا ——— اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو۔ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا ——— اور بہن امرت کور سے بھی ——— بھائی بلبیر سنگھ سے کہنا کہ فضل دین راضی خوشی ہے ——— وہ بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ——— دوسری کے کٹی ہوئی ہے پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی ——— اور ——— میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں ——— اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں"۔

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا:

"ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے"۔

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا: "کہاں ہے ——— وہیں ہے جہاں تھا"۔

بشن سنگھ نے پھر پوچھا: "پاکستان میں یا ہندوستان میں"۔

"ہندوستان میں ——— نہیں نہیں۔ پاکستان میں"۔ فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا: "اوپڑ دی گڑگڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے منہ"۔

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھی۔ ادھر سے اُدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے جو نکلنے پر رضا مند ہوتے تھے ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ ادھر ادھر بھاگ اُٹھتے تھے۔ جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔ کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں۔ بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ——— پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے "پاکستان زندہ باد" اور "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واگہہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا:
"ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے ـــــ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"
متعلقہ افسر ہنسا: "پاکستان میں"۔

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا:

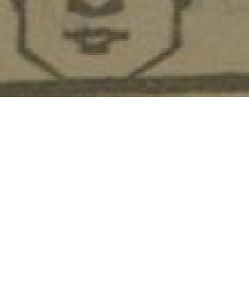
"ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے" ـــــ اور زور زور سے چلّانے لگا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان"۔

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے ـــــ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب کوئی طاقت اسے وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ـــــ ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا ـــــ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

اردو حقیقت پسند افسانہ میں منٹو پہلا افسانہ نویس ہے جس نے افسانے کی نئی زبان سے وجہ یافت کی ہے۔ اس نے بیان اور اظہار کے مروّجہ طریقے کو قبول کرنے کی بجائے افسانے کے لیے پرافسانے کے لسانی اسلوب کی تعمیر کی ہے۔ طویل بیانیہ جملے لکھنے کے بجائے مختصر اور اکہرے جملے لکھ کر زیادہ سے زیادہ مفاہیم پیدا کئے ہیں۔ مختصر اردو افسانے میں تقلیل اور اختصار کے عمل کا آغاز منٹو سے ہوتا ہے۔ منٹو کے یہاں اکثر و بیشتر مقامات پر الفاظ کے معانی غیر منسوبی ہیں۔ اس کے افسانوں کا لسانی سیاق و سباق کرداروں کے معاشرتی پس منظر کی نفسیاتی اور جذباتی حالتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اس کے یہاں اینٹی فلوجسٹیکن، دھڑن تختہ، کنٹی نیوٹی ملانا وغیرہ ایسے مہمل الفاظ ملتے ہیں جن کو خصوصی سیاق و سباق میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن وہ نہ صرف زائد معانی دیتے ہیں بلکہ کرداروں کے اوصاف کی تعمیر کرتے ہیں۔ منٹو کا اردو افسانہ میں ایک اہم اضافہ زبان کا غیر رسمی استعمال ہے۔ منٹو کا لسانی محاورہ کتابی ہونے کے بجائے زندگی کے ٹھوس واقعات سے پیدا ہوتا ہے۔



انیس ناگی



خوشیا

خوشیا سوچ رہا تھا۔

بنواری سے کالے تمباکو والا پان لے کر وہ اسی دکان کے ساتھ اس سنگین چبوترے پر بیٹھا تھا جو دن کے وقت ٹائروں اور موٹروں کے مختلف پرزوں سے بھرا ہوتا ہے۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب موٹر کے پرزے اور ٹائر بیچنے والوں کی یہ دکان بند ہو جاتی ہے اور اس کا سنگین چبوترہ خوشیا کے لئے خالی ہو جاتا ہے۔

وہ کالے تمباکو والا پان آہستہ آہستہ چبا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پان کی گاڑھی تمباکو ملی پیک اس کے دانتوں کی ریخوں سے نکل کر اس کے منہ میں اودھر ادھر پھسل رہی تھی اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کے خیال دانتوں تلے پس کر اس کی پیک میں گھل رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا۔

خوشیا پان کی پیک منہ میں پلپلا رہا تھا اور اس واقعہ پر غور کر رہا تھا جو اس کے ساتھ ابھی پیش آیا تھا یعنی آدھ گھنٹہ پہلے۔

وہ اس سنگین چبوترے پر حسبِ معمول بیٹھنے سے پہلے کھیت واڑی کی پانچویں گلی میں گیا تھا۔ منگلور سے جو نئی چھوکری کانتا آئی تھی اسی گلی کے نکڑ پر رہتی تھی۔ خوشیا سے کسی نے کہا تھا کہ وہ اپنا مکان تبدیل کر رہی ہے چنانچہ وہ اسی بات کا پتہ لگانے کے لئے وہاں گیا تھا۔

کانتا کی کھولی کا دروازہ اس نے کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی: "کون ہے"۔

اس پر خوشیا نے کہا: "میں۔ خوشیا"۔

آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ خوشیا اندر داخل ہوا۔ جب کانتا نے دروازہ اندر سے بند کیا تو خوشیا نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے کانتا کو بالکل ننگا دیکھا۔ بالکل ننگا ہی سمجھو کیونکہ وہ اپنے انگ کو صرف ایک تولیے سے چھپائے ہوئے تھی۔ چھپائے ہوئے بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ چھپانے کی جتنی چیزیں ہوتی ہیں وہ تو سب کی سب خوشیا کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھیں۔

"کہو خوشیا کیسے آئے ..... میں بس اب نہانے والی ہی تھی۔ بیٹھو بیٹھو ..... باہر والے سے اپنے لئے چائے کا تو کہہ آئے ہوتے ..... جانتے ہو وہ موا راما یہاں سے بھاگ گیا ہے"۔

خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر ننگا نہیں دیکھا تھا بہت گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ اس کی نظریں جو ایک دم عریانی سے دو چار ہو گئی تھیں اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں۔

اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا: "جاؤ..... جاؤ تم نہالو" پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی..... "پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی..... اندر سے کہہ دیا ہوتا۔ میں پھر آجاتا..... لیکن جاؤ..... تم نہالو۔"

کانتا مسکرائی..... 'جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا حرج ہے۔ اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو۔"

کانتا کی یہ مسکراہٹ ابھی تک خوشیا کے دل و دماغ میں تیر رہی تھی۔ اس وقت بھی کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔

اس کا جسم خوبصورت تھا۔ پہلی مرتبہ خوشیا کو معلوم ہوا تھا کہ جسم بیچنے والی عورتیں بھی ایسا سڈول بدن رکھتی ہیں۔ اس کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ تعجب اسے اس بات پر ہوا تھا کہ ننگ دھڑنگ وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس کو لاج تک نہ آئی۔ کیوں؟

اس کا جواب کانتا نے یہ دیا تھا: 'جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا حرج ہے۔ اپنا خوشیا ہی تو ہے۔ آنے دو....."

کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ وہ اس کا دلال تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسی کا تھا..... پر یہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے ننگی ہو جاتی۔ کوئی خاص بات تھی کانتا کے الفاظ میں۔ خوشیا کوئی اور ہی مطلب کرید رہا تھا۔

یہ مطلب بیک وقت اس قدر صاف اور اس قدر مبہم تھا کہ خوشیا کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

اس وقت بھی وہ کانتا کے ننگے جسم کو دیکھ رہا تھا جو ڈھولکی پر منڈھے ہوئے چمڑے کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس کی لڑھکتی ہوئی نگاہوں سے بالکل بے پرواہ! کئی بار حیرت کے عالم میں بھی اس نے اس کے سانولے سلونے بدن پر ٹوہ لینے والی نگاہیں گاڑی تھیں مگر اس کا ایک رواں بھی نہ کپکپایا تھا۔ بس سانولے پتھر کی مورتی کے مانند کھڑی رہی جو احساس سے عاری ہوتی ہے۔

بھئی، ایک مرد اس کے سامنے کھڑا تھا..... مرد جس کی نگاہیں کپڑوں میں بھی عورت کے جسم تک پہنچ جاتی ہیں اور جو پرماتما جانے خیال ہی خیال میں کہاں کہاں پہنچ جاتا ہے لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائی..... اور..... اور اس کی آنکھیں ایسا سمجھ لو ابھی لانڈری سے دھل کر آئی ہیں..... اس کو تھوڑی سی لاج تو آنی چاہئے تھی۔ ذرا سی سرخی تو اس کے دیدوں میں پیدا ہونی چاہئے۔ مان لیا کسبی تھی پر کسبیاں یوں ننگی تو نہیں کھڑی ہو جاتیں۔

دس برس اس کو دلالی کرتے ہو گئے تھے اور ان دس برسوں میں وہ پیشہ کرانے والی لڑکیوں کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر اسے معلوم تھا کہ پائے دھونی کے آخری سرے پر جو چھوکری ایک نوجوان لڑکے کو بھائی بنا کر رہتی ہے اس لئے اچھوت کنیا کا ریکارڈ 'کاہے کرتا مورکھ پیار، پیار، پیار"..... اپنے ٹوٹے ہوئے باجے پر بجایا کرتی ہے کہ اسے

اشوک کمار سے بہت بری طرح عشق ہے۔ کئی منچلے لونڈے اشوک کمار سے اس کی ملاقات کرانے کا جھانسہ دے کر اپنا اُلو سیدھا کر چکے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ داور میں جو پنجابن رہتی ہے صرف اس لئے کوٹ پتلون پہنتی ہے کہ اس کے ایک یار نے اس سے کہا تھا کہ:

”تیری ٹانگیں تو بالکل اس انگریز ایکٹرس کی طرح ہیں جس نے ”مراکو عرف خونِ تمنا“ میں کام کیا تھا۔ یہ فلم اس نے کئی بار دیکھا اور جب اس کے یار نے کہا کہ..... ”مارلین ڈیٹریچ اس لئے پتلون پہنتی ہے کہ اس کی ٹانگیں بہت خوبصورت ہیں اور ان ٹانگوں کا اس نے دو لاکھ کا بیمہ کرا رکھا ہے“..... تو اس نے بھی پتلون پہننا شروع کر دی جو اس کے چوتڑوں میں بہت پھنس کر آتی تھی..... اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ”مزگاؤں“ والی دکھشنی چھوکری صرف اس لئے کالج کے خوبصورت لونڈوں کو پھانستی ہے کہ اسے ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کا شوق ہے..... اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ کبھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکے گی اس لئے کہ بانجھ ہے..... اور اس کالی مدراسن کی بابت جو ہر وقت کانوں میں ہیرے کی ”بوٹیاں“ پہنے رہتی تھی۔ اس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کا رنگ کبھی سفید نہیں ہوگا اور وہ ان دواؤں پر بیکار روپیہ برباد کر رہی ہے جو آئے دن خریدتی رہتی ہے۔

اس کو ان تمام چھوکریوں کا اندر باہر کا حال معلوم تھا جو اس کے حلقے میں شامل تھیں مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک روز کانتا کماری جس کا اصلی نام اتنا مشکل تھا کہ وہ عمر بھر یاد نہیں کر سکتا تھا اس کے سامنے ننگی کھڑی ہو جائے گی اور اس کو زندگی کے سب سے بڑے تعجب سے دو چار کرائے گی۔

سوچتے سوچتے اس کے منہ میں پان کی پیک اس قدر جمع ہو گئی تھی کہ اب وہ مشکل سے چھالیا کے ان ننھے ننھے ریزوں کو چبا سکتا تھا جو اس کے دانتوں کی ریخوں میں سے ادھر ادھر پھسل کر نکل جاتے تھے۔

اس کے تنگ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں جیسے ململ میں پنیر کو آہستہ سے دبا دیا گیا ہے..... اس کے مردانہ وقار کو دھکا سا پہنچا تھا جب وہ کانتا کے ننگے جسم کو اپنے تصور میں لاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا ایمان ہولا ہے۔

ایک دم اس نے اپنے دل میں کہا۔ ”بھئی یہ اپمان نہیں تو کیا ہے..... یعنی ایک چھوکری ننگ دھڑنگ تمہارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے..... تم خوشیا ہی تو ہو..... خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلّا ہو گیا جو اس کے بستر پہ ہر وقت اونگھتا رہتا ہے..... اور کیا!

اب اسے یقین ہونے لگا کہ سچ مچ اس کی ہتک ہوئی ہے۔ وہ مرد تھا اور اس کو اس بات کی غیر محسوس طریق پر توقع تھی کہ عورتیں خواہ شریف ہوں یا بازاری اس کو مرد ہی سمجھیں گی اور اس کے اور اپنے درمیان وہ پردہ قائم رکھیں گی جو ایک مدت سے چلا آرہا ہے۔ وہ تو صرف یہ پتہ لگانے کے لئے کانتا کے یہاں گیا تھا کہ وہ کب مکان تبدیل کر رہی ہے۔ اور کہاں جا رہی ہے۔ کانتا کے پاس اس کا جانا یکسر بزنس سے متعلق تھا۔ اگر خوشیا کانتا کی بابت سوچتا کہ جب وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو وہ اندر کیا کر رہی ہوگی، تو اس کے تصور میں زیادہ سے زیادہ اتنی باتیں آ سکتی تھیں۔

سر پر پٹی باندھے لیٹ رہی ہوگی۔

پلنگ کے بالوں میں سے لیکھیں نکال رہی ہوگی۔

اس پوڈر سے اپنی بغلوں کے بال اڑا رہی ہوگی جو اتنی باس مارتا تھا کہ خوشیا کی ناک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پلنگ پر اکیلی بیٹھی تاش پھیلائے پیشنس کھیلنے میں مشغول ہوگی۔

بس اتنی چیزیں تھیں جو اس کے ذہن میں آتیں۔ گھر میں وہ کسی کو رکھتی نہیں تھی اسی لئے اس بات کا خیال ہی نہیں آسکتا تھا۔ پر خوشیا نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کام سے وہاں گیا تھا کہ اچانک کانتا..... یعنی کپڑے پہننے والی کانتا..... مطلب یہ کہ وہ کانتا جس کو وہ ہمیشہ کپڑوں میں دیکھا کرتا تھا اس کے سامنے بالکل ننگی کھڑی ہوگی.....

بالکل ننگی ہی سمجھو۔ کیونکہ ایک چھوٹا سا تولیہ سب کچھ تو چھپا نہیں سکتا۔ خوشیا کو یہ نظارہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے چھلکا اس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے اور کیلے کا گودا پھسل کر اس کے سامنے آگرا ہے۔ نہیں اسے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا جیسے..... جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہے۔ اگر یہ بات یہاں پر ہی ختم ہو جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ خوشیا اپنی حیرت کو کسی نہ کسی حیلے سے دور کر دیتا مگر یہاں مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ اس لونڈیا نے مسکرا کر کہا تھا..... "جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو....."

یہ بات اسے کھائے جا رہی تھی۔

"سالی مسکرا رہی تھی"..... وہ بار بار بڑبڑاتا۔ جس طرح کانتا ننگی تھی اسی طرح اس کی مسکراہٹ خوشیا کو ننگی نظر آتی تھی۔ یہ مسکراہٹ ہی نہیں اسے کانتا کا جسم بھی اس حد تک نظر آیا تھا۔ گویا اس پر رندا پھرا ہوا ہے۔

اسے بار بار بچپن کے وہ دن یاد آ رہے تھے جب پڑوس کی ایک عورت اس سے کہا کرتی تھی..... "خوشیا بیٹا! جا دوڑ کے جا، یہ بالٹی پانی سے بھر لا".... جب وہ بالٹی بھر کے لایا کرتا تھا تو وہ دھوتی سے بنائے ہوئے پردے کے پیچھے سے کہا کرتی تھی..... 'اندر آکے، یہاں میرے پاس رکھ دے۔ میں نے منہ پر صابن ملا ہوا ہے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا'..... وہ دھوتی کا پردہ ہٹا کر بالٹی اس کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ اس وقت صابن کے جھاگ میں لپٹی ہوئی وہ ننگی عورت اسے نظر آیا کرتی تھی مگر اس کے دل میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"بھئی۔ میں اس وقت بچہ تھا۔ بالکل بھولا بھالا۔ بچے اور مرد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بچوں سے کون پردہ کرتا ہے۔ مگر اب تو میں پورا مرد ہوں۔ میری عمر اس وقت اٹھائیس برس کے قریب ہے اور اٹھائیس برس کے جوان آدمی کے سامنے تو کوئی بوڑھی عورت بھی ننگی کھڑی نہیں ہوتی"۔

کانتا نے اسے کیا سمجھا تھا..... کیا اس میں وہ تمام باتیں نہیں تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کانتا کو یک بیک ننگ دھڑنگ دیکھ کر بہت گھبرا گیا تھا لیکن چور نگاہوں سے کیا اس نے کانتا کی ان چیزوں کا جائزہ نہیں لیا تھا جو روزانہ استعمال کے باوجود اصلی حالت میں قائم تھیں اور کیا تعجب کہ مرد ہوتے ہوئے اس کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دس روپے میں کانتا بالکل مہنگی نہیں اور دسہرے کے روز بنک کا وہ منشی جو دو روپے کی رعایت نہ

ملنے پر واپس چلا گیا تھا بالکل گدھا تھا وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے سب کے اوپر ، کیا ، ایک لمحے کے لئے اس کے تمام پٹھوں میں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ پیدا نہیں ہو گیا تھا اور اس نے ایک ایسی انگڑائی نہیں لینا چاہی تھی جس سے اس کی ہڈیاں تک چٹخنے لگیں۔ پھر کیا وجہ تھی کہ منگلور کی اس سانولی چھوکری نے اس کو مرد نہ سمجھا اور صرف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف خوشیا سمجھ کر اس کو اپنا سب کچھ یوں دیکھنے دیا ؟

اس نے غصے میں آکر پان کی گاڑھی پیک تھوک دی جس نے فٹ پاتھ پر کئی بیل بوٹے بنا دیئے۔ پیک تھوک کر وہ اٹھا اور ٹرام میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

گھر میں اس نے نہا دھو کر نئی دھوتی پہنی ۔ جس بلڈنگ میں رہتا تھا اس کی ایک دکان میں سیلون تھا۔ اس کے اندر جا کر اس نے آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کی ۔ پھر فوراً ہی کچھ خیال آیا تو کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی سنجیدگی سے اس نے داڑھی مونڈنے کے لئے حجام سے کہا۔ آج چونکہ دوسری مرتبہ وہ داڑھی منڈوا رہا تھا اس لئے حجام نے کہا: "ارے بھئی خوشیا! بھول گئے کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صبح ہی تو میں نے تمہاری داڑھی مونڈی تھی"۔

اس پر خوشیا نے بڑی متانت سے داڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "کھونٹی اچھی طرح نہیں نکلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اچھی کھونٹی نکلوا کر اور چہرے پر پوڈر ملوا کر وہ سیلون سے باہر نکلا۔ سامنے ٹیکسیوں کا اڈہ تھا۔ بمبئے کے مخصوص انداز میں اس نے "چھی چھی" کر کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انگلی سے اسے ٹیکسی لانے کیلئے کہا۔

جب وہ ٹیکسی پر بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے مڑ کر اس سے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے صاحب!"

ان چار لفظوں نے اور خاص طور پر "صاحب" نے خوشیا کو بہت مسرور کیا۔ مسکرا کر اس نے بڑے دوستانہ لہجہ میں جواب دیا: "بتائیں گے پہلے تم پسیرا ہاوس کی طرف چلو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیمنگٹن روڈ میں سے ہوتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سمجھے"۔

ڈرائیور نے میٹر کی لال جھنڈی کا سر نیچے کی طرف دبا دیا۔ ٹن ٹن ہوئی اور ٹیکسی نے لیمنگٹن روڈ کا رخ کیا۔ لیمنگٹن روڈ کا جب آخری سرا آ گیا تو خوشیا نے ڈرائیور کو ہدایت دی:

"بائیں طرف موڑ لو"۔

ٹیکسی بائیں ہاتھ مڑ گئی۔ ابھی ڈرائیور نے گیئر بھی نہ بدلا تھا کہ خوشیا نے کہا: "یہ سامنے والے کھمبے کے پاس روک لینا ذرا" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈرائیور نے عین کھمبے کے پاس ٹیکسی کھڑی کر دی۔ خوشیا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ایک پان والے کی دکان کی طرف بڑھا۔ یہاں سے اس نے ایک پان لیا اور اس آدمی سے جو کہ دکان کے پاس کھڑا تھا چند باتیں کیں اور اسے اپنے ساتھ ٹیکسی پر بٹھا کر ڈرائیور سے کہا: "سیدھے لے چلو"۔

دیر تک ٹیکسی چلتی رہی۔ خوشیا نے جدھر اشارہ کیا ڈرائیور نے ادھر ہینڈل پھیر دیا۔ مختلف پر رونق بازاروں میں سے ہوتے ہوئے ٹیکسی ایک نیم روشن گلی میں داخل ہوئی جس میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ کچھ لوگ سڑک پر بستر جمائے لیٹے تھے۔ ان میں سے کچھ بڑے اطمینان سے چمپی کرا رہے تھے۔ جب ٹیکسی ان چمپی کرانے والوں کے آگے نکل گئی اور ایک کاٹھ کے بنگلہ نما مکان کے پاس پہنچی تو خوشیا نے ڈرائیور کو کہا: "بس اب یہاں رک جاؤ"۔

ٹیکسی ٹھہر گئی تو خوشیا نے اس آدمی سے جس کو وہ پان والے کی دکان سے اپنے ساتھ لایا تھا، آہستہ سے کہا:

"جاؤ۔ میں یہاں انتظار کرتا ہوں"۔

وہ آدمی بے وقوفوں کی طرح خوشیا کی طرف دیکھتا ہوا ٹیکسی سے باہر نکلا اور سامنے والے چوبی مکان میں داخل ہو گیا۔ خوشیا جم کر ٹیکسی کے گدے پر بیٹھ گیا۔ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ایک دو کش لے کر باہر سڑک پر پھینک دی۔ وہ بہت مضطرب تھا اس لئے اسے ایسا لگا کہ ٹیکسی کا انجن بند نہیں ہوا۔ اسکے سینے میں چونکہ پھڑپھڑاہٹ سی ہو رہی تھی اس لئے وہ سمجھا کہ ڈرائیور نے بل بڑھانے کی غرض سے پٹرول چھوڑ رکھا ہے چنانچہ اس نے تیزی سے کہا:

"یوں بے کار انجن چالو رکھ کر تم کتنے پیسے اور بڑھا لوگے"۔

ڈرائیور نے مڑ کر خوشیا کی طرف دیکھا اور کہا: "سیٹھ۔ انجن تو بند ہے"۔

جب خوشیا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس کا اضطراب۔ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیئے۔ پھر ایکا ایکی سر پر وہ کشتی نما ٹوپی پہن کر، جواب تک اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اس نے ڈرائیور کا شانہ ہلایا اور کہا: "دیکھو ابھی ایک چھوکری آئے گی۔ جونہی اندر داخل ہو تم موٹر چلا دینا سمجھے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ معاملہ ایسا ویسا نہیں ہے"۔

اتنے میں سامنے چوبی مکان سے دو آدمی باہر نکلے۔ آگے آگے خوشیا کا دوست تھا اور اس کے پیچھے پیچھے کانتا جس نے شوخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

خوشیا جھٹ سے اس طرف کو سرک گیا جدھر اندھیرا تھا۔ خوشیا کے دوست نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور کانتا کو اندر داخل کر کے دروازہ بند کر دیا۔

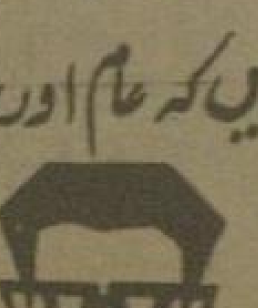
فوراً ہی کانتا کی حیرت بھری آواز سنائی دی جو چیخ سے ملتی جلتی تھی: "خوشیا! تم!!"

"ہاں میں۔ لیکن تمہیں روپے مل گئے ہیں ناں!" خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی۔ "دیکھو ڈرائیور۔ جوہو لے چلو"۔

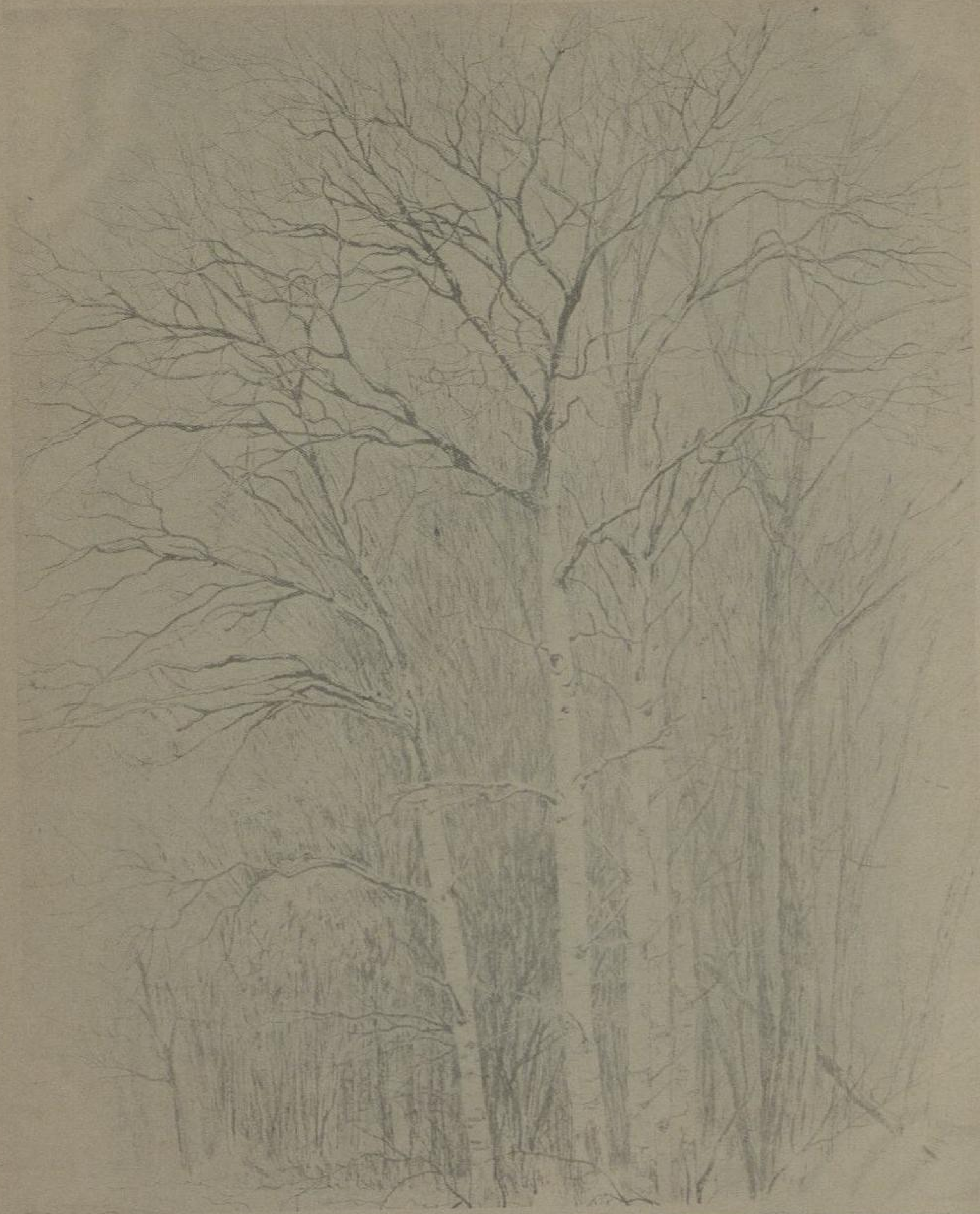
ڈرائیور نے سلف دبایا۔ انجن پھڑپھڑانا شروع ہوا۔ وہ بات جو کانتا نے کہی، سنائی نہ دے سکی۔ ٹیکسی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھی اور خوشیا کے دوست کو سڑک کے بیچ حیرت زدہ چھوڑ کر اس نیم روشن گلی میں غائب ہو گئی۔

اس کے بعد کسی نے خوشیا کو موٹروں کی دکان کے سنگین چبوترے پر نہیں دیکھا۔

منٹو کی حقیقت نگاری، اس کے اسلوب کی برہنگی کی حد تک پہنچی ہوئی کفایت شعاری، زبان کا صاف شفاف استعمال، کہانی میں غیر ضروری تفصیلات سے گریز، فنکارانہ شخصیت کی جلوہ فروشیوں سے اجتناب، یہ سب مل جل کر ایک ایسی پُر فریب فضا قائم کرتے ہیں کہ عام اور خاص تمام قسم کے قاری یہی محسوس کرتے ہیں کہ منٹو اچھا افسانہ نگار ہے۔



وارث علوی





دھواں





دھواں

وہ جب اسکول روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا اس میں دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اٹھ رہا تھا جگہ جگہ پر۔ یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں۔ پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے سردی میں شدت نہیں تھی۔ لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ویسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آوازیں مدھم تھیں۔ جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں چپکے چپکے دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں۔ ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اجلا پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ

کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے۔ کچھ آرہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ اس لیے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت، اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آکر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ —— یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ سب بیتی ہوئی باتیں یاد آگئیں اور اس نے سوچا جب سکتر صاحب کا جنازہ اٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبلا اٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنی کلاس کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈیسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں۔ اس میں رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دکان پر سے گذرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا چھو کر دیکھے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے اباجی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن، ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے۔ وہ گھر میں اپنے اباجی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لُوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سناتا رہا۔ جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید دھواں اٹھنے لگا اس دھواں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا۔ امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ کھال اتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھوآں نکل رہا تھا۔ بالکل ایسا ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔

اچھا ——! یہ کہہ کر اس کی ماں چولہے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

"ہاں! اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔"

اچھا ——!" یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا۔ اور باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

"اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا۔"

"اچھا ——" مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی "کیسے پھڑکتا تھا؟"

"یوں ——یوں" مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

"پھر کیا ہوا؟"

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لمحے کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ "پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔"

"گرم تھا —— اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے۔"

"بتائیے۔"

"آؤ میرے ساتھ آؤ۔"

"نہیں آپ پہلے بتلائیے۔ کام کیا ہے۔"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔"

جی نہیں —— آپ پہلے کام بتلائیے۔"

"دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے —— میں پلنگ پر لیٹتی ہوں۔ تم ذرا پاؤں سے دبا دینا —— اچھے بھائی جو ہوئے۔ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے" یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے جب دیکھو درد ہو رہا ہے، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں۔ کیوں نہیں

اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔" مسعود اٹھ کھڑا ہوا اور راضی ہو گیا۔

"چلیئے، لیکن آپ سے یہ کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔"

"شاباش، شاباش۔" اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی۔ جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے۔ "مسعود آج ضرور بارش ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ "دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔"

"بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لیے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ ادھر میرے پلنگ پر آکر جلدی کمر دباؤ۔ ورنہ یاد رکھو۔ بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔" کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔ مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں، تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کیے۔ جن کا کوئی سر تھا نہ پیر، وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جب کہ کوئی خیال مکمل ہی نہ تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے ۔ ہی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی بد دلی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھینچی بھینچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے۔ مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔ "شاباش مسعود، شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو۔ بالکل اسی طرح —— شاباش میرے بھائی ——"

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا۔ تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دوہری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا۔ لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی وہ

تڑپ منجمد سی ہوگئی۔ اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے، چنانچہ اس نے کہا۔ "یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا سیدھی لیٹ جایئے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں ادھر ادھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی۔ اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔ "نا بھائی میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم وحشیوں کی طرح دباتے ہو۔"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے "نہیں، اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا ——— آپ اطمینان رکھیے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسّے پر ایک بازی گر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازی گر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسّا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟" لیکن ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

"بس بس" کلثوم تھک گئی۔ "بس بس"

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی اس میں آتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے بادل اور بھی جھک آئے تھے پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کیے۔ بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے مسعود کا جسم ایک دل نواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور ناز بو کے ہرے ہرے پتے اُوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان

کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے۔ اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی۔ مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لیے وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا۔ باپ، بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کیساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ کیوں کہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اُوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی ہی گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی دکھن پیدا ہو گئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزا آیا۔ اس کے جسم کے کسی حصے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی۔ اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانے سے ہوتا ہوا صحن میں آ نکلا۔ کوئی باورچی خانے میں تھا، نہ صحن میں۔ ادھر ادھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رک گئی تھی مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی: "کون؟"

"جی میں ہوں مسعود!"

اندر سے آواز آئی: "کیا کر رہے ہو؟"

"جی کھیل رہا ہوں۔"

"کھیلو..... پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا۔

"تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے ــــــ زیادہ شور نہ مچانا۔"

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لیے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم باز ــــــ مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم باز دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس لیٹی تھی۔ خوف زدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کے دماغ پر دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اُسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا۔ جس نے کچھ دیر کے لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کرسی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر ہی ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا۔ اور زیادہ زور لگانے پر تو ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب تھک کر ہار گیا تو جھنجھلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

تقسیم کے بعد مجھے اکثر منٹو سے ملنے اور اس کے افسانے اسی کی زبانی سننے کا موقع ملا۔ اسی قسم کی ایک صحبت میں منٹو نے ایک افسانہ پڑھا۔ افسانے میں ایک اجڈ سپاہی کا کردار تھا جو بلت بات پر گالی بکتا اور اکثر گالیاں خاصی مغلظات تھیں۔ لوگ منٹو پر برس پڑے۔ اس نے بار بار سمجھانے کی کوشش کی۔ "گالی منٹو نے نہیں بکی۔ اس سپاہی نے بکی ہے۔ یہ جہاں آپ کو ملنے لگے آپ اس کی تواضع کریں۔ منٹو نے تو صرف اسے اپنے افسانے میں پیش کر دیا ہے۔ اس افسانے میں اور بھی کئی باتیں ہیں آپ اس گالی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھنے اور سننے کے لئے آمادہ نہیں۔ آپ کا جی چاہے آپ گالی دے لیں لیکن افسانے کو ضرور سمجھنے کی کوشش کریں" —— میں سمجھتا ہوں منٹو نے ٹھیک کہا تھا۔ بلاشبہ اس کے بعض افسانوں کے موضوع ایسے جنسی مسائل ہیں جو ہمارے ادب اور معاشرے میں ابھی "ممنوعات" ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ بعض افسانوں میں محض لذت لینے کی خاطر ایسے مسائل کی تشریح، ایسی تشبیہیں، استعارے اور کنائے ملتے ہیں جن کا مقصد محض آتشِ شوق کو بھڑکانا اور بھڑکتے شعلوں سے اس آگ کو پھیلانا ہوتا ہے۔ کہیں وہ جزیات نگاری میں ایسا عملِ جراحی کرنے لگتا ہے جیسے کوئی سرجن ہو لیکن یہ عملِ جراحی کسی ہسپتال کے آپریشن تھیٹر میں ہو تو کوئی حرج نہیں۔ منٹو اسے شارع عام پر کرنے لگتا ہے۔ کہیں منٹو علاج بالمثل اور کہیں علاج بالضد کا قائل معلوم ہوتا ہے۔ وہ زہر کا علاج زہر سے کرنا چاہتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ زہر سے زہر کا علاج نہ ہر طبیب کے بس کا ہے اور نہ ہر مریض پر آزمایا جا سکتا ہے اور منٹو جیسے شرابی کے لئے ان حدود کا لحاظ رکھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے علاوہ منٹو کے یہاں کچھ اور بھی ہے اور اسی "کچھ اور" نے منٹو کو بحیثیت انسان نہ سہی بحیثیت افسانہ نگار ایک مرتبہ بخشا ہے۔



ابواللیث صدیقی



اللہ کا بڑا فضل ہے

اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان —— ایک وہ زمانۂ جہالت تھا کہ جگہ جگہ کچہریاں تھیں۔ ہائی کورٹیں تھیں۔ تھانے تھے چوکیاں تھیں۔ جیل خانے تھے، قیدیوں سے بھرے ہوئے۔ کلب تھے جن میں جوا چلتا تھا۔ شراب اڑتی تھی۔ ناچ گھر تھے، سینما تھے۔ آرٹ گیلریاں تھیں اور کیا کیا خرافات نہ تھی ...... اب تو اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان۔ کوئی شاعر دیکھنے میں آتا ہے نہ موسیقار —— لاحول ولا۔ یہ موسیقی بھی ایک لعنتوں کی لعنت تھی...... یعنی آخر گانا بھی انسانوں کا کام ہے ...... تنبورہ لے کر بیٹھے ہیں اور گلا پھاڑ رہے ہیں۔ صاحب، کیا گا رہے ہیں، درباری کا نہرہ، مالکونس، میاں کی ٹوڈی، اڈانہ اور جانے کیا کیا بکواس ...... کوئی ان سے پوچھے کہ جناب آخر ان راگ راگنیوں سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ آپ کوئی ایسا کام کیجئے جس سے آپ کی عاقبت سنورے۔ آپ کو کچھ ثواب پہنچے۔ قبر کا عذاب کم ہو۔

اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان —— موسیقی کے علاوہ اور جتنی لعنتیں تھیں ان کا اب نام و نشان تک نہیں اور خدا نے چاہا تو آہستہ آہستہ یہ زندگی کی لعنت بھی دور ہو جائے گی۔

میں نے شاعر کا ذکر کیا تھا...... عجیب و غریب چیز تھی یہ بھی...... خدا کا خیال نہ آ سکے رسول کی فکر نہ ہو بس معشوقوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ کوئی ریحانہ کے گیت گا رہا ہے کوئی سلمیٰ کے ...... لاحول ولا، زلفوں کی تعریف ہو رہی ہے کبھی گالوں کی...... وصل کے خواب دیکھے جا رہے ہیں...... کتنے گندے خیالات کے تھے یہ لوگ، ہائے عورت وائے عورت...... لیکن اب اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان اوّل تو عورتیں ہی کم ہو گئی ہیں اور جو ہیں پڑی گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہیں...... جب سے یہ خطۂ زمین شاعروں کے وجود سے پاک ہوا ہے فضا بالکل صاف اور شفاف ہو گئی ہے۔

میں نے آپ کو بتایا نہیں۔ شاعری کے آخری دور میں کچھ شاعر ایسے بھی پیدا ہو گئے تھے جو معشوقوں کے بجائے مزدوروں پر شعر کہتے تھے۔ زلفوں اور عارضوں کی جگہ ہتھوڑوں اور درانتیوں کی تعریف کرتے تھے —— اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان کہ ان مزدوروں سے نجات ملی۔ کمبخت انقلاب چاہتے تھے۔ سنا آپ نے؟ تختہ الٹنا چاہتے تھے حکومت کا، نظامِ معاشرت کا، سرمایہ داری کا اور نعوذ باللہ مذہب کا۔

اللہ کا بڑا فضل ہے کہ ان شیطانوں سے ہم انسانوں کو نجات ملی۔ عوام بہت گمراہ ہو گئے تھے۔ اپنے حقوق کا ناجائز

مطالبہ کرنے گئے تھے۔ جھنڈے ہاتھ میں لے کر لادینی کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے ـــــ خدا کا شکر ہے کہ اب ان میں سے ایک بھی ہمارے درمیان موجود نہیں اور لاکھ لاکھ شکر ہے پروردگار کا اب ہم پر ملاؤں کی حکومت ہے اور ہر جمعرات ہم حلوے سے ان کی ضیافت کرتے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس زمانے میں حلوے کا نام و نشان تک اڑ گیا تھا ـــــ مسجدوں میں حجروں کے اندر بے چارے مُلّا، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، پڑے حلوے کو ترستے تھے۔ ان کی لمبی لمبی نورانی داڑھیوں کا ایک ایک بال شیطانی استروں کی موت کی دعائیں مانگتا تھا۔ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ یہ دعائیں قبول ہوئیں۔ اب آپ اس کونے سے اُس کونے تک چلے جایئے ساری دکانیں چھان ماریئے، ایک اُسترہ بھی آپ کو نہیں ملے گا ما البتہ حلوہ جو کہ ہمارے رہنما ملّاؤں کی مذہبی خوراک ہے آپ کو اب ہر جگہ اور ہر مقدار میں دستیاب ہو سکتا ہے۔

اللہ کا بڑا فضل ہے...... اب کوئی ٹھمری دادرا نہیں گاتا۔ فلمی دھنیں بھی مر کھپ گئی ہیں۔ موسیقی کا ایسا جنازہ نکلا ہے اور اس طور پر اسے زمین میں دفن کیا گیا ہے کہ اب کوئی مسیحا اسے دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ کتنی بڑی لعنت تھی یہ موسیقی۔ لوگ کہتے تھے آرٹ ہے۔ کیسا آرٹ، کہاں کا آرٹ۔ یہ بھی کوئی آرٹ ہے کہ آپ نے کوئی گانا سنا اور دنیا کے دکھ تھوڑی دیر کے لئے بھول گئے۔ کوئی گیت سنا اور دل آپ کا بلّیوں اچھلنے لگا ـــــ حسن و عشق کی دنیا میں جا پہنچے ـــــ لاحول ولا۔ آرٹ کبھی ایسا گمراہ کن نہیں ہو سکتا۔ "گھونگھٹ کے پٹ کھول ـــــ پائل باجی چھنن چھنن ـــــ بابل بنہر مورا چھوٹو جائے ـــــ رتیاں کہاں گوائیں رے"...... کوئی شرافت ہے ان بولوں میں ـــــ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اب ایسی خرافات موجود نہیں۔ الحمد للہ قوالی ہے۔ سنیئے اور سر دھنیئے۔ حال کھیلئے، ہُو حق کے نعرے لگایئے اور ثواب حاصل کیجئے۔

مصوری بھی کچھ کم لعنت نہیں تھی۔ تصویریں بنتی تھیں برہنہ نیم برہنہ۔ مصور اپنی پوری قوتِ تصور حسن کو تخلیق کرنے میں صرف کر دیتے تھے۔ لیکن یہ کفر تھا۔ تخلیق صرف خدا کا کام ہے۔ اس کے بندوں کا نہیں اور پھر حسن کی تخلیق، یہ تو گناہِ کبیرہ تھا۔ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ ہمارے درمیان آج ایک بھی مصور موجود نہیں۔ جو تھے ان کی انگلیاں قلم کر دی گئیں تاکہ وہ اپنی شیطانی حرکت سے باز رہیں۔ اب یہ عالم ہے کہ اس سرزمین پر آپ کو ایک سیدھی لکیر بھی کہیں دیکھنے میں نہیں ملے گی۔ ایک آدمی بھی ایسا موجود نہیں جو غروبِ آفتاب کے حسین منظر کو دیکھ کر اٹھے اور اسے کاغذ یا کپڑے پر منتقل کرنے کا خیال اپنے دل و دماغ میں لائے۔ سچ پوچھئے تو اب وہ خوفناک حِس ہی مٹ چکی ہے جسے طلبِ حسن کہتے ہیں۔ تخلیقِ حسن کی بات تو الگ رہی۔

ننگی عورتوں کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ ننگی عورتوں کے مجسمے تراشے جاتے تھے۔ اسی پر موقوف نہیں۔ ان کو بڑے پیار سے عجائب خانوں میں سجایا جاتا تھا۔ ان کے بنانے والوں کو انعام و اکرام دیئے جاتے تھے ـــــ جی ہاں، انعام و اکرام۔ وظیفے دیئے جاتے تھے۔ القاب عنایت کئے جاتے تھے کہ واہ مصور صاحب۔ آپ نے ننگی عورت کی تصویر کیا خوب کھینچی ہے ...... یہ پستان...... لاحول ولا؛ میں نے کس چیز کا نام لے لیا۔ معاف کیجئے میں ابھی حاضر ہوا...... ذرا کلمہ

کر آؤں.......

کلی کر آیا لیکن منہ کا ذائقہ ابھی تک خراب ہے۔ معاف کر دیجئے گا مجھے سہواً میرے منہ سے ایک غلیظ چیز کا نام نکل گیا۔ لیکن آپ تو اس کا مطلب نہیں سمجھے ہوں گے کیونکہ جتنے گندے اور خراب لفظ تھے سب کے سب لغات میں سے نکال دیئے گئے ہیں۔

میں کیا عرض کر رہا تھا — جی ہاں — اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اب کوئی ایسا عجائب خانہ موجود نہیں جہاں ننگی تصویریں یا صرف تصویریں جنہیں آرٹ کا نمونہ کہا جاتا تھا، دیکھنے میں آئیں، ایسے جتنے عجائب خانے تھے ان کو فوراً ہی ڈھا دیا گیا اور ملبہ دریاؤں میں ڈال دیا گیا تاکہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

عریانی کی وبا صرف تصویروں اور مجسموں ہی تک محدود نہ تھی...... شعروں اور افسانوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ غزل اور وہ افسانہ بہت کامیاب متصور کیا جاتا تھا جس میں عورت اور مرد کے جسمانی رشتے پر بحث کی گئی ہو۔ کس قدر مریضانہ ذہنیت کے تھے وہ لوگ — روحانیت کے بارے میں کبھی کچھ سوچتے ہی نہیں تھے۔ زمین کی باتیں کرتے تھے۔ اوپر سات آسمان پڑے ہیں۔ اس کا علم ہی نہیں تھا ان کو — جسم کی بھوک کا سوچتے تھے۔ روح کی بھوک کیا ہوتی ہے ان کے فلک کو بھی اس کا پتہ نہیں تھا — اللہ کا بڑا فضل ہے کہ جسم کی بھوک اب بالکل مٹ چکی ہے... اور اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو صرف روح ہی روح رہ جائے گی اور ہم فانی انسانوں کا جسم سرے سے غائب ہی ہو جائے گا — خس کم جہاں پاک!

کوئی زمانہ تھا کہ سینکڑوں پرچے ادب کے نام پر شائع ہوتے تھے۔ ان میں لوگوں کا اخلاق بگاڑنے والی ہزاروں تحریریں آئے دن چھپتی تھیں — سمجھ میں نہیں آتا یہ ادب کیا بلا تھی۔ ادب آداب سکھانے کی کوئی چیز ہوتی تو ٹھیک تھا۔ جو کہانیاں، افسانے، مضمون، نظمیں، غزلیں ادب کا نام لے کر چھاپی جاتی تھیں ان میں نہ تو چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ کرنے کی تعلیم دی جاتی تھی اور نہ مغرب زدہ لوگوں کو ڈھیلا لگانے کی ترکیب ہی بتائی جاتی تھی۔ یہ تو ایک بہت بڑا پاکیزہ فن ہے کہ آتے آتے ہی آتا ہے لیکن اتنا بھی نہ تھا کہ عوام کو داڑھی رکھنے اور لبیں کتروانے کی طرف مائل کیا جاتا۔

ادب ان نااہل ہاتھوں میں بس یہ رہ گیا تھا — عورت اور مرد کے جنسی مسائل — لاحول ولا قوۃ۔ انسان کی نفسیات نعوذ باللہ۔ یعنی ہم فانی انسانوں کی غیر فانی روح تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ حسن و عشق کی داستانیں، خوبصورت مناظر کی تعریفیں، بڑے ہی خوشنما الفاظ میں — کوئی شام اودھ کی مدح سرائی کر رہا ہے کوئی صبح بنارس کی۔ تو س قزح کے رنگوں کو کاغذ پر اتارتا جا رہا ہے۔ پھولوں، بلبلوں، کوئلوں اور چڑیوں پر ہزاروں صفحے کالے کئے جا رہے ہیں، لیکن صاحبان، سوال تو یہ ہے — تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔

اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اب کوئی پھول رہا ہے نہ بلبل — پھولوں کا ناس مارا گیا ہے تو بلبلیں خود بخود دفعان ہو گئیں — اسی طرح اور بہت سی واہیات چیزیں آہستہ آہستہ اس سرزمین سے جہاں ان کے سینگ سمائے، چلی گئی ہیں۔

میں ادب کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ ہاں صاحب میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں آخر میں ادب کی ایک بالکل ہی نئی قسم پیدا ہو

گئی تھی ___ اس وقت لوگ کہتے تھے یہ حقیقی ادب ہے۔ یعنی جو کچھ ہم دیکھتے ہیں بیان کر دیتے ہیں ___ غضب خدا کا ...... خود غور فرمائیے اگر آپ کو اس وقت خدانخواستہ چھینک آجائے تو مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اس افسوس ناک واقعے کو قلمبند کروں۔ اور پھر ادب کے نام سے اسے دو مردوں کے سامنے پیش کروں۔ چھینک آنا تھی، آ گئی۔ اب اس حادثے کی تفصیلات میں جانے کی کیا ضرورت ہے ___ اول تو یہ بات ہی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ چھینک کے نفسیاتی پہلو کیا ہو سکتے ہیں؟ فرمائیے ہو سکتے ہیں؟ ہر چیز اسی ذات پاک کی طرف سے آتی ہے اور اسی کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔

اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نام نہاد ادب اور ان برخود غلط ادیبوں کا اب نام و نشان نہیں رہا۔ کوئی رسالہ چھپتا ہے نہ جریدہ، صحیفہ ___ نعوذ باللہ ___ اس زمانے میں لوگوں کو اتنی جرأت تھی کہ اپنے ذلیل پرچوں کو صحیفے کہتے تھے اور خود کو صحافی کہتے تھے ...... اب تو صاحب کوئی اخبار بھی نظر نہیں آتا۔ حاکم لوگ البتہ کبھی کبھار جب ضرورت پڑے تو ہماری معلومات کے لئے چند سطریں شائع کر دیتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

اب صرف ایک اخبار حکومت کی طرف سے چھپتا ہے اور آپ جانتے ہی ہیں سال میں ایک آدھ بار جبکہ اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خبریں ہوتی ہی کہاں ہیں۔ اب کوئی ایسی بات ہونے ہی نہیں دی جاتی جو لوگ سنیں اور آپس میں چہ میگوئیاں کریں۔ وہ زمانہ تھا لوگ بیکار ہوٹلوں اور گھروں میں یہ لمبے لمبے اخبار لئے گھنٹوں بحث کر رہے ہیں۔ کون سی پارٹی برسرِ اقتدار ہونی چاہئے۔ کس لیڈر کو ووٹ دینا چاہئے۔ شہر کی صفائی کا انتظام ٹھیک نہیں۔ آرٹ سکول کھلنے چاہئیں۔ عورتوں کے مساوی حقوق کا مطالبہ درست ہے یا نادرست اور خدا معلوم کیا کیا خرافات۔

اللہ کا بڑا فضل ہے کہ ہماری دنیا ایسے ہنگاموں سے پاک ہے۔ لوگ کھاتے ہیں پیتے ہیں۔ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔ کسی کی برائی میں نہ کسی کی اچھائی میں۔

صاحبان! میں سائنس کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا ___ یہ ادب کی بھی خالہ تھی۔ خدا محفوظ رکھے اس بلا سے۔ نعوذ باللہ۔ اس فانی دنیا کو جنت بنانے کی فکر میں تھے۔ یہ لوگ جو خود کو سائنسدان کہتے تھے۔ ملعون کہیں کے۔ خدا کے مقابلے میں تخلیق کے دعوے باندھتے تھے۔ ہم مصنوعی سورج بنائیں گے جو رات کو تمام دنیا روشن کر دے گا۔ ہم جب چاہیں گے بادلوں سے بارش وہ لیا کریں گے ___ ذرا غور فرمائیے۔ نمرود کی خدائی تھی، جی اور کیا؟ سرطان جیسی لاعلاج اور مہلک بیماری کا علاج ڈھونڈا جا رہا ہے یعنی ملک الموت کے ساتھ پنجہ لڑانے کی سعی فرمائی جا رہی ہے۔ ایک صاحب ہیں وہ دوربین لئے بیٹھے ہیں اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ چاند تک پہنچ جائیں گے۔ ایک مرے ہوئے بوتلوں اور مرتبانوں میں بچے پیدا کر رہے ہیں۔ خدا کا خوف ہی نہیں رہا تھا پاجیوں کو .... اللہ کا بڑا فضل ہے کہ یہ سب شیطان ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔

اب چاروں طرف سکون ہے۔ کوئی ہنگامہ نہیں کوئی واردات نہیں۔ کوئی شاعر نہیں کوئی مصور نہیں۔ زندگی یوں گزر رہی ہے جیسے گزر رہی نہیں رہی۔ قلب کے لئے یہ کتنی اطمینان دہ چیز ہے۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں مر جاتے ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ زندگی سے لے کر موت تک ایک بے آواز، صاف شفاف دھارا بہا چلا جا رہا ہے۔ کوئی بھنور ہے نہ بلبلہ۔

لوگ دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر لمبی تانے سو رہے ہیں اور کیوں صاحبان! کیا جی نہیں چاہتا کہ اسی طرح سوئے رہیں جتنی کہ جنت میں دودھ کی نہروں کے کنارے ہماری آنکھیں کھلیں ـــــ اوپر دیکھیں تو انگور کے خوشے جھک کر ہمارے منہ میں آجائیں اور ہم پھر سو جائیں۔

....

یہ...... یہ اخبار کہاں سے آیا؟ ـــــ اوہ ہم سو گئے تھے...... سرکاری ڈاکیہ پھینک گیا ہوگا ـــــ بڑی دیر کے بعد آیا ہے یہ پرچہ...... دیکھیں کیا لکھا ہے...... وہ زمانہ بُرا تھا صاحبان لیکن ایک بات تھی۔ سنا ہے کہ اخباروں کی لکھائی چھپائی بہت ہی خوبصورت ہوتی تھی ـــــ لیکن خوبصورتی کا کیا ہے...... معاذ اللہ ...... یہ کیا؟

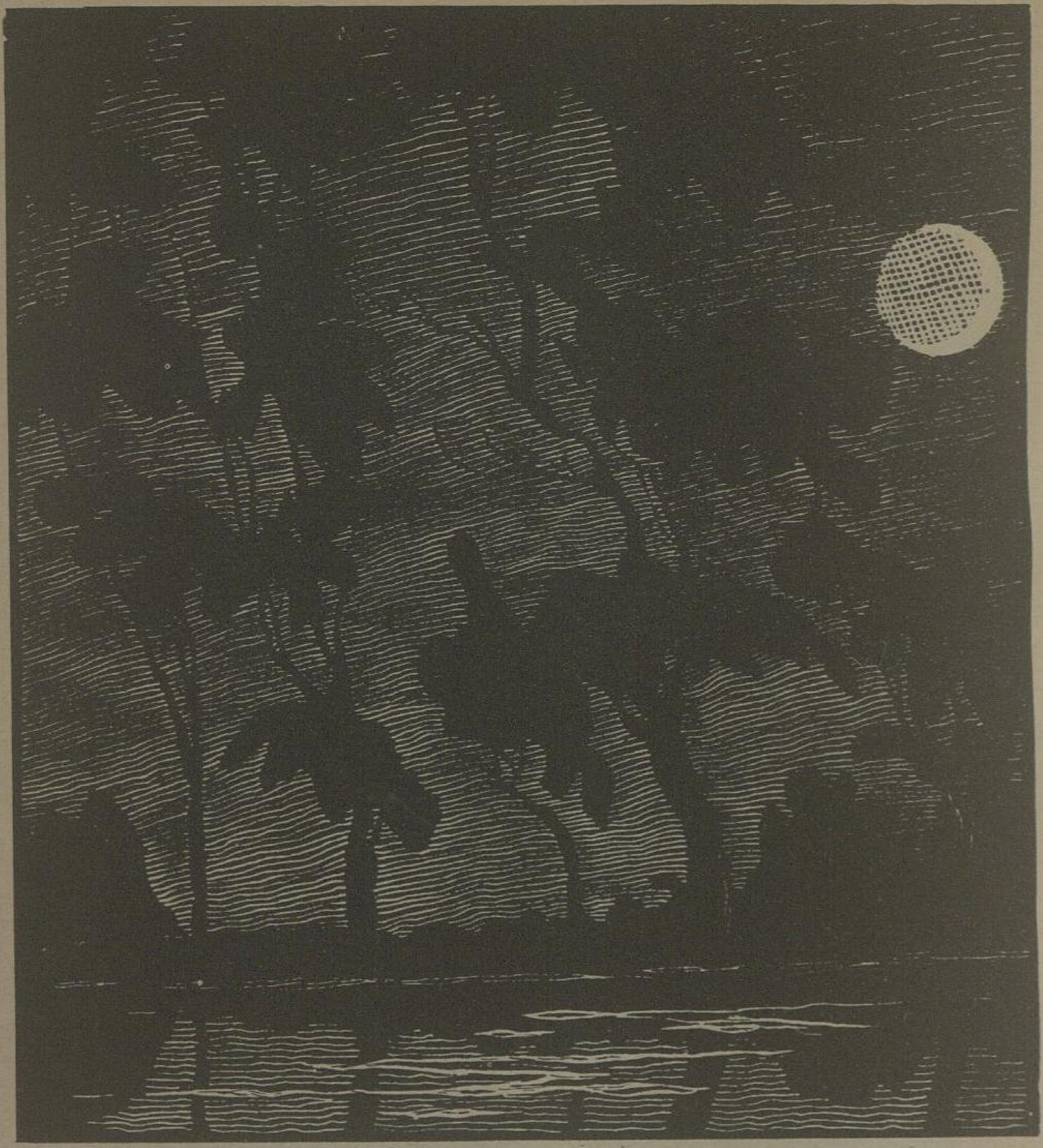
ٹھہریئے ٹھہریئے ـــــ لیکن میری نظریں دھوکا تو نہیں دے رہیں؟ جی نہیں صاف پڑھا جا رہا ہے ـــــ حکومت شش و پنج میں ـــــ مملکت میں ایک آدمی گرفتار کیا گیا ہے...... گرفتار؟ ـــــ گرفتار کیا گیا ہے؟ ـــــ الزام یہ ہے کہ وہ گلی گلی اور کوچے کوچے یہ شور مچاتا پھرتا تھا کہ میں اس مملکت میں نہیں رہنا چاہتا جہاں خدا تو ہے پر شیطان نہیں ہے...... نعوذ باللہ...... نامہ نگارِ خصوصی کا بیان ہے کہ جب ملزم حکامِ بالا کے حضور پیش کیا گیا تو اس نے چلّانا شروع کر دیا ـــــ "یہاں جلدی شیطان بلاؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا" ـــــ نامہ نگارِ خصوصی یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ملزم نے اپنی صفائی میں یہ انکشاف کیا کہ اس کے قبضے میں حضرتِ علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ کا شعر موجود ہے۔ شعر فارسی زبان کا ہے جسے ہم یہاں درج کرتے ہیں ؎

مزی اندر جہانِ کور ذوقے ـــــ کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

لیکن یہ شعر علامہ مرحوم کے مطبوعہ کلام میں کہیں بھی موجود نہیں۔ حالانکہ وہ حکومت کی نگرانی میں چھاپا جاتا رہا ہے ـــــ بالکل درست ہے ـــــ

ملزم خریدا چال بازی کر رہا ہے...... آگے کیا لکھا ہے ـــــ جی میں پڑھتا ہوں ـــــ الزام کی نوعیت بہت سخت ہے لیکن حکومت سخت شش و پنج میں ہے کہ ملزم پر مقدمہ کیسے چلائے کیونکہ کوئی عدالت ہی موجود نہیں۔ مقدمے کی سماعت ہو تو سزا ملنے کی صورت میں اسے کہاں رکھا جائے کیونکہ مملکت میں ایک بھی جیل موجود نہیں... لیکن سنا ہے کہ حکومت فوراً ہی ایک حوالات، ایک جیل اور ایک عدالت تعمیر کرا رہی ہے۔

اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان کہ حکومت نے معاملے کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھ لیا ہے!

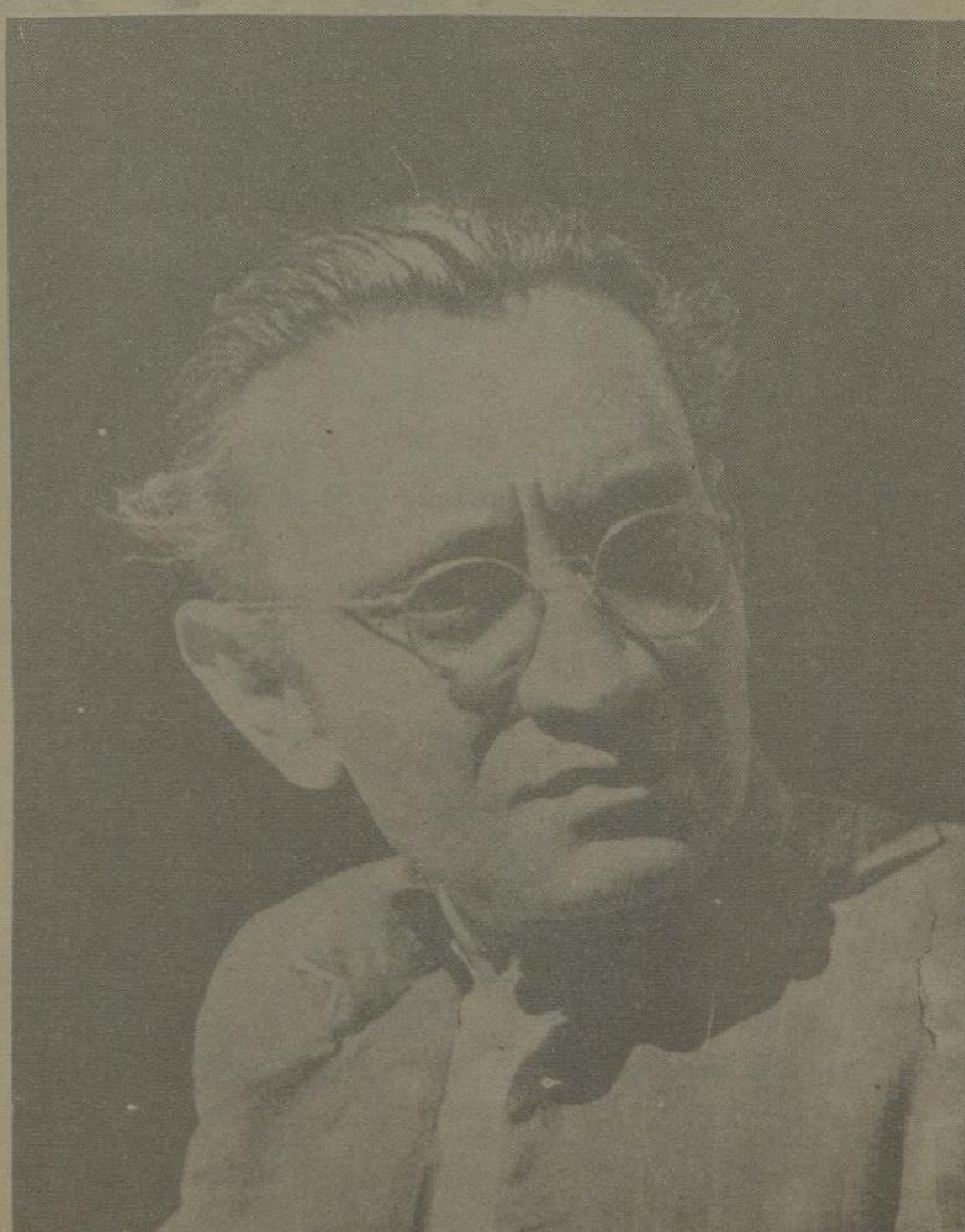


بهابا





منٹو
اور
صفیہ منٹو





پھاہا

گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ آم خوب ہُوئے تھے۔ بازاروں میں، گلیوں میں، دکانداروں کے پاس پھیری والوں کے پاس، جدھر، جدھر دیکھو، آم ہی آم نظر آتے۔ لال، پیلے، سبز رنگ برنگ کے — سبز منڈی میں لاکھوں کے حساب سے ہر قسم کے آم آئے تھے اور نہایت سستے داموں پر فروخت ہو رہے تھے۔ یُوں سمجھئے۔ کہ پچھلے برس کی کسر پوری ہو رہی تھی۔

اسکول کے باہر چھوٹو رام پھل فروش سے گوپال نے ایک روز خوب جی بھر کے آم کھائے اور جیب میں سے ایک مہینے کے بچائے ہوئے جتنے پیسے جمع تھے۔ سب کے سب ان آموں پر خرچ کر دیئے۔ جن کے گودے اور رس میں شہد گھلا ہوا تھا۔

اس روز چھٹی کے وقت آم کھانے کے بعد اُنگلیاں چاٹتے ہوئے گوپال کو اسکول کے حلوائی سے دُودھ کی لسّی پینے کا خیال آیا تھا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اُس نے گنڈا رام حلوائی سے پاؤ بھر کی لسّی بنانے کو کہا بھی تھا مگر حلوائی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا "بابو گوپال، پہلا حساب چکا دو تو اور اُدھار دوں گا، ورنہ نہیں"۔

گوپال نے اگر آم نہ کھائے ہوتے۔ یا اگر اس کی جیب میں تھوڑے بہت پیسے ہوتے تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گنڈا رام کا حساب چُکا دیتا اور کچھ نہیں تو نقد دام دے کر لسّی کا وہ گلاس لے لیتا۔ جس میں برف کا ٹکڑا ڈبکیاں لگا رہا تھا اور جسے حلوائی نے بُرا سا منہ بنا کر اپنے پیچھے لوہے کے تھال پر رکھ دیا تھا مگر گوپال کچھ بھی نہ کر سکا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھے روز اُس کی ران پر یہ بڑا سا پھوڑا نکل آیا اور تین چار روز تک ابھرتا رہا۔

گوپال کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے؟ وہ پھوڑے سے اتنا پریشان نہیں تھا جتنا اُس کے درد سے — اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ پھوڑا دن بدن لال ہوتا چلا جا رہا تھا اور اُس کے منہ پر بدن کی جھلّی پھٹنا شروع ہو گئی تھی۔ بعض اوقات گوپال کو یہ معلوم ہوتا کہ پھوڑے کے اندر کوئی ہنڈیا اُبل رہی ہے اور اُس کے اندر سب کچھ ایک ہی اُبال میں نکلنا چاہتا ہے یہ چیز اُسے بہت پریشان کر رہی تھی اور پھوڑے کی جسامت دیکھ کر ایک مرتبہ تو اُسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس کی جیب میں سے کانچ کی گولی نکل کر اُس کی ران میں گھس گئی ہے۔

گوپال نے گھر میں پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر تیاجی کو اس کا پتہ چل گیا تو وہ اپنے تھانے کی سیکھوں کا سارا غصہ اُسی پر نکالیں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ اُسے اس چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیں جو تھوڑے روز ہوتے گردھاری وکیل کے منشی نے وزیر آباد سے اُنہیں تحفے کے طور پر لا کر دی تھی۔ ماں کا مزاج بھی کم گرم نہ تھا۔ وہ اگر اُسے آم کھانے کے جُرم کی سزا نہ دیتی تو اس غلطی پر اُس کے کان کھینچ کھینچ کر ضرور لال کر دیتی کہ اُس نے گھر کے باہر اکیلے اکیلے اتنے آم کیوں اڑائے۔ اُس کی ماں کا اُصول تھا کہ "گوپال اگر تجھے زہر بھی کھانا ہو تو گھر میں کھا۔" گوپال اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اصول کے پیچھے اس کی ماں کی صرف یہ خواہش تھی کہ گوپال کے منہ کے ساتھ اُس کا مُنہ بھی چلتا رہے۔

کچھ بھی ہو، گوپال کی ران پر پھوڑا نکلنا تھا، نکل آیا۔ اس کا باعث جہاں تک گوپال سمجھ سکا تھا۔ وہی آم تھے اُس نے پھوڑے کی بابت گھر میں کسی سے ذکر نہ کیا تھا۔ اس کو اپنے تیاجی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی جو غسل خانے کے اندر پلائی گئی تھی۔ اس کے تیاجی لالہ پرشوتم داس تھانے دار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چُوس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب آم پڑے تھے جو انہوں نے صبح سویرے ایک ٹھیلے والے سے اُس کا چالان کاٹ کر حاصل کیے تھے۔ گوپال باپ کی پیٹھ مل رہا تھا اور میل کی مروڑیاں نبار رہا تھا اور جب اُس نے ہاتھ صاف کرنے کے لیے بالٹی میں ڈالے تھے اور چپکے سے ایک آم اڑانا چاہا تھا تو لالہ جی نے بڑے زور سے اُس کا ہاتھ جھٹک کر چھوٹے سے آم کو مونچھوں سمیت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا "بے شرم ---- تجھے بڑوں کا لحاظ کرنا، جانے کب آئے گا۔"

اور جب گوپال نے رونی صورت بنا کر کہا تھا "تیاجی ---- آم کھانے کو میرا بھی تو جی چاہتا ہے۔" تو تھانیدار نے آم کی گٹھلی چوس کر موری میں پھینکتے ہوئے کہا تھا "گوپو، تیرے لیے یہ آم بہت گرم تھا۔ پھوڑے پھنسیاں چاہتا ہے تو بیشک کھالے ---- دو تین بارشیں اور ہو لینے دے، پھر خوب ٹھاٹ سے کھائیو، تیری ماں سے کہوں گا۔ وہ لسی بنا دے گی ---- چل اب پیٹھ مل" اور گوپال نے یہ لگاوٹ کی بات سن کر خاموشی سے اپنے تیا کی پیٹھ ملنا شروع کر دی تھی اور آم کی کھٹاس نے جو پانی اُس کے منہ میں بھر دیا تھا اُسے دیر تک نگلتا رہا تھا۔

اس کے دوسرے روز اُس نے آم کھائے اور چوتھے روز اس کی ران پر پھوڑا ابل آیا۔ اس کے تیا کی بات سچی ثابت ہوئی۔

اب اگر گوپال گھر میں کسی سے اس پھوڑے کی بات کرتا تو ظاہر ہے کہ خوب پٹتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ خاموش رہا اور پھوڑے کا بڑھاؤ بند کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔

ایک روز اُس کے تیاجی تھانے سے واپسی پر جب گھر آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لمبی سی بتی تھی۔ گوپال کی ماں کو آواز دے کر انہوں نے یہ بتی اُس کے ہاتھ میں دے کر کہا "لے آج بڑے کام کی چیز لایا ہوں۔ بمبئی کا مرہم ہے سو دواؤں کی ایک دوا ہے ---- پھوڑے پھنسی کی بہار ہے۔ ذرا سا پچھا ہے۔ پر لیپ کر کے لگا دو گی، یوں آرام

آجائے گا —— یوں ! —— بمبئی کا "نخالص"، مرہم ہے اُسے سنبھال کے رکھ !"

گوپال اپنی بہن نرملا کے ساتھ صحن میں گیند بلا کھیل رہا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب تھانیدار جی مرہم دے کر اپنی پتنی کو کچھ سمجھا رہے تھے تو نرملا نے زور سے گیند پھینکی گوپال کا دھیان باپ کی طرف تھا۔ گیند زور سے پھوڑے پر لگی۔ گوپال بلبلا اُٹھا۔ لیکن درد کو اندر ہی اندر پی گیا۔ وہ اسکول میں ماسٹر ہری رام کے مشہور بید کی مار کھا کر درد سہنے کا عادی ہو چکا تھا۔

اُدھر گوپال کے پھوڑے پر گیند لگی۔ اِدھر اُس کے باپ کی آواز بلند ہوئی "ذرا سا پھاہے پر لیپ کر کے لگا دو گی —— یوں آرام آجائے گا —— یُوں۔" اور یوں کے ساتھ اُس کے باپ کی چٹکی نے گویا گوپال کے سوتے ہوئے دماغ کی چٹکی بھر لی اس کو اپنے درد کا علاج معلوم ہو گیا۔

اس کی ماں نے مرہم کی بتّی سامنے والان میں سلائی کی پٹاری میں رکھ دی۔ گوپال کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی ماں عام طور پر سلائی کی پٹاری ہی میں سب سنبھالنے والی چیزیں رکھا کرتی ہے سب سے زیادہ سنبھالنے والی چیز وہ موچنا تھا۔ جس سے اُس کی ماں ہر دسویں پندرھویں روز اپنے تنگ ماتھے کے بال صاف کیا کرتی تھی یہ بلا شک و شبہ سلائی کی پٹاری میں اس پڑیا سمیت موجود تھا۔ جس میں کوئلوں کی سفید راکھ جمع رہتی تھی۔ جو اس کی ماں بال نوچ کر ماتھے پر لگایا کرتی تھی۔

تاہم گوپال نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے گیند والان میں پھینک دی۔ اور اس کو پلنگ کے نیچے سے نکالتے ہوئے اپنی ماں کو سلائی کی پٹاری میں مرہم رکھتے دیکھ لیا۔

دوپہر کو اُس نے اپنی بہن نرملا کو ساتھ ملا کر چھوٹی قلنچی، جس سے اُس کا باپ اُنگلیوں کے ناخن کاٹتا تھا۔ مرہم کی بتّی اور اپنے باپ کے پاتجامے سے بچا ہوا، لٹھے کا وہ ٹکڑا حاصل کر لیا۔ جس سے اُس کی ماں ایک اور ٹکڑے کو ساتھ ملا کر شلوار کی میانی بنانا چاہتی تھی۔

دونوں یہ چیزیں لے کر اُوپر کوٹھے پر چلے گئے اور برساتی کے نیچے کوئلوں کی بوریوں کے پاس بیٹھ گئے۔

نرملا نے اپنی جیب سے لٹھے کا ٹکڑا نکال کر اپنی ران پر شلوار کے پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے پر پھیلا کر جب گوپال کی طرف اپنی ناچتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تو اُس وقت ایسا معلوم ہوا کہ گیارہ برس کی یہ کمسن لڑکی جو دریائی سرکنڈے کی طرح نازک اور لچکیلی تھی۔ ایک بہت بڑے کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی ہے۔

اُس کا ننھا سا دل جو اس وقت تک صرف ماں، باپ کی جھڑکیوں اور اپنی گڑیوں کے میلے ہوتے ہوئے چہروں کی فکر سے دھڑکا کرتا تھا۔ اب اپنے بھائی کی ران پر پھوڑا دیکھنے کے خیال سے دھڑک رہا تھا۔ اُس کے کان کی لویں لال اور گرم ہو گئی تھیں۔

گوپال نے گھر میں اپنے پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا تھا۔ لیکن اب اُسے نرملا کو ساری بات سنانا پڑی کہ کس طرح اُس نے چوری چوری آم کھائے۔ اور لسّی پینا بھول گیا اور اس کی ران پر پیسے کے برابر پھوڑا نکل آیا۔

جب اُس نے اپنی رام کہانی سنا کر نرملا سے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا۔ دیکھ، نرملا! گھر میں یہ بات کسی سے نہ کہیو" تو نرملا نے بڑی متین صورت بنا کر جواب دیا تھا" میں پاگل تھوڑی ہوں "۔
گوپال کو یقین تھا کہ نرملا یہ بات اپنے تک ہی رکھے گی۔ چنانچہ اُس نے پاجامے کو اُوپر اڑس لیا۔ نرملا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جب گوپال نے بیٹھ کر اپنا پھوڑا دکھایا اور نرملا نے دُور ہی سے اپنی اُنگلی سے اُسے چھُوا تو۔۔۔ اُس کے بدن پر ایک جھرجھری سی طاری ہو گئی۔ سی سی کرتے ہوئے اُس نے اُبھرے ہوئے لال پھوڑے کی طرف دیکھا اور کہا" کتنا لال ہے"۔

"ابھی تو اور ہو گا۔" گوپال نے اپنے مردانہ حوصلے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

نرملا نے حیرت سے کہا" سچ"؟

"ابھی تو کچھ لال نہیں ہے، جو پھوڑا میں نے چرنجی کے مُنہ پر دیکھا ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ بڑا اور لال تھا" گوپال نے پھوڑے پر دو انگلیاں پھیریں۔

"تو ابھی اور بڑھے گا؟" نرملا آگے سرک آئی۔

"کیا پتہ ہے ——— ابھی تو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔" گوپال نے جیب میں سے مرہم کی ٹی نکال کر کہا۔

نرملا سہم سی گئی۔" اس مرہم سے تو آرام آجائے گا نا؟"

گوپال نے ٹی کے ایک سرے پر سے کاغذ کی تہ جُدا کی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس کا ایک پھاہا لگانے ہی سے پھٹ جائے گا"

"پھٹ جائے گا!" نرملا کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے کان کے پاس ربڑ کا غبارہ پھٹ گیا ہے اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"اور اس کے اندر جو کچھ ہے پھوٹ بہے گا" گوپال نے مرہم کو انگلی پر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

نرملا کا گلابی رنگ اب بمبئی کے مرہم کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا" مگر یہ پھوڑے کیوں نکلتے ہیں بھیا؟"

"گرم چیزیں کھانے سے!" گوپال نے ایک ماہر طبیب کے سے انداز میں جواب دیا۔

نرملا کو وہ دو انڈے یاد آگئے جو اس نے دو ماہ پہلے کھائے تھے، وہ کچھ سوچنے لگی۔

گوپال اور نرملا کے درمیان چند باتیں اور ہوئیں۔ اس کے بعد وہ اصلی کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ نرملا نے لٹھے کا ایک گول پھاہا کاٹا۔ بڑی نفاست سے، یہ روپے کے برابر تھا اور اس کی گولائی میں مجال ہے جو ذرا سا نقص بھی ہو۔ اسی طرح گول تھا جس طرح نرملا کی ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی روٹی گول ہوتی تھی۔

گوپال نے اس پھاہے پر تھوڑا سا مرہم لگایا اور اُسے اچھی طرح پھیلانے کے بعد پھوڑے کی طرف دیکھا۔ نرملا گوپال کے اُوپر جھکی ہوئی تھی اور گوپال کی ہر حرکت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ گوپال نے جب پھاہا اپنے پھوڑے کے اُوپر

جما دیا تو وہ کانپ گئی جیسے اُس کے بدن پر کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو۔

"اب آرام آجائے گا نا؟" نرملا نے نیم سوالیہ انداز میں کہا۔

گوپال جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ برساتی کے برابر والی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ یہ ان کی ماں تھی جو غالباً کوئلے لینے کے لیے آرہی تھی۔

گوپال اور نرملا نے بیک وقت ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے سُنے بغیر سب چیزیں اکٹھی کر کے اس پُرانے صندوق کے پیچھے چھپادیں۔ جہاں ان کی بلی سُندری بچے دیا کرتی تھی اور چپکے سے بھاگ گئے۔

یہاں سے بھاگ کر گوپال جب نیچے گیا تو اُس کے باپ نے اُسے باہر فالودہ لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب واپس آیا تو اُسے گلی میں نرملا ملی۔ فالودے کا گلاس اس کے حوالے کر کے وُہ چرنجی کے گھر چلا گیا اور اس طرح ان چیزوں کو اپنی جگہ پر رکھنا بھول گیا جو ماں کے اچانک آجانے سے اُس نے اور نرملا نے صندوق کے پیچھے چھپادی تھیں۔

چرنجی کے یہاں وہ دیر تک تاش کھیلتا رہا۔ کھیل سے فارغ ہو کر جب وہ چرنجی کی بغل میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو کسی بات پر اُس کا دوست ہنسا اور اُس کے داہنے گال پر پھوڑے کا نشان لمبی سی لکیر بن گیا۔ اُس کو دیکھ کر فوراً ہی اپنے پھوڑے کا گوپال کو خیال آیا اور اس خیال کے ساتھ ہی اُسے وہ چیزیں یاد آگئیں جو صندوق کے پیچھے پڑی تھیں۔ چرنجی کی بغل سے ہاتھ نکال کر وہ بھاگا۔

گھر پہنچ کر اُس نے وہاں کی فضا دیکھی اس کی ماں صحن میں بیٹھی اس کے باپ سے "ملاپ" اخبار کی خبریں سُن رہی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ گوپال اُن کے پاس سے گزرا۔ دونوں نے اُس کی طرف دیکھا۔ مگر اُس سے کوئی بات نہ کی۔ گوپال کو اطمینان ہو گیا کہ ابھی تک اُس کی ماں نے اپنی سلائی کی پٹاری نہیں دیکھی۔ چنانچہ وہ چپکے سے کوٹھے پر چلا گیا۔

بڑے کوٹھے کو طے کر کے دروازے کے اندر داخل ہونے والا ہی تھا کہ اس کے قدم رک گئے۔

صندوق کے پاس نرملا کچھ کر رہی تھی۔ گوپال پیچھے ہٹ گیا اور چھپ کر دیکھنے لگا۔

نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اُس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اُس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اُس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کُرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نکی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بلبلہ اٹکا ہوا ہے۔

نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اُسے اُس ننھے سے ابھار پر جما دیا۔



خاکہ ، عصمت چغتائی

سعادت حسن منٹو

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا حیدر آباد سے ایک صاحب کا پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا:

"یہ کیا بات ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی۔ منٹو اور عصمت۔ اگر یہ دو ہستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر افسوس کہ عصمت نے شاہد سے شادی کر لی اور منٹو ــــــــ"

انہی دنوں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفوں کی کانفرنس ہوئی۔ میں اس میں شریک نہیں تھا لیکن حیدر آباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی جس میں لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا کہ:

"آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی؟"

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات درست ہے یا غلط لیکن جب عصمت چغتائی واپس آئی تو اس نے میری بیوی سے کہا کہ حیدر آباد میں جب ایک لڑکی نے اس سے سوال کیا: "کیا منٹو کنوارا ہے؟" تو اس نے ذرا طنز کے ساتھ جواب دیا: "جی نہیں" اس پر وہ محترمہ عصمت کے بیان کے مطابق کچھ کھسیانی سی ہو کر خاموش ہو گئیں۔

واقعات کچھ بھی ہوں لیکن یہ بات غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے کہ ہمارے ہندوستان میں صرف حیدر آباد ہی ایسی جگہ ہے جہاں مرد اور عورتیں میری اور عصمت کی شادی کے متعلق فکر مند رہے ہیں۔

اس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں اگر میں اور عصمت واقعی میاں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا؟ یہ اگر بھی کچھ اسی قسم کی اگر ہے۔ اگر کہا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا اٹھارواں حصہ بڑی ہوتی تو اس کا اثر وادیٔ نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا ــــ لیکن یہاں عصمت قلوپطرہ ہے اور نہ منٹو انطونی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر عہدِ حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا۔ افسانے، افسانے بن جاتے۔ کہانیاں مڑ تڑ کر پہیلیاں ہو جاتیں۔ انشا کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہو کر یا تو ایک نادر سفوف کی شکل اختیار کر لیتا یا بھسم ہو کر راکھ بن جاتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آخری تحریر ہوتے لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ قرین قیاس تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے تاکہ سند رہے۔ نکاح کے دوران میں کچھ ایسی باتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

عصمت۔ قاضی صاحب کی پیشانی ایسا لگتا ہے تختی ہے۔"

"کیا کہا؟"

"تمہارے کانوں کو کیا ہو گیا ہے"۔

"میرے کانوں کو تو کچھ نہیں ہوا ــــــ تمہاری اپنی آواز حلق سے باہر نہیں نکلتی"۔

"حد ہو گئی ہے ــــــ لو اب سنو۔ میں یہ کہہ رہا تھا قاضی صاحب کی پیشانی بالکل تختی سے ملتی جلتی ہے"۔

"تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے"۔

"یہ پیشانی سپاٹ نہیں!"

"تم سپاٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو"۔

"جی نہیں"۔

"سپاٹ ماتھا تمہارا ہے ــــــ قاضی جی کا ماتھا تو

"بڑا خوبصورت ہے"۔

"خوبصورت تو ہے"۔

"تم محض چڑا رہی ہو مجھے"۔

"چڑا تم رہے ہو مجھے"۔

"میں کہتا ہوں تم چڑا رہی ہو مجھے"۔

"میں کہتی ہوں تم چڑا رہے ہو مجھے"۔

"تمہیں ماننا پڑے گا کہ تم چڑا رہی ہو مجھے"۔

"اجی واہ ــــــ تم تو ابھی سے شوہر بن بیٹھے"۔

"قاضی صاحب۔ میں اس عورت سے شادی نہیں کروں گا ــــــ اگر آپ کی بیٹی کا ماتھا بھی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے پڑھوا دیجئے"۔

"قاضی صاحب۔ میں اس مردوے سے شادی نہیں کروں گی ــــــ اگر آپ کی چار بیویاں نہیں ہیں تو مجھ سے شادی کر لیجئے۔ مجھے آپ کا ماتھا بہت پسند ہے"۔

کرشن چندر "چوٹیں" کے دیباچے میں لکھتا ہے:

"سمت کو چھپانے میں، پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں گم کر دینے میں اور پھر یکا یک آخر میں اس اضطراب و حیرت کو مسرت میں مبدل کر دینے کی صفت میں عصمت اور منٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اس فن میں اردو کے بہت کم افسانہ نگاروں کے حریف ہیں"۔

اگر ہم دونوں کو شادی کا خیال آتا تو دوسروں کو حیرت و اضطراب میں گم کرنے کی بجائے ہم خود اس میں غرق ہو جاتے اور جب

ایک دم چونکتے تو یہ حیرت اور اضطراب جہاں تک میں سمجھتا ہوں، مسرت کے بجائے ایک بہت بڑے فکا ہیہ میں تبدیل ہو جاتا عصمت اور منٹو ، نکاح اور شادی، کتنی مضحکہ خیز چیز ہے۔

عصمت لکھتی ہے:

"ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت، کتنے محمود، عباس عسکری، یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دیئے گئے ہیں۔ کوئی بتاؤ ان میں سے چور پتا کون سا ہے؟ ـــــ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں، محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضا، عسکری کے بے رحم ہاتھ، یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تل، عباس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے، کشادہ پیشانیاں، گھنے گھنے بال، سڈول پنڈلیاں، مضبوط بازو، سب ایک ساتھ مل کر پکے سوت کے ڈوروں کی طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا سرا پکڑ کر کھینچوں کہ کھنچتا ہی چلا آئے اور میں اس کے سہارے دور اُفق سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔"

ـــــ چھوٹی آپا

منٹو لکھتا ہے:

"میں صرف اتنا سمجھا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور زمینیں خریدنا تمہارے لئے ایک ہی بات ہے۔ سو تم محبت کرنے کے بجائے ایک دو بیگھے زمین خرید لو اور اس پر ساری عمر قابض رہو۔ زندگی میں صرف ایک عورت اور یہ دنیا اس قدر بھری ہوئی کیوں ہے۔

کیوں اس میں اتنے تماشے جمع ہیں ـــــ صرف گندم پیدا کر کے ہی اللہ میاں نے اپنا ہاتھ کیوں نہ روک لیا۔ میری سنو اور اس زندگی کو جو کہ تمہیں دی گئی ہے اچھی طرح استعمال کرو ـــــ تم ایسے گاہک ہو جو عورت حاصل کرنے کے لئے ساری عمر سرمایہ جمع کرتے رہو گے مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔ میں ایسا خریدار ہوں جو زندگی میں کئی عورتوں سے سودے کرے گا ـــــ تم ایسا عشق کرنا چاہتے ہو کہ اس کی ناکامی پر کوئی ادنےٰ درجے کا مصنف ایک کتاب لکھے جسے زاٹن دت سہگل پیلے کاغذوں پر چھاپے اور ڈبی بازار میں اسے ردی کے بھاؤ بیچے ـــــ میں اپنی کتابِ حیات کے تمام اوراق دیمک بن کر چاٹ جانا چاہتا ہوں تا کہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے ـــــ تم محبت میں زندگی چاہتے ہو میں زندگی میں محبت چاہتا ہوں۔"

ـــــ تکلیف

عصمت کو اگر الجھے ہوئے سوت کے ڈھیر میں سے ایسا سِرا مل جاتا کھینچنے پر جو کھنچتا ہی چلا آتا اور وہ اس کے سہارے دور افق سے اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاتی اور منٹو اگر اپنی کتابِ حیات کے آدھے اوراق بھی دیمک بن کر چاٹنے میں کامیاب ہو جاتا تو آج ادب کی لوح پر ان کے فن کے نقوش اتنے گہرے کبھی نہ ہوتے۔ وہ دور افق سے بھی اوپر ہوا میں تنی رہتی اور منٹو کے پیٹ میں اس کی کتابِ حیات کے باقی اوراق بھس بھر کے اس کے ہمدرد اسے شیشے کی الماری میں بند کر دیتے۔

"چوٹیں" کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتا ہے:

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

عصمت کے متعلق جو کچھ میں لکھ رہا ہوں کسی بھی قسم کی خفت مٹانے کا نتیجہ نہیں ایک قرض تھا جو سود کی بہت ہی ہلکی شرح کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں نے عصمت کا کون سا افسانہ پڑھا تھا مجھے بالکل یاد نہیں۔ یہ سطور لکھنے سے پہلے میں نے حافظے کو بہت کھرچا لیکن اس نے میری رہبری نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عصمت کے افسانے کاغذ پہ منتقل ہونے سے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا لیکن جب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو مجھے سخت نا امیدی ہوئی۔

اڈلفی چیمبرز کلیر روڈ کے ۷ انمبر فلیٹ میں جہاں "مصور" ہفتہ وار کا دفتر تھا شاہد لطیف اپنی بیوی کے ساتھ داخل ہوا۔ یہ اگست ۴۲ء ۱۹ ار کی بات ہے۔ تمام کانگریسی لیڈر مہاتما گاندھی سمیت گرفتار ہو چکے تھے اور شہر میں کافی گڑبڑ تھی۔ فضا سیاسیات میں بسی ہوئی تھی اس لئے کچھ دیر گفت گو کا موضوع تحریکِ آزادی رہا۔ اس کے بعد رُخ بدلا اور افسانوں کی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک مہینہ پہلے جبکہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا ادبِ لطیف میں عصمت چغتائی کا "لحاف" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے میں نے کرشن چندر سے کہا تھا:

"افسانہ بہت اچھا ہے لیکن آخری جملہ بہت غیر صنّاعانہ ہے۔" احمد ندیم کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا۔"

چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عصمت سے کہا:

"آپ کا افسانہ "لحاف" مجھے بہت پسند آیا۔ بیان میں الفاظ کو بقدرِ کفایت استعمال کرنا آپ کی خصوصیت رہی ہے لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار سا جملہ لکھ دیا کہ ایک انچ اٹھے ہوئے لحاف میں میں نے کیا دیکھا، کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو میں کبھی نہیں بتاؤں گی۔"

عصمت نے کہا: "کیا عیب ہے اس جملے میں۔"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شے کا نام سن کر نمودار ہوتا ہے۔ مجھے سخت نا امیدی ہوئی۔ اس لئے کہ میں "لحاف" کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جب عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا:

"یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی۔"

مجھے یاد ہے اس ملاقات کے دوسرے ہی روز میں نے اپنی بیوی کو دہلی میں خط لکھا:

"عصمت سے ملا۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل ایسی ہی عورت ہے جیسی تم ہو۔ میرا مزہ تو بالکل کرکرا ہو گیا لیکن تم اسے

یقیناً پسند کرو گی۔ میں نے جب اس سے ایک اِنچ اٹھے ہوئے لحاف کا ذکر کیا تو نالائق اس کا تصور کرتے ہی جھینپ گئی"۔

ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے اس پہلے ردِعمل پر سنجیدگی سے غور کیا اور مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ اپنے فن کی بقا کے لئے انسان کو اپنی فطرت کی حدود میں رہنا ازبس لازم ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے۔ کچھ تو گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علیحدہ ہو گیا اور کچھ پتلون کی جیبوں میں ٹھس ہو کر رہ گیا۔ فرانس میں جارج ساں نے نسوانیت کا حسین ملبوس اتار کر تصنع کی زندگی اختیار کی۔ پولستانی موسیقار شوپیں سے لو تھکوا کر اس نے لعل و گہر ضرور پیدا کرائے لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بطن میں دم گھٹ کے مر گیا۔

میں نے سوچا عورت جنگ کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑے۔ پہاڑ کاٹے۔ افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی مہندی رچنی ہی چاہیئے۔ اس کی باہوں سے چوڑی کی کھنک آنی ہی چاہیئے۔

مجھے افسوس ہے جو میں نے اس وقت اپنے دل میں کہا کہ:

"یہ تو کم بخت بالکل ہی عورت نکلی"۔

عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں بھول بھلیاں، تل، لحاف اور گیندا جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی بھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف اور ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ یہ ادائیں، وہ عشوے، وہ غمزے نہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کئے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزلِ مقصود انسان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی ان جانی ـــ ان بوجھی مگر مخملیں فطرت لئے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔

ان کی رنگت بدلی۔ "بچارا بچہ ـــ مر گیا اس کا باپ شاید"۔

"خاک تمہارے منہ میں۔ خدا نہ کرے"۔

میں نے ننھے کو کلیجے سے لگا لیا۔

"ٹھائیں"۔ ننھے نے موقعہ پا کر بندوق چلائی۔

"ہائیں باجی ـــ ابا کو مارتا ہے"۔

میں نے بندوق چھین لی۔ (بھول بھلیاں)

اور لوگ کہتے ہیں عصمت ناشدنی ہے۔ چڑیل ہے۔ گدھے کہیں کے۔ ان چار سطروں میں عصمت نے عورت کی روح نچوڑ کر رکھ دی ہے اور یہ لوگ اسے اخلاق کی امتحانی نلیوں میں بیٹھے ہلا ہلا کر دیکھ رہے ہیں۔ توپ دم کر دینا چاہیئے ایسی اوندھی کھوپڑیوں کو۔

"ساقی" میں "دوزخی" چھپا۔ میری بہن نے پڑھا اور مجھ سے کہا:

"سعادت۔ یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے موئے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے۔ کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں"۔

میں نے کہا: "اقبال اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کیلئے تیار ہوں"۔

شاہجہاں نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے تاج محل بنوایا۔ عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں "دوزخی" لکھا۔ شاہجہاں نے دوسروں سے پتھر اٹھوائے۔ انہیں ترشوایا۔ اپنی محبوبہ کی لاش پر عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ عصمت نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے خواہرانہ جذبات چن چن کر ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پر نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی لاش رکھ دی ——— تاج شاہجہاں کی محبت کا برہنہ مرمریں اشتہار معلوم ہوتا ہے لیکن "دوزخی" عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے۔ وہ جنت جو اس مضمون میں آباد ہے عنوان اس کا اشتہار نہیں دیتا۔

میری بیوی نے یہ مضمون پڑھا تو عصمت سے کہا: "یہ تم نے کیا خرافات لکھی ہے۔"

"بکو نہیں...... لاؤ وہ برف کہاں ہے۔"

عصمت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے بالکل بچوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لئے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹتی رہتی ہے۔ اس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا کر لکھے ہیں۔ چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی ہے۔ سامنے تکیے پر کاپی کھلی ہے۔ ایک ہاتھ میں فاؤنٹین پین ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی۔ ریڈیو اونچے سروں میں چلّا رہا ہے مگر اس کا قلم اور منہ دونوں کھٹا کھٹ چل رہے ہیں...... عصمت پر لکھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ نہ لکھے تو مہینوں گزر جاتے ہیں پر جب دورہ پڑے تو سینکڑوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔ کھانے پینے، نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ بس ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی اپنے ٹیڑھے میڑھے اعراب اور املا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔

ٹیڑھی لکیر جیسا طول طویل ناول میرا خیال ہے عصمت نے سات آٹھ نشستوں میں ختم کیا تھا۔

کرشن چندر عصمت کے بیان کی رفتار کے متعلق لکھتا ہے۔

"افسانوں کے مطالعہ سے ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے گھوڑ دوڑ یعنی رفتار حرکت، سبک خرامی، (میرا خیال ہے اس سے کرشن چندر کی مراد برق رفتاری تھی) اور تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے، کنائے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔"

عصمت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع کرے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آگے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے۔ باتیں کرے گی تو لفظ ایک دوسرے پر چڑھتے جائیں گے۔ شیخی بگھارنے کی خاطر اگر کبھی باورچی خانے میں چلی جائے گی تو معاملہ بالکل چوپٹ ہو جائے گا کہ طبیعت میں چونکہ بہت ہی عجلت ہے اس لئے آٹے کا پیڑا بناتے ہی شکی سنگاپور روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آلو ابھی چھیلے نہیں گئے لیکن ان کا سالن اس کے دماغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے بعض اوقات وہ باورچی خانے میں قدم رکھ کر خیال خیال میں شکم سیر ہو کر لوٹ آتی ہوگی۔ لیکن اس کے حد سے بڑھی ہوئی عجلت کے مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی بچی کے فراک سیتے دیکھا ہے۔ اس کا قلم لکھتے وقت املا کی غلطیاں کر جاتا ہے لیکن ننھی کے فراک سیتے وقت اس کی سوئی سے ہلکی سی لغزش

بھی نہیں ہوتی۔ نپے تلے ٹانکے ہوتے ہیں اور مجال ہے جو کہیں جھول ہو۔

"اف رے بچے" میں عصمت لکھتی ہے:

"گھر کیا ہے محلے کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے۔ دنیا کے بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاءاللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے ـــ سنتے ہیں دنیا میں بچے مرا بھی کرتے ہیں:

"مرتے ہوں گے۔ کیا خبر:"

اور پچھلے دنوں بمبئی میں جب اس کی بچی سیما کو کالی کھانسی ہوئی تو وہ راتیں جاگتی تھی۔ ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ ممتا ماں بننے کے ساتھ ہی کوکھ سے باہر نکلتی ہے۔

عصمت پرلے درجے کی ہٹ دھرم ہے۔ طبیعت میں ضد ہے۔ بالکل بچوں کی سی زندگی کے نظریے کو فطرت کے کسی قانون کو پہلے ہی سابقہ میں کبھی قبول نہیں کرے گی۔ پہلے شادی سے انکار کرتی رہی۔ جب آمادہ ہوئی تو بیوی بننے سے انکار کر دیا۔ بیوی بننے پر جوں توں رضامند ہوئی تو ماں بننے سے منکر ہو گئی۔ تکلیفیں اٹھائے گی۔ صعوبتیں برداشت کرے گی مگر ضد سے کبھی باز نہیں آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی اس کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ زندگی کے حقائق سے دوچار ہو کر بلکہ ٹکرا کر ان کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے ـــ اس کی ہر بات نرالی ہے۔

عصمت کے زنانہ اور مردانہ کرداروں میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار عام پایا جاتا ہے۔ محبت میں بری طرح مبتلا ہیں لیکن نفرت کا اظہار کئے چلے جا رہے ہیں۔ جی گال چومنے کو چاہتا ہے لیکن اس میں سوئی کھبو دیں گے۔ ہولے سے تھپکنا ہو گا تو ایسی دھول جمائیں گے کہ دوسرا بلبلا اٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت جو محض ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے عام طور پر عصمت کے افسانوں میں ایک نہایت رحم انگیز صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔

عصمت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور ہوا اور میں اسے دیکھنے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہو گا۔

عصمت سے ملتے جلتے مجھے پانچ چھ برس ہو گئے ہیں۔ دونوں کی آتش گیر اور بھک سے اڑ جانے والی طبیعت کے پیش نظر احتمال تو اسی بات کا تھا کہ سینکڑوں لڑائیاں ہوتیں مگر تعجب ہے کہ اس دوران میں صرف ایک بار چخ ہوئی اور وہ بھی ہلکی سی!

شاہد اور عصمت کے مدعو کرنے پر میں اور میری بیوی صفیہ دونوں ملاڈ (بمبئی کے مضافات میں ایک جگہ جہاں شاہد بمبئی ٹاکیز کی ملازمت کے دوران میں مقیم تھا) گئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہد نے کہا:

"منٹو! تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں"!

ڈیڑھ بجے تک میں نے تسلیم نہ کیا کہ میری تحریر میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

شاہد تھک گیا۔ دو بجے تک عصمت نے اپنے شوہر کی پیروی کی۔ میں پھر بھی نہ مانا۔ دفعتاً کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا۔ میں نے جھٹ سے کہا:

"صحیح لفظ دراز دستی ہے" ـــ تین بج گئے۔ عصمت نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ میری بیوی سو گئی۔ شاہد قضیہ ختم کرنے کیلئے

دوسرے کمرے سے لغت اٹھالایا۔ "د" کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہ تھا البتہ درازدستی اور اس کے معنی درج تھے۔ شاہد نے کہا: "عصمت اب تمہیں ماننا پڑے گا"

اب میاں بیوی میں چخ شروع ہو گئی۔ مرغ اذانیں دینے لگا۔ عصمت نے لغت اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور کہا:

"جب میں لغت بناؤں گی تو اس میں صحیح لفظ دست درازی ہوگا۔ یہ کیا ہوا درازدستی۔ درازدستی ـــ"

کج بحثی کا یہ سلسلہ دراز بہرحال ختم ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں لڑے بلکہ یوں کہئے کہ ہم نے کبھی اس کا موقع ہی نہیں آنے دیا۔ گفتگو کرتے کرتے جب بھی کوئی خطرناک موڑ آیا تو عصمت نے رخ بدل لیا یا میں راستہ کاٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

عصمت کو میں پسند کرتا ہوں۔ وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن اگر کوئی دفعتاً پوچھ بیٹھے "تم دونوں ایک دوسرے کی کیا چیز پسند کرتے ہو؟" تو میرا خیال ہے کہ میں اور عصمت دونوں کچھ عرصہ کے لئے بالکل خالی الذہن ہو جائیں۔

عصمت کی شکل و صورت دلفریب نہیں لیکن دل نشیں ضرور ہے۔ اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کنی کی سفید دھوتی، سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا چست بلاؤز، ہاتھ میں چھوٹا پرس، پاؤں میں بغیر ایڑی کا براؤن چپل، چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور متجسس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک، چھوٹے مگر گھنگھریالے بال۔ . . . ٹیڑھی مانگ۔ ذرا سا مسکرانے پر بھی گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔

میں عصمت پر عاشق نہ ہوا مگر میری بیوی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ عصمت سے اگر صفیہ اس کا ذکر کرے تو وہ ضرور کچھ یوں کہے گی۔ "بڑی آئی ہو میری محبت میں گرفتار ہونے والی۔ تمہاری عمر کی لڑکیوں کے باپ تک قید ہوتے رہے ہیں میری محبت میں"

ایک بزرگوار اہلِ قلم کو تو میں بھی جانتا ہوں جو بہت دیر تک عصمت کے پریم پجاری رہے۔ خط و کتابت کے ذریعے سے آپ نے عشق فرمانا شروع کیا۔ عصمت شہ دیتی رہی لیکن آخر میں ایسا اڑنگا دیا کہ تڑیا ہی دکھا دی۔ غریب کو یہ بھی کہانی میرا خیال ہے کہ وہ کبھی قلم بند نہیں کریں گے۔

باہم متصادم ہو جانے کے خوف سے میرے اور عصمت کے درمیان بہت ہی کم باتیں ہوتی تھیں۔ میرا افسانہ کبھی شائع ہو تو پڑھ کر داد دے دیا کرتی تھی۔ "نیلم" کی اشاعت پر اس نے غیر معمولی جوش و خروش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا:

"واقعی یہ بہن بنانا کیا ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کسی عورت کو بہن کہنا اس کی توہین ہے"۔

اور میں سوچتا رہ گیا۔ . . . . وہ مجھے منٹو بھائی کہتی ہے اور میں اسے عصمت بہن کہتا ہوں۔ دونوں کو خدا سمجھے!

ہماری پانچ چھ برس کی دوستی کے زمانہ کا ایسا کوئی واقعہ نہیں جو قابلِ ذکر ہو۔ فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونوں گرفتار ہوئے۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہو چکا تھا لیکن عصمت کا پہلا موقع تھا اس لئے بہت بھنّائی۔ اتفاق سے گرفتاری بالکل غیر قانونی نکلی کیونکہ پنجاب پولیس نے ہمیں بغیر وارنٹ پکڑ لیا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئی لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی آخر اسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

بمبئی سے لاہور تک کافی لمبا سفر ہے لیکن شاہد اور میری بیوی ساتھ تھے۔ سارا وقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور چڑانے کی خاطر ہم دونوں کی فحش نگاری پر حملے کرتے رہے۔ قید کی صعوبتوں کا نقشہ کھینچا۔ جیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے آخر میں جھلا کر کہا:

"سُولی پر بھی چڑھا دیں لیکن یہاں حلق سے انا الحق ہی نکلے گا۔"

اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ دونوں مرتبہ کالجوں کے تماشائی طالب علم مجھے اور عصمت کو دیکھنے کے لئے ٹولیاں باندھ باندھ کر عدالت میں آتے رہے۔ عصمت نے مجھ سے کہا:

"منٹو بھائی! چودھری نذیر سے کہئے ٹکٹ لگا دے کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہی نکل آئے گا۔"

ہم دو دفعہ لاہور گئے اور دو ہی دفعہ ہم نے کرنال شاپ سے مختلف ڈیزائنوں کے دس دس بارہ بارہ جوڑے سینڈلوں اور جوتیوں کے خریدے۔ بمبئی میں کسی نے عصمت سے پوچھا:

"لاہور آپ کیا مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے؟"

عصمت نے جواب دیا: "جی نہیں جوتے خریدنے گئے تھے۔"

غالباً ساڑھے تین برس پہلے کی بات ہے۔ ہولی کا تہوار تھا۔ ملاڈ میں شاہد اور میں بالکنی میں بیٹھے پی رہے تھے۔ عصمت میری بیوی کو اکسا رہی تھی:

صفیہ۔ یہ لوگ اتنا روپیہ اڑائیں، ہم کیوں نہ اس عیش میں شریک ہوں۔"

دونوں ایک گھنٹے تک دل لگی کرتی رہیں۔ اتنے میں ایک دم ہلڑ سا مچا۔ اور فلمستان سے پروڈیوسر مکرجی، ان کی بھاری بھرکم بیوی اور دوسرے لوگ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ چند ہی منٹوں میں ان کا حلیہ ناقابلِ شناخت تھا۔ عصمت کی توجہ وسکی سے ہٹی اور رنگ پر مرکوز ہو گئی۔

"آؤ صفیہ۔ ہم بھی ان کے رنگ لگائیں۔"

ہم سب بازار میں نکل آئے چنانچہ گھوڑ بندر روڈ پر باقاعدہ ہولی شروع ہو گئی۔ نیلے پیلے سبز اور کالے رنگوں کا چھڑکاؤ سا شروع ہو گیا ... ، پیش پیش تھی۔ ایک موٹی بنگالن کے چہرے پر تو اس نے تارکول کالیپ کر دیا۔ اس وقت مجھے اس کے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خیال آیا۔ ایک دم عصمت نے جرنیلوں کے سے انداز میں کہا:

"آؤ۔ پری چہرہ کے گھر پر دھاوا بولیں۔"

ان دنوں نسیم بانو ہماری فلم "چل چل رے نوجوان" میں کام کر رہی تھی۔ اس کا بنگلہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ پر تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی۔ چنانچہ چند منٹوں میں ہم سب بنگلے کے اندر تھے۔ نسیم حسبِ عادت پورے میک اپ میں تھی اور نہایت نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ وہ اور اس کا خاوند احسان ہمارا شور سن کر باہر نکلے۔ عصمت نے جو رنگوں میں لتھڑی ہوئی بھتنی سی لگتی تھی میری بیوی سے جس پر مزید رنگ لگانے سے میرا خیال ہے کوئی فرق نہ پڑتا، نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا: "صفیہ۔ نسیم واقعی حسین عورت ہے۔"

میں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا: "حسن ہے لیکن بہت ٹھنڈا"۔
عینک کے رنگ آلود شیشوں کے پیچھے عصمت کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھومیں اور اس نے آہستہ سے کہا: "صفراوی طبیعتوں کے لئے ٹھنڈی چیزیں مفید ہوتی ہیں"۔
یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور ایک سیکنڈ کے بعد پری چہرہ نسیم سرکس کا مسخرہ بنی تھی۔
عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں:
"منٹو بھائی۔ جی چاہتا ہے اب مرغ اور مرغیوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں" یا "میں تو فوج میں بھرتی ہو جاؤں گی اور ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گی"۔
چند مہینوں کی بات ہے میں اور عصمت بمبئی ٹاکیز سے واپس الیکٹرک ٹرین میں گھر جا رہے تھے میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا: "کرشن چندر کے افسانوں میں دو چیزیں میں نے عام دیکھی ہیں ...... زنا بالجبر اور قوسِ قزح جسے وہ قوس و قزح لکھتا ہے"۔
عصمت نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا: "یہ تو ہے"۔
"سوچتا ہوں ایک مضمون لکھوں جس کا عنوان کرشن چندر، قوسِ قزح اور زنا بالجبر ہو" میں ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا "لیکن زنا بالجبر سے قوسِ قزح کا نفسیاتی رشتہ کیا ہو سکتا ہے"۔
عصمت نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا: "جمالیاتی نقطۂ نظر سے قوسِ قزح کے رنگوں میں انتہائی جاذبیت اور کشش ...... لیکن آپ تو کسی اور زاویے سے سوچ رہے تھے"۔
"جی ہاں .... سرخ رنگ آگ اور خون کا رنگ ہے۔ صنمیات میں اس رنگ کو مریخ یعنی جلادِ فلک سے منسوب کیا جاتا ہے ..... ہو سکتا ہے کہ زنا بالجبر سے قوسِ قزح کے صرف اسی رنگ کا دامن بندھا ہو"۔
"ہو سکتا ہے .... آپ یہ مضمون ضرور لکھئے"۔
"لیکن عیسائیوں کے فنِ مصوری میں سرخ رنگ عشقِ الٰہی کا مظہر ہے ..... نہیں نہیں"۔
میرے دماغ میں دفعتاً ایک خلیہ پھوٹا۔ "صلیب پر چڑھنے کے شدید جذبے کو بھی اسی رنگ سے معنون کیا گیا ہے اور کنواری مریم کا لباس سرخ ہوتا ہے ..... یہ عصمت کی نشانی ہے" یہ کہتے کہتے میں نے اچانک عصمت کے سفید لباس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔
"منٹو بھائی۔ آپ یہ مضمون ضرور لکھئے، مزہ آجائے گا .... لیکن عنوان میں سے بالجبر اڑا دیجئے"۔
"کرشن کو اعتراض ہو گا کیونکہ وہ جبر یہ فعل سمجھ کر ہی تو روتا ہے"۔
"بیکار روتا ہے، کیا معلوم کہ یہ ظلم ہی اس کی مظلوم ہیروئنوں کو اچھا لگتا ہو"۔
"اللہ بہتر جانتا ہے"۔
عصمت کی افسانہ نگاری پر کافی مضمون لکھے گئے ہیں۔ حق میں کم، خلاف کچھ تو بالکل مجذوب کی بڑ ہیں۔ چند ایسے ہیں جن میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہوں۔

پطرس صاحب نے بھی جن کو لاہور کے ادبی ٹھیکیداروں نے ڈبیا میں بند کر رکھا تھا، اپنا ہاتھ باہر نکالا اور قلم پکڑ کر عصمت پر ایک مضمون لکھ دیا۔ آدمی ذہین ہیں۔ طبیعت میں شوخی اور مزاح ہے اس لئے مضمون کافی دلچسپ اور سلجھا ہوا ہے آپ عورت کے لیبل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس (آپ کی مراد صلاح الدین صاحب سے ہے) نے بھی معلوم ہوتا ہے.... انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں۔ عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں بھی وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک زمانے میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔ گویا ادب کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں۔

جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلّم۔ لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تک ہی ملا اور بوجھوں تو کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے جو خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جبلی اور بنیادی، جو انشا پرداز عورتوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں کے ادب سے ممیّز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ ان سوالوں کا جواب کچھ ہو بہر حال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنیاد پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے"۔

ان سوالوں کا جواب بہت ممکن ہے ایسا نہ ہو جس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے لیکن جواب دیتے وقت لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ سوال کرنے والا کون ہے ..... مرد یا عورت؟

کیونکہ صنف معلوم ہونے پر سوال کرنے والے کا جبلی اور بنیادی زاویہ نگاہ بہت حد تک واضح ہو جائے گا۔

پطرس کا یہ کہنا کہ "گویا ادب بھی کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں"۔

ٹھیٹھ پطرسی فقرے بازی ہے ٹینس ٹورنامنٹ ادب نہیں لیکن عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہونا بے ادبی بھی نہیں۔

پطرس صاحب کلاس کو لکچر دیتے ہیں تو طلبہ اور طالبات سے ان کا خطاب جداگانہ نہیں ہوتا لیکن جب انہیں کسی شاگرد لڑکے یا شاگرد لڑکی کے دماغی نشو و نما پر غور کرنا پڑے گا تو ماہرِ تعلیم ہونے کی حیثیت میں وہ ان کی جنس سے غافل نہیں ہو جائینگے۔

عورت اگر جارج ایلیٹ یا عصمت چغتائی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ادب پر اس کے عورت ہونے کے اثر کی طرف غور ہی نہ کیا جائے۔ ہیجڑے کے ادب کے متعلق بھی کیا پطرس صاحب یہی استفسار فرمائیں گے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے۔ داخلی اور جبلی اور بنیادی جو انشا پرداز ہیجڑوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں اور عورتوں کے ادب سے ممیّز کرتا ہے۔

میں عورت پر عورت اور مرد پر مرد کے نام کا لیبل لگانا بھونڈے پن کی دلیل سمجھتا ہوں۔ مسجدوں اور مندروں پر یہ بورڈ لگانا کہ یہ عبادت اور بندگی کی جگہیں ہیں بہت ہی مضحکہ خیز ہے لیکن جب کسی مسجد اور مندر کے مقابلے میں کسی عام رہائش گاہ کو دیکھ کر ہم فنِ تعمیر کا جائزہ لیں گے تو اس پر مندر اور مسجد کی تقدیس کا اثر اپنے ذہن سے محو نہیں کر دیں گے۔

عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ادب کے ہر ہر نقطے میں موجود ہے جو اس کو سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہبری کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں سے جن کو پطرس صاحب نے اپنے مضمون میں غیر جانبداری سے بیان کیا ہے۔ ہم

مصنف کی جنس سے علیحدہ نہیں کر سکتے اور نہ ایسا کرنے کے لئے کوئی تنقیدی، ادبی یا کیمیائی طریقہ ہی موجود ہے۔

عزیز احمد صاحب "نیا دور" میں عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"جسم کے احتساب کا عصمت کے پاس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے مساس۔ چنانچہ رشید سے لے کر ٹیلر تک بیسیوں مرد جو اس ناول میں آتے ہیں سب کا اندازہ جسمی یا ذہنی مساس سے کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مساس کی کیفیت انفعالی ہی ہوتی ہے۔ مساس ہی عصمت کے یہاں مرد، احتساب، انسان، احتساب زندگی، احتساب کائنات کا واحد ذریعہ ہے۔ رضائیوں کے بادلوں میں عباس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور لڑکیوں کے گروہ میں ننھی ننھی لرزشیں مچل مچل کر بکھر جاتی ہیں ... رسول فاطمہ کے چہرے جیسے ہاتھ مساس کا تاریک رُخ ہیں۔ نیم تاریک رخ میٹرن کا وہ منافرہ یا معاشقہ ہے جس میں میٹرن کو تعجب تھا کہ ذہن میں لڑکیاں ان غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رینگتی محسوس نہیں کرتیں۔ مساس کے سلسلے میں شمن کا نسوانی احساس (لطرس صاحب متوجہ ہوں) ران پر انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس کرتا ہے۔ الخ!

عزیز احمد صاحب کا یہ نظریہ غلط ہے کہ عصمت کے یہاں احتساب کا ذریعہ ایک فقط مساس ہی ہے۔ اول تو مساس کہنا ہی غلط ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسا عمل یا فعل ہے جو کچھ دیر جاری رہتا ہے۔ عصمت تو غایت درجہ کی ذکی الحس ہے ہلکا سا مس ہی اس کے لئے کافی ہے۔ عصمت کے یہاں آپ کو دوسری جسمانی حسّیں بھی محوِ عمل نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر سونگھنے اور سننے کی حس وصوت کا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں عصمت کے ادب سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔

"گھر گھر۔ پھٹ شوں فش" باہر برآمدے میں موٹر بھنّا رہی تھی۔

"ریڈیو کو مروڑتے رہے۔ کھڑ کھڑ، شرڑ شرڑ، گھر گھر" ..... میرے آنسو نکل آئے۔

"ٹن ٹن۔ سائیکل کی گھنٹی بجی۔ میں سمجھ گئی کہ اپڈ نا آ گئی" (پکنک)

"اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم ٹھٹوں کی آواز چھت پر آئی"۔

"اور دھم دھم چھن چھن کرتی بہو سیڑھیوں پر سے اتری"۔

"غن غن۔ غن غن" بہو منمنائی۔

"مکھی تن تن کر کے رہ گئی" (ساس)

"بچہ کوں کوں کر کے چپڑ چپڑ منہ مارنے لگتا" (سفر میں)

"بلی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں" (لحاف)

"ٹک ٹک۔ ٹک ٹک" گھڑی کی طرح اس کا دل چلنے لگا۔

"موٹے موٹے قہقہے لگاتے ہوئے مچھر" (تل)

"ایک پراسرار قبرستانی سسکی ہوا میں لرزتی ہے" (بھری کامیں سے)

"گھنگھروؤں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایک بارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں بھنوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگیں" (پیشہ)

اسی طرح سونگھنے کی حس بھی جگہ جگہ معروف عمل ہے:

"اور بُو تو دیکھو، حقے کی سڑاند ہے توبہ، تھو"

"قوام کی بُو ایسی بس گئی تھی کہ اسے نیند نہ آئی"۔ (ڈائن)

"سرسوں کا تیل آٹھویں دن ہی کھٹی کھٹی بو دینے لگتا"۔ (نیرا)

"اور جسم سے عجیب گھبرانے والی بُو کے شرارے نکلتے تھے"۔

"گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انہیں انگارہ بنا دیا"۔

"میں نے نتھنے پھیلا کر "سوں سوں" ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ محسوس نہ ہوا"۔ (لحاف)

"سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر دکھا دیا تھا" (تل)

"پسینے سے گل چکے تھے اور ان میں مرگھٹ جیسی چراند آنے لگی تھی"۔ (جال)

"مردانہ قمیص، سگریٹ کی بُو میں غرق ملگجی سی"۔ (ہیرو)

"نیچے کیاریوں میں سے دھنیے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی"۔ (میرا بچہ)

عصمت کی سب حسیں وقت پڑنے پر اپنی اپنی جگہ کام کرتی ہیں اور ٹھیک طور سے کرتی ہیں۔ عزیز احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جنس ایک مرض کی طرح عصمت کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ ممکن ہے ان کی تشخیص کے مطابق درست ہو مگر وہ اس مرض کیلئے نسخے تجویز نہ فرمائیں۔ یوں تو لکھنا بھی ایک مرض ہے۔ کامل طور پر صحت مند آدمی جس کا درجہ حرارت ہمیشہ ساڑھے اٹھانوے ہی رہے ساری عمر اپنی زندگی کی ٹھنڈی سلیٹ ہاتھ میں لئے بیٹھا رہے گا۔

عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں:

"عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو عشق ایسی چیز سے جس کا جسم سے وہی تعلق ہے جو بجلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دیا تو یہی عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے۔ دوپہر کی جلتی لو میں پنکھا جھلتا ہے، ہزاروں دیووں کی طاقت سے زندگی کی عظیم الشان مشینوں کے پہیئے گھماتا ہے اور کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر استری کرتا ہے ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیت مصنفہ واقف نہیں"۔

ظاہر ہے کہ عزیز احمد صاحب کو اس کا افسوس ہے مگر یہ عشق جس سے عزیز احمد صاحب واقف معلوم ہوتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے یہ پنجسالہ سکیموں کے ماتحت تیار کیا ہے اور اب وہ اسے ہر انسان پر عائد کر دینا چاہتے ہیں۔

عزیز احمد صاحب کو خوش کرنے کے لئے میں فرض کر لیتا ہوں کہ عصمت کی ہیروئن ٹریجڈی کیسے وقوع پذیر ہوئی کہ دل سے نہ اُسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔

عصمت واقعی عزیز احمد صاحب کے تصنیف کردہ عشق سے ناآشنا ہے اور اس کی یہ ناآشنائی ہی اس کے ادب کا باعث

ہے۔ اگر آج اس کی زندگی کے تاروں کے ساتھ اس کے عشق کی بجلی جوڑ دی جائے اور کھٹکا دبا دیا جائے تو بہت ممکن ہے ایک اور عزیز احمد پیدا ہو جائے لیکن "تل"۔ "گیندا" اور "بھول بھلیاں" اور "جال" تصنیف کرنے والی عصمت یقیناً مر جائیگی۔

عصمت کے ڈرامے کمزور ہیں۔ جگہ جگہ ان میں جھول ہیں۔ عصمت پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہے تو ناپ کر قینچی سے نہیں کرتی یونہی دانتوں سے چیر پھاڑ کر چیتھڑے بنا ڈالتی ہے۔ پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں۔ اس میں وہ بالکل اجنبی رہتی ہے۔ جنس عصمت کے اعصاب پر ایک مرض کی طرح سوار ہے۔ عصمت کا بچپن بڑا غیر صحت بخش رہا ہے۔ پردے کے اس پار کی تفصیلات بیان کرنے میں عصمت کو ید طولےٰ حاصل ہے۔ عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں سے شغف ہے۔ شخصیتوں سے نہیں اشخاص سے ہے۔ عصمت کے پاس جسم کے احتساب کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ مساس.... عصمت کے افسانوں کی کوئی سمت ہی نہیں..... عصمت کی غیر معمولی قوتِ مشاہدہ حیرت میں غرق کر دیتی ہے..... عصمت فحش نگار ہے.... ہلکا ہلکا طنز اور مزاح عصمت کے شمائل کی ممتاز خوبیاں ہیں.... عصمت تلوار کی دھار پہ چلتی ہے۔

عصمت پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کوئی اسے پسند کرے گا کوئی ناپسند لیکن لوگوں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے زیادہ اہم چیز عصمت کی تخلیقی قوت ہے۔ بری بھی، عریاں مستور جیسی بھی ہے قائم رہنی چاہئے۔ ادب کا کوئی جغرافیہ نہیں۔ اسے نقشوں اور خاکوں کی قید سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہئے۔

عرصہ ہوا دہلی کے ایک ذاتِ شریف درویش نے عجیب و غریب حرکت کی۔ آپ نے "اوروں کی کہانی، سن میری زبانی" "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا"... جیسے عنوان سے شائع کی۔ اس میں میرا، عصمت، مفتی، پریم چند، خواجہ محمد شفیع، اور عظیم بیگ چغتائی کا ایک ایک افسانہ شامل تھا۔ دیباچے میں ترقی پسند ادب پر ایک تنقیدی چوٹ مارو ں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق فرمائی گئی تھی اور اس کارنامے کو اپنے دو ننھے ننھے بچوں کے نام سے معنون کیا گیا تھا۔ اس کی ایک کاپی آپ نے عصمت کو اور مجھے روانہ کی۔ عصمت کو درویش کی یہ ناشائستہ اور بھونڈی حرکت سخت ناپسند آئی۔ چنانچہ بہت بھنّا کر مجھے ایک خط لکھا:

"منٹو بھائی!

آپ نے وہ کتاب جو درویش نے چھاپی ہے دیکھی؟ ذرا اسے پھٹکاریئے اور ایک نوٹس دیجئے۔ نجی طور پر کہ ہر مضمون کا جرمانہ دو سو روپے دو ورنہ دعویٰ ٹھونک دیں گے۔ کچھ ہونا چاہئے۔ آپ بتلایئے کیا کیا جائے..... یہ خوب ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے اٹھا کر ہمیں کیچڑ میں لتھیڑ دیتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہتے۔ ذرا مزہ رہے گا۔ اس شخص کو خوب رگڑیئے۔ ڈانٹئے کر الٹا علمبردار کیوں بن رہا ہے، عریاں ادب کا..... اس نے ہمارے افسانے صرف کتاب فروخت کرنے کے لئے چھاپے ہیں۔ ہماری ہتک ہے کہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے، کم عقلوں کی ڈانٹیں سننا پڑیں۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو سامنے رکھ کر ایک مضمون لکھئے۔ آپ کہیں گے میں کیوں نہیں لکھتی تو جواب ہے کہ آپ پہلے ہیں!"

جب عصمت سے ملاقات ہوئی تو اس کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا: "سب سے پہلے لاہور کے چوہدری

محمد حسین صاحب ہیں ان سے ہم درخواست کریں تو وہ ضرور مسٹر ڈیش پر مقدمہ چلوا دیں گے۔"

عصمت مسکرائی:

"تجویز تو ٹھیک ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم بھی ساتھ ہی دھر لیے جائیں گے۔"

میں نے کہا: "کیا ہوا..... عدالت خشک جگہ سہی لیکن کرنال شاپ تو کافی دلچسپ جگہ ہے..... مسٹر ڈیش کو وہاں لے جائیں گے، اور....."

اور عصمت کے گالوں کے گڑھے گہرے ہو گئے۔

منٹو صاحب حد درجہ "شدید" افسانہ نگار تھے۔ اگر افسانہ نگاروں کو ان کے فن کے مدِ نظر شریر، متین، شریف اور لطیف افسانہ نگار کہنے کی جرأت ہو تو میں منٹو صاحب کو "شدید" افسانہ نگار کہوں گی۔ منٹو صاحب اپنے دور کے بہت بڑے حقیقت پسند تھے اور ہر اس چیز کو شدت سے محسوس کرتے تھے جو انہیں کھٹکتی تھی اور اسی شدت سے اکثر چیزوں کو نظر انداز بھی کر ڈالتے تھے۔ ریشم کی لچھیوں میں اگر سوت کا ایک ننھا سا تاگا بھی نظر آ جاتا تو وہ اس کے گرد اپنے ردِ عمل کا ایک ایسا جال تیار کرتے تھے کہ ان کی خوبی اور نفاست تک اردو افسانہ نگاری کے بہت کم استاد پہنچ سکتے ہیں۔

ہاجرہ مسرور

۶۹

سعادت کے والد منصف تھے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ سعادت کی والدہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ منصف صاحب نے اپنی پہلی اہلیہ کی اولاد کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ کی کہ ان کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم اور ان کی اولاد ـــــ سعادت اور اس کی بڑی بہن ناصرہ اقبال کے لئے کچھ باقی نہ بچا۔ تلخ یادوں کے سوا۔ منٹو کی تحریروں میں بھی کڑواہٹ گھلی ہوئی ہے جیسے قند کی گولیوں میں یکایک کونین کا ٹکڑا آ جائے۔ یہ تلخی کتنی دیر پا تھی اس کا اندازہ منٹو کی موت سے ہو سکتا ہے۔ معاشرہ آدمی کا دوسرا باپ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سے انصاف نہ کر سکا۔ اخلاق کے ٹھیکیدار اسے عمر بھر کچہریوں میں لئے لئے پھرے کہ یہ عریاں نویس ہے۔ فحش نگار ہے۔ یہ جنسی باتوں کے بارے میں لکھتا ہے۔



ابو سعید قریشی



چند مہینے امرتسر میں

باری علیگ

لائلپور میں جب کبھی میں حکیم نورالدین صاحب کے مطب کے پاس سے گزرتا تو وہ مجھے بلا کر اپنے پاس بٹھاتے اور عالمانہ باتیں کرتے۔ میں ادب سے ان کی باتیں سنتا اور کبھی کبھی ادھر ادھر کی بات کر دیتا۔ میرا شمار حکیم صاحب کے ان نوجوان ملنے والوں میں سے تھا جو ان کی تقریروں سے متاثر ہو کر سیاسیات میں ذہنی دلچسپی لینے لگے تھے۔ مارچ ۳۲ء کے ابتدائی دنوں میں ایک ملاقات کے دوران میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ غازی صاحب امرتسر سے روزنامہ "مساوات" جاری کرنے والے ہیں اور انہوں نے تمہیں بلایا ہے تاکہ تم ان کے اخبار میں کام کرو۔

"قبلہ! مجھے تو معمولی قسم کا اخباری تجربہ حاصل ہے میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہارے مضمون جو اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔" حکیم صاحب نے فرمایا۔

"مضمون لکھنے اور اخبار مرتب کرنے میں بڑا فرق ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ غازی صاحب میرے کام سے ناخوش ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا مضمون نویس تھوڑی سی محنت کے بعد اچھا اخبار نویس بن سکتا ہے۔ جاؤ تیاری کرو۔ غازی صاحب سے میرا محبت بھرا سلام کہنا۔"

یہ کہہ کر وہ کسی دوسرے کام میں مصروف ہو گئے اور میں اجازت لیکر وہاں سے رخصت ہوا۔ دو چار دن کے اندر اندر میں نے امرتسر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے پہلے اگرچہ مجھے امرتسر جانے کا موقعہ نہیں ملا تھا پھر بھی جلیانوالہ باغ کے حادثہ نے میرے دل میں امرتسر کے لئے ایک ہمدردانہ احساس پیدا کر رکھا تھا۔

چونکہ ان دنوں ریل کی بہ نسبت لاری کا کرایہ بہت سستا پڑتا تھا اس لئے میں نے ایک سو پچیس میل کا یہ سفر لاری ہی میں طے کیا۔ لاہور پہنچ کر امرتسر کے لئے لاری تبدیل کرنی پڑی۔ اس میں بیشتر لوگ امرتسری تھے جن کی بات چیت کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کا شہر ماضی کی روایات سے وابستہ ہے۔ چونکہ میں ایک ایسے شہر کا رہنے والا تھا جس کا پرانی روایات سے کوئی تعلق نہیں اسلئے امرتسریوں کی ہر بات میری دلچسپی میں اضافہ کرتی۔ دو چار مسافر پشاور، کابل، بخارا اور سمرقند کا یوں ذکر کر رہے تھے گویا امرتسر وسط ایشیا کا کوئی شہر ہے۔ لاری اڈے پر رکی۔ میں تانگے میں بیٹھ کر ہال بازار کی ایک چوڑی اور صاف ستھری گلی میں داخل ہوا۔ "مساوات" ــــ ایک بہت بڑا بورڈ لٹک رہا تھا۔ میں نے دفتر میں قدم رکھا۔ غازی صاحب نے تپاک اور شفقت سے خیر مقدم

گیا۔ دو چار گھنٹے بعد میں نے کام شروع کر دیا۔ چند دن بعد عطا محمد چشتی (بعد حاجی لق لق) بھی ادارتی سٹاف میں شامل ہو گئے تھے۔

چشتی صاحب شکل و شباہت میں ایک فرانسیسی مدبر دکھائی دیتے تھے۔ ایک طویل مدت تک مشرقِ قریب میں رہنے کے بعد حال ہی میں پنجاب لوٹے تھے۔ انگریزی، عربی، فارسی پر اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔ عام طور پر سلکی سوٹ میں ملبوس رہتے۔ وہ اپنے ساتھ عربی زبان کے بہت سے رسائل لے آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے عربی صحافت کی عظمت کا احساس ہوا۔ چشتی صاحب کو ہمارے ہاں کے اخبار زیادہ پسند نہیں تھے۔ ان کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ دنیا کے اس حصے کی سیاست سے ناآشنا تھے لیکن جوں ہی انہوں نے مقامی حالات کو پا لیا وہ ان پر اعلیٰ انداز میں اظہارِ خیال کرنے لگے۔

ایک مرتبہ انہوں نے ایک کاتب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا: "منشی صاحب نے ابھی ابھی چپڑاسی کو سگریٹ کا آدھا پیکٹ لانے کو کہا ہے۔ کیا یہاں بھی ایسا ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔ آپ چاہیں تو ایک سگریٹ بھی منگوا سکتے ہیں۔"

یہ سن کر وہ خاموش رہے۔ لیکن ان کے چہرے پر مسلط شدہ حیرت پکار پکار کر کہہ رہی تھی ——— "یہ کیسا ملک ہے۔"

چشتی صاحب کو آئے ہوئے ابھی چھ سات دن ہوئے تھے کہ غازی صاحب نے مجھ سے کہا کہ ان کا نوکر بھاگ گیا ہے اسلئے مجھے اور چشتی صاحب کو چند دنوں کے لئے بازار ہی میں کھانا کھانا پڑے گا۔

"کوئی حرج نہیں لیکن بازار کس طرف ہے۔" میں نے پوچھا۔

"آپ اتنا بھی نہیں جانتے۔"

"جی نہیں۔"

"آپ کو یہاں آئے ہوئے تین ہفتے ہو چکے ہیں اور ابھی تک آپکو بازار ہی کا پتہ نہیں۔ یہ سامنے ہال بازار ہی تو ہے۔ کیا آپ وہاں کبھی نہیں گئے۔"

"جی نہیں۔ جب سے یہاں آیا ہوں نیچے نہیں اترا۔ پہلے دن تانگے پر سے ہال بازار کی چند دکانوں کو البتہ دیکھا تھا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے تو اخبار کے دفتر کو خانقاہ بنا رکھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے غازی صاحب اپنے کمرے کی طرف چل دیئے اور میں نے چشتی صاحب کو ساتھ لے کر ہال بازار کی راہ لی۔

ہم دونوں طرف کی دکانوں کو دیکھتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ چشتی صاحب نے ایک بورڈ کی طرف اشارہ کیا:

"شیراز ہوٹل"۔

ہم اندر داخل ہوئے تو دو تین میزوں کے اردگرد چند نوجوان جمع تھے۔ ہم اگرچہ کھانے کی طرف زیادہ متوجہ تھے پھر بھی ان نوجوانوں کی باتوں کے ٹکڑے ہمارے کانوں سے ٹکراتے رہے۔ ایک آدھ مرتبہ چشتی صاحب نے ان نوجوانوں سے کچھ کہنا چاہا لیکن میرے اس مشورے کو "مسافروں کو مقیموں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے" مانتے ہوئے چشتی صاحب خاموش رہنے پر رضامند ہو گئے ہم جس بھدے پن سے ہوٹل میں داخل ہوئے تھے اسی طرح وہاں سے باہر جانے کے لئے اٹھے۔ چشتی صاحب آگے نکل گئے اور میں کاؤنٹر پر رک گیا اور مینجر سے کہا: "بھئی کیسے صاحب ——— ہم دونوں "مساوات" میں کام کرتے ہیں۔ اگر ہم کبھی کبھار

چائے وغیرہ منگوائیں تو بھجوا دیا کیجئے"۔

میری اس درخواست کے ساتھ ہی کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے خوش پوش انسان نے کہا:

"مجھے عزیز کہتے ہیں"۔

"عزیز شیرازی۔" میں نے کہا۔

مینجر نے کہا: "نہیں صاحب۔ خاکسار کو عزیز احمد امرتسری کہتے ہیں۔ اور آپ کی تعریف!"

اس پر میں اپنا اور چشتی صاحب کا نام بتا کر عزیز سے رخصت ہوا۔

رات کے کھانے کے لئے ہم پھر "شیراز" گئے۔ کھانے کے بعد جب ہم قہوہ پی رہے تھے تو عزیز صاحب نے ہماری میز پر آ کر ہمارا حال احوال پوچھا اور اس کے بعد قریب والی میز پر بیٹھے ہوئے حضرات سے ہمارا تعارف کرایا:

"آپ ہیں سعادت حسن منٹو، آپ ہیں مشہور فوٹو گرافر عاشق اور آپ ہیں امرتسر کے ادیب جناب سلیس"۔

ان دنوں اختر شیرانی کے بڑے چرچے تھے اور عزیز صاحب ان کے بہت زیادہ نیاز مند تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ہم صرف اختر شیرانی کی ذات سے متعلق باتیں کریں۔ لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس نامور شاعر کو اس وقت تک ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا اس لئے ہم اپنے نئے دوستوں کی باتیں سنتے رہے جو اختر شیرانی کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد رومانیت کی جگہ سیاسیات موضوع بن گیا۔ اسی اثنا میں ایک صاحب تشریف لائے جن کا "آیئے وکیل صاحب" کہہ کر خیر مقدم کیا گیا۔ باتوں باتوں میں "سزائے موت" نے ایک موضوع کی صورت اختیار کر لی۔ وکیل صاحب نے اس موضوع پر قانونی بحث کی۔ سعادت حسن نے مجھے اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ میں نے وکٹر ہیوگو کی ایک تقریر جس کا ترجمہ "الہلال" (کلکتہ) میں چھپ چکا تھا۔ اور ہیوگو ہی کی ایک کتاب "موت کی سزا پانے والے کے آخری دن" کا حوالہ دیتے ہوئے چند منٹ تک بات کی۔

"یہ کتاب میرے پاس ہے۔ کیا آپ اسے دوبارہ پڑھنا چاہتے ہیں"۔ سعادت نے کہا۔

اگلے دن اس کتاب کو بغل میں دبائے سعادت میرے دفتر میں پہنچ گئے۔ میں نے ان سے کتاب لے کر رکھ لی۔ سعادت کے عین سامنے کاتب حضرات ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر کاتب کے سر پر بجلی کا ایک بلب لٹک رہا تھا۔ وہ زرد کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھنے میں معروف تھے۔ نووارد نوجوان اس منظر سے حیرت زدہ تھا۔ مجھ سے اجازت لینے کے بعد وہ کاتبوں کی نشست کے قریب چلا گیا۔ وہ کبھی زرد کاغذ کو اور کبھی ان کے آہنی قلم کو ہاتھ میں لے کر انہیں غور سے دیکھنے کے بعد کاتبوں پر نظر دوڑاتا اور پھر میری طرف بھی نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتا۔ پانچ دس منٹ کے بعد سعادت صاحب میرے پاس چلے آئے۔ وہ گپ شپ کرنا چاہتے تھے لیکن "کاپی" کا وقت قریب تھا اس لئے میں نے میز پر پڑے ہوئے دو چار میگزین ان کی طرف بڑھاتے ہوئے پندرہ منٹ کیلئے معذرت چاہی۔ وہ اگرچہ انہیں دیکھنے تک کے روادار نہیں تھے لیکن از راہِ مروت ورق الٹنے میں معروف ہو گئے۔ اسی اثنا میں میں اپنی میز پر کاپی جوڑنے میں معروف ہو گیا۔ انہوں نے میگزین پھینک دیا اور اخباری لے آؤٹ کے اس عمل کا تماشا کرنے لگے۔ تماشا ختم ہو گیا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ ہم میں سے کوئی بھی زیادہ دیر تک رسمی باتیں نہ کر سکا۔ اس ملاقات نے ہمیں ایکدوسرے کے قریب کر دیا۔ ہم دوست بن چکے تھے۔

دوچار دن کے بعد سعادت پھر میرے دفتر میں آئے۔ اتفاق سے میرے میز پر کسی مقامی سینما کا "پریس پاس" پڑا ہوا تھا۔ جونہی ان کی نظر اس پر پڑی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں فلم دیکھنے کب جاؤں گا۔ چونکہ مجھے اس فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور چاہتا تھا کہ دوسرے کو بھیج دوں اس لئے میں نے سعادت کو یہ فلم دیکھنے پر آمادہ کر لیا۔ بشرطیکہ وہ واپسی پر اس سے متعلق چند سطریں لکھ دیں اگلے دن مساوات میں ہمارے فلمی نامہ نگار کے قلم سے جو چند سطریں شائع ہوئیں ان سے میرا دوست بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس واقعہ کو سولہ سال گزر چکے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان سطروں کی اشاعت ہی نے سعادت کے اندر چھپے ہوئے "افسانہ نگار منٹو" کو بیدار کیا تھا۔

اب میں امرتسر کے مقامی جغرافیہ سے بہت حد تک واقف ہو چکا تھا۔ شمال سے جنوب تک امرتسر کے ضلع کی لمبائی تقریباً ساٹھ میل۔ مشرق سے مغرب تک اس کی چوڑائی اس کے طول سے کوئی پانچ سات میل کم ہوگی۔ یہ ضلع جو باری دوآب کے شمالی علاقے میں شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے بظاہر ایک ہموار میدان دکھائی دیتا ہے لیکن اصل میں یہ میدان بیاس کی طرف اونچا ہوتا چلا جاتا ہے۔ راوی کے قریب باون فٹ کھدائی کے بعد پانی نکل آتا ہے۔ پہاڑی سلسلے کے قریب، جنگلوں کی زیادتی، کاشت کی کثرت، نہروں اور دریاؤں کی موجودگی، مئی اور ستمبر کے درمیانی دنوں کو بھی معتدل بنا دیتی ہے۔ میں گرمیوں کے موسم میں لاہور اور امرتسر کی آب و ہوا کے اس فرق کو صاف محسوس کر رہا تھا۔ مئی کے ابتدائی دو ہفتوں میں بھی امرتسر کے موسم کو لاہور میں وسط اپریل کے موسم سے بہتر پایا۔

جہاں امرتسر کا موجودہ شہر ہے وہاں پرانے وقتوں کے کسی شہر کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ پھر بھی اسی ضلع میں ایک گاؤں کا نام سانگلہ بتایا جاتا ہے۔ جب سکندر اعظم نے راوی کو عبور کیا تو سانگلہ کے حکمران نے اس کا سخت مقابلہ کیا۔ لائل پور اور شیخوپورہ کے درمیان بھی اسی نام کا ایک چھوٹا سا شہر آباد ہے لیکن اگر سکندر کے فوجی راستے اور راوی کے عبور کو پیش نظر رکھا جائے تو ضلع امرتسر کے اسی گاؤں کے حق میں یہ فیصلہ دیا جا سکتا ہے کہ اس کے حکمران ہی نے سکندر کی فوجوں کا مقابلہ کیا ہوگا۔

اسی اثناء میں میں ابو سعید قریشی اور حسن عباس سے بھی متعارف ہو چکا تھا۔ یہ دونوں سعادت کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔ ہم چاروں شام کے وقت رام باغ میں سیر و تفریح کے لئے جانے لگے۔ یہ باغ امرتسر کی سول لائنز کے شمال مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اسی جگہ بھنگی نسل کے سرداروں نے ایک کچا قلعہ بنوا رکھا تھا لیکن ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس قلعے کو گرا اس جگہ ایک باغ لگانے کا حکم دیا۔ دو سال کے بعد جب یہ باغ تیار ہوا تو مہاراجہ نے اس کا نام رام باغ رکھا۔ اس باغ کے اردگرد کی فصیل کے آثار کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ باغ کو حملہ آوروں سے بچانے کے لئے دو بڑے بڑے دروازوں کو برجوں کے ذریعے ملا دیا گیا تھا۔ یہ دونوں دروازے ابھی تک موجود ہیں۔ اندرونی دروازے کے اوپر لال پتھر کی بنی ہوئی ایک بارہ دری کے علاوہ مہاراجہ کی بنائی ہوئی چند ایک اور عمارتیں بھی ابھی تک باقی ہیں۔ ان عمارتوں کے لئے فقیر عزیز الدین نے دلی سے کاریگر منگوائے تھے۔ رام باغ یقیناً ایک عمدہ باغ اور اچھی سیرگاہ ہے۔ اس خوبصورت باغ اور "ٹھنڈی کھوئی" کے درمیان صرف ایک سڑک کی چوڑائی حائل تھی۔ سیر کرنے والے ٹھنڈی کھوئی کا میٹھا پانی پیئے بغیر واپس نہیں جاتے تھے۔ اس کنوئیں سے متصل حلوائی کی دکان پوریوں کچوریوں اور مٹھائیوں کے لئے بہت مشہور تھی۔ ہم میں سے ایک کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ ہمیں ڈیڑھ دو روپے کی پوری کچوری کھلانے کے بعد حلوائی کو آٹھ دس آنے میں ہی ٹر خا دیتا۔ سیر کرنے والی اس ٹولی میں دوچار اور صاحب بھی داخل ہو چکے تھے۔

ایک رات اسی باغ میں یہ طے پایا کہ "فری تھنکرز" کے نام سے ایک حلقہ بنایا جائے۔ اس حلقے کے قواعد وضوابط جوانی اور ناتجربہ کاری کی حماقتوں کا مجموعہ تھے۔ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ کم سے کم دو ممبر مل کر دوپہر کے وقت ہال بازار کا چکر کاٹیں۔

۲۔ راستے میں ایک دوسرے سے بات نہ کریں۔ غیر ممبروں سے بات چیت کرنے کی اجازت ہوگی۔

۳۔ ہر ممبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ گرمیوں میں فلالین کی پتلون اور خاکی قمیض پہنے۔

۴۔ دن میں ایک مرتبہ بازار میں کھانا کھائے۔

۵۔ سال میں صرف چار مرتبہ سر کے بال کٹوائے۔

۶۔ لسی نہ پئے۔

۷۔ مہینے میں ایک مرتبہ کسی غیر ممبر کو بے وقوف بنائے

ایک شام ہم میں کسی کو یہ توفیق نہیں تھی کہ وہ کسی دوسرے کو کھانا کھلا سکتا۔ اس معاشی بحران پر قابو پانے کے لئے ہم چاروں نے پُول کیا۔ کل رقم پونے چھ آنے سے زیادہ نہیں تھی۔ جونہی ہم ریلوے پل سے نیچے اترے۔ ہم نے ایک شخص کو چٹائی بچھائے دال روٹی بیچتے دیکھا۔ ایک نے آگے بڑھ کر اسے آرڈر دینا چاہا لیکن وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ ادھر ہم چٹائی پر بیٹھے ادھر اس کی گھبراہٹ ختم ہو گئی۔ حسن عباس، ابوسعید قریشی، سعادت حسن اور میں نے ساڑھے چار آنے میں کھانا کھایا۔ دو پان اور دو سگریٹ خریدنے کے بعد ایک پیسے کو داشتہ آید بکار کی خاطر جیب میں رکھ لیا۔ لیکن بہت جلد ایک صدائے اس پیسے کو ہماری جیب سے نکال کر ایک اندھے کی جیب میں ڈال دیا۔

ایک مرتبہ "فری تھنکرز" کے تقریباً سارے ممبر احمق سازی کا کوٹہ پورا کر چکے تھے۔ سعادت اپنی ناکامی پر نادم ہو رہا تھا کہ عاشق فوٹوگرافر شیراز میں آدھمکا۔

"آئیے آئیے آرٹسٹ صاحب" کہتے ہوئے سعادت نے عاشق کا خیر مقدم کیا۔ سعادت کو شرارت سوجھ چکی تھی۔ وہ اشاروں ہی اشاروں میں ہم سے کہہ گیا کہ ہم اس کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سعادت لاہور کی تعریف کرنے لگا۔ عاشق اپنے امرتسری ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ سعادت نے موسم کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا کہ:

"یہ بات لاہور ہی کو نصیب ہے کہ وہاں ٹریفک پولیس والوں کو برف کے کوٹ پہنائے جا چکے ہیں۔"

"بکواس ہے۔" عاشق نے کہا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ سائنس کا زمانہ ہے۔ اگر برقی قوت سے پنکھے چل سکتے ہیں تو برف کے کوٹ بنا لینا کون سا مشکل ہے۔" سعادت نے پورے وثوق اور یقینی انداز میں جواب دیا۔

عاشق کے گہری سوچ میں پڑ جانے سے موضوعِ سخن بدل دیا گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ہم لوگ منتشر ہو گئے۔

اگلے دن شام کے وقت سعادت شیراز میں اصرار کر رہا تھا کہ وہ عاشق کو احمق بنا چکا ہے لیکن دوسرے لوگوں کی یہ رائے تھی کہ عاشق کی خاموشی کو نیم رضا سے آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ احمق سازی کے اصولوں پر باتیں ہو رہی تھیں کہ عاشق بجلی کی سی تیزی کے ساتھ داخل

ہوا اور ایک کف گیر اٹھا کر سعادت کے سر پہ دے مارا۔ سعادت نے چاٹ کی پیالی سے وار کیا۔ دونوں گتھم گتھا تھے۔ گھونسوں کی لڑائی ہونے لگی۔ جب دونوں کے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا تو ہم لوگ انہیں "چھڑانے" میں کامیاب ہوگئے۔

"کیا بات ہے عاشق صاحب۔ بتلایئے کیا ہوا۔"

"مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے" ___ اس نے ذرا رک کر کہا ___ "میں ابھی ابھی لاہور سے آرہا ہوں۔ وہاں کسی ٹریفک والے کے پاس برف کا کوٹ نہیں۔ کیا میں پاگل ہوں"۔

"نہیں! ہرگز نہیں۔ آپ تو بڑے عقلمند ہیں۔ پاگل تو سعادت ہے جو ایسی فضول باتیں کرتا رہتا ہے۔" کسی نے کہا۔

"میں اسے چھوڑنے کا نہیں۔ وہ سبق پڑھاؤں گا جو ساری عمر یاد رکھے"۔ کہتے ہوئے عاشق نے سعادت کو مُکا دکھایا۔

چند منٹ بعد متحارب فریقین میں صلح ہوگئی۔ مرہم پٹی کے لئے دونوں ایک ہی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے تھے۔

اسی زمانے میں سیاسیات میں بائیں پن کے رجحانات داخل ہو رہے تھے۔ نوجوانوں نے جو تحریکیں چلانی چاہی تھیں انکی ناکامی کے بعد کچھ لوگ یہ چاہتے تھے کہ سیاسیات کو حد سے بڑھے ہوئے جذباتی محرکات سے الگ کر دیا جائے۔ اس کام کیلئے جس فکری رہنمائی کی ضرورت تھی اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا تھا۔ چند سیاسی ورکروں نے اس ضرورت کو پورا کرنا چاہا انہوں نے اپنے خیال کے مطابق سیاسیات کو سائنسی رنگ دینے کے لئے اینٹی امپیریلسٹ لیگ کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی مجھے بھی اس جماعت کے ایک اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ یہ اجلاس جلیانوالہ باغ کی مغربی سمت کے ایک تاریک کمرے میں ہوا۔ یہ وہی باغ تھا جہاں ۱۲۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو جنرل ڈائر کے حکم سے ان لوگوں پر گولی چلائی گئی تھی جو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ستیہ پال کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ اجلاس میں شامل ہونے والوں کی تعداد آٹھ دس اشخاص سے زیادہ نہیں تھی۔ اس اجلاس میں سیاسیاتِ حاضرہ کا جو تجزیہ کیا گیا تھا اسے میں مشکل سے بیس فیصدی سمجھ سکا۔ لیکن مقامی حالات پر بین الاقوامی حالات کے اثرات پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آئے۔ اجلاس سے رخصت ہونے کے بعد ہال بازار میں اختر شیرانی مرحوم سے پہلی ملاقات ہوئی۔

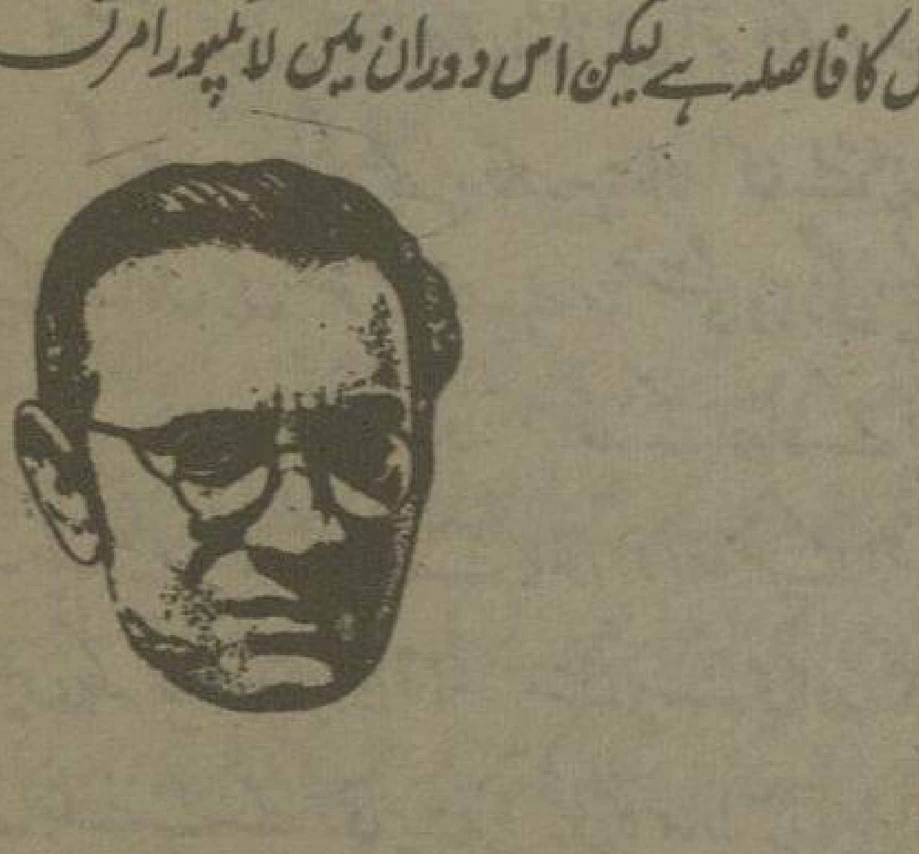
اختر شیرانی کے عقیدتمندوں کی ایک تعداد "شیراز" میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے بھی شیرانی صاحب نے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے شیراز میں پہنچ گئے۔ اس مجلس میں اختر شیرانی نے لسانیات پر فاضلانہ بحث کرتے ہوئے اردو زبان پر پشتو گرامر کے اثرات کی وضاحت کی۔ اختر شیرانی کی آنکھوں کی چمک اور ان کے چہرے کا بھولا پن ان کی شخصیت کو چار چاند لگا رہا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب اختر شیرانی کی شاعری کے بہت چرچے تھے اور ان کی ذاتِ گرامی سے ہزاروں افراد کو عقیدت تھی۔ میں بھی ان عقیدتمندوں میں سے تھا۔

"فری تھنکرز" کا شیرازہ بکھر گیا۔ سوچ بچار نے حماقتوں اور شرارتوں کی جگہ لینی چاہی۔ ہم لوگ بھی ذرا سیریس ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں سعادت نے وکٹر ہیوگو کی کتاب کا ترجمہ کر لیا تھا۔ سعادت ہی کے کہنے پر میں نے مسودے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھ ڈالا۔ ترجمہ اچھا خاصا تھا۔ چند ماہ بعد یہ ترجمہ اردو بک سٹال لاہور کی طرف سے شائع ہوگیا۔ اس ترجمے کی اشاعت سے سعادت کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب اس نے روسی افسانوں کے تراجم شروع کئے۔ اس کی پہلی کوشش کی کامیابی

کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جناب حامد علی خان نے اسے "ہمایوں" میں جگہ دی۔ روسی افسانوں کے ترجموں کے اس سلسلے کو سعادت نے تین چار سال بعد تک بھی جاری رکھا۔ سعادت کے اچانک ادیب بن جانے سے جہاں اس کے ملنے والوں کے ایک حلقے میں حیرت، گھبراہٹ اور حسد کے جذبات پیدا ہو چکے تھے وہاں اس کے دو دوست سعادت کی اس صلاحیت پر بہت خوش تھے ـــــ یہ تھے ابو سعید قریشی اور حسن عباس۔ سعادت حسن منٹو کی نئی علمی سرگرمی اور "ہمایوں" میں اس کے ترجمہ کئے ہوئے افسانوں کی اشاعت نے ان دونوں میں لکھنے کا شوق پیدا کر دیا۔ چنانچہ ان تینوں نے مل کر آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامہ "ویرا" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے "ویرا" کے اس ترجمے کو امرتسر ہی کے ایک کتب فروش نے چھپوایا تھا۔ اس کتاب کی پبلسٹی کے لئے میں نے اشتہار کا جو مضمون بنایا اسے پبلشر نے قد آدم پوسٹروں پر چھپوا کر امرتسر کے گلی کوچوں کی دیواروں پر چسپاں کروا دیا۔ پبلک ان پوسٹروں سے زیادہ دیر تک ہراساں نہ کی جا سکی کیونکہ اگلے دن پولیس نے انہیں دیواروں پر سے اتروا دیا۔ میں اور سعادت اس شخص کا پیچھا کرتے کرتے جو ان پوسٹروں کو اتار رہا تھا، دربار صاحب تک پہنچ گئے۔ اس عمارت کو دیکھنے کے لئے ہم دونوں اندر چلے گئے۔ شہر امرتسر اور ضلع امرتسر میں بہت کم آثارِ قدیمہ دکھائی دیتے ہیں۔ فتح آباد، نورنگ آباد اور سرائے امانت خان میں ازمنۂ وسطیٰ کی چند سراؤں کے کچھ آثار باقی ہیں۔ امرتسر شہر میں مسجد خیر الدین بلاشبہ ایک خوبصورت عمارت ہے لیکن اسے بنے ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔

اس اثناء میں "مساوات" بند ہو گیا۔ میں سعادت کے ہاں چلا گیا۔ سعادت کا وسیع مکان کوچہ وکیلاں میں واقع تھا۔ اس مکان کے عقبی حصے کے ایک کمرے کو آراستہ کرنے کے بعد ہمارا زیادہ وقت اسی کمرے کے اندر لکھنے پڑھنے میں صرف ہونے لگا۔ ابو سعید قریشی اور خواجہ حسن عباس بھی اسی کمرے میں بیٹھ کر افسانے لکھتے۔ میں نے بھی اپنی پہلی کتاب "انقلابِ فرانس" کے چند صفحے اسی جگہ لکھے تھے۔ کمرے کے دروازے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے۔ اس کمرے میں آنے جانے والوں پر اس کے سوا اور کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے یا باہر نکلتے وقت دوسروں کے کام میں مخل نہ ہوں۔ اسی کمرے میں چند ہفتے قیام کرنے کے بعد میں ستمبر ۳۳ء میں لائلپور پہنچ گیا۔

سن انیس سو تینتیس اور انیس سو پچاس میں صرف سولہ سال کا فاصلہ ہے لیکن اس دوران میں لائلپور امرتسر سے کس قدر دور ہو گیا ہے۔



منٹو اور اس کا فن

ممتاز مفتی

حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک نشست میں منٹو نے اپنے مقالے "منٹو از سعادت حسن" میں کہا تھا:

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ سعادت حسن مر جائے، منٹو زندہ رہے۔"

آج سعادت حسن کا انتقال ہو گیا ہے اور منٹو کا نام زبان زدِ خلق ہے اور مجھے منٹو کا وہ جملہ یاد آ رہا ہے —— اور یہ بھی ممکن ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو زندہ رہے۔

منٹو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اپنی تخلیقات کی وجہ سے منٹو وقت اور زمانے کی دست برد سے بالاتر ہو چکا ہے۔ سعادت حسن کے انتقال کی وجہ سے منٹو مزید فن پارے تخلیق کرنے سے محروم ہو چکا ہے لیکن اس کی گزشتہ تخلیقات نے اسے دنیائے اردو ادب میں ایک ایسا مقام بخش دیا ہے کہ منٹو ہمیشہ زندہ رہے گا۔

منٹو کو یہ ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ منٹو مر جائے اور سعادت حسن پیچھے رہ جائے۔ ممکن ہے سعادت حسن کی روح اس بات پر خوشی محسوس کر رہی ہو کہ آج منٹو کا نام زبان زدِ خلق ہے۔

ہمیشہ سے یہ میرا خیال رہا کہ افسانہ نویسی، فنکاری کی نسبت کاریگری سے زیادہ قریب ہے کیونکہ میری رائے میں افسانہ نویس کو مسلسل محنت سے مناسب تفاصیل کو جوڑنے کا کام سرانجام دینا ہوتا ہے۔

لیکن منٹو سے مل کر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ منٹو کا طریقِ کار اس امر کا شاہد تھا کہ شاعری کی طرح افسانہ بھی "آمد" کے زور پر لکھا جا سکتا ہے۔ اسے تفصیلات سوچنے اور انہیں مناسب طور پر جوڑنے کی حاجت نہ تھی۔ وہ ایک کاغذ لیتا تھا اور اپنے قلم سے ۷۸۶ لکھ کر افسانہ لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ نہ تو اس نے کبھی اپنے کرداروں کے متعلق سوچا تھا اور نہ نقطۂ عروج کے متعلق۔ پہلا جملہ لکھنے کے بعد اس کے قلم میں روانی پیدا ہو جاتی اس کی آنکھیں متبسم ہو جاتیں اور وہ لکھے چلا جاتا۔ غالباً فقرہ لکھنے سے پہلے اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا لکھنے والا ہے اور فقرہ لکھ کر منٹو نے کبھی اسے کاٹا نہ تھا۔

منٹو کے تخیل میں بجلی کی سی تیزی اور چمک تھی۔ اس کا مشاہدہ بے حد وسیع تھا۔ اس کی نگاہ میں مناسب تفصیل کو پا لینے کی صلاحیت تھی اور اس کا قلم بے تکان تھا۔

ایک مرتبہ بمبئی میں کرشن چندر نے ہنس کر کہا تھا کہ:

"منٹو اپنے قلم پر قادر نہیں"۔

اور منٹو نے اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ ہلا کر جواب دیا تھا:

"مگر میرا قلم مجھ پر قادر ہے اور اسی لئے میں لکھتا ہوں"۔

منٹو کے افسانوں میں منٹو کی طبعی بے ساختگی و تازگی، چمک اور بے باکی کا پرتو ہے۔

ایک سادہ ورق، قلم اور بسم اللہ کے اعداد کے بل بوتے پر منٹو نے ایسے ایسے شاہکار تخلیق کئے ہیں جن کی وجہ سے منٹو ہمیشہ ایک عظیم فنکار سمجھا جائے گا اور دورِ حاضر کے افسانہ نویسوں میں اس کا نام پیش پیش رہے گا۔ وہ صرف افسانہ نویس ہی نہیں بلکہ ایک باغی بھی تھا۔ رجعت پسندی اور رسمی نقطۂ نظر کے خلاف منٹو نے ہمیشہ بغاوت کی۔ اس نے اپنے تخیل کو قابلِ قبول بنانے کے لئے کبھی پردہ یا تمثیل کا سہارا نہیں لیا۔ اس نے ہمیشہ بے باکی سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

فن کے علاوہ منٹو کی شخصیت بے حد انوکھی اور جاذب تھی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے منوں برقی قوت ایک چھوٹے سے جسم میں مقید کر دی گئی تھی۔ اس کی حرکات اضطرابی تھیں۔ اس کے جسم کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ گفتگو کے دوران میں اس کے

ہاتھ چلتے، آنکھیں ناچتی تھیں اور چہرے پر اظہار کے مختلف روپ یوں آتے جاتے رہتے تھے جیسے کوئی متحرک تصویر ہو۔ غالباً اس لئے کہ خالی الفاظ اس کے تخیل کا اظہار نہیں کر سکتے تھے اور اظہار کی وسعت اور جذبات کی شدت کی وجہ سے وہ باقی اعضاء سے بھی مدد لیتا تھا۔ اس کی انفرادیت شوخ رنگوں میں ظاہر ہوتی تھی اور اس کی شخصیت بھڑک کر جلتی تھی۔

مجھے یاد ہے جب میں بمبئی گیا تو میں نے منٹو سے مل کر اظہارِ افسوس کیا۔ میں نے کہا:

"منٹو! سنا ہے تمہارے ہاں چوری ہو گئی ہے"۔

وہ اپنی طبعی خوش مزاجی سے بولا: "ہاں"۔

"کتنا نقصان ہوا ہے"۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہی کوئی پانچ ہزار کا"۔ وہ بولا

"ہائیں"۔ میں نے حیرانی سے کہا۔ "میں نے تو سنا ہے اڑھائی ہزار کی چوری ہوئی ہے"۔

"ہاں"۔ وہ بولا۔ "چوری تو اڑھائی ہزار کی ہی ہوئی تھی۔ باقی اڑھائی ہزار غم غلط کرنے پر لگا"۔

اس کی بات کو سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ کتنی بڑی حقیقت کا اس نے یوں سرسری طور پر اظہار کر دیا تھا۔ اپنے غم غلط کرنے کے لئے ہمیں کتنی بڑی قیمت دینی پڑتی ہے۔

آج منٹو ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہے لیکن منٹو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جب تک ادب رہے گا منٹو کا نام صفحاتِ ادب میں زندہ جاوید رہے گا۔ منٹو کا وہ خیال آج حقیقت کے روپ میں ہمارے سامنے ہے اور مجھے اس کا وہ جملہ یاد آ رہا ہے:

"بہت ممکن ہے سعادت حسن مر جائے اور منٹو زندہ رہے"۔



چند یادیں

شورش کاشمیری

منٹو سب کے دوست تھے۔ وہ دوست بننے یا بنانے میں چنداں تکلف نہ برتتے۔ پہلے تعارف ہی میں یارِ غار نظر آتے۔ پاکستان بنا تو ابتدائی دنوں میں وہ ساحر لدھیانوی کے ہمراہ دفتر آزاد میں تشریف لائے۔ میں ان دنوں آزاد کا ایڈیٹر تھا۔ مصافحہ کیا اور بے تکلف ہو گئے۔ وہیں ترقی پسند کانفرنس کی صدارت کے لئے ان کا نام تجویز ہوا۔ میں نے چائے پیش کی تو مسکرائے۔ انہیں شعر و شاعری سے کچھ واجبی ہی سا تعلق تھا۔ پھر بھی جوشؔ کا ایک شعر چائے کی پیالی کے منہ پر طمانچے کی طرح رسید کیا۔

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں

کہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

میں خاموش ہو رہا۔ میرے لئے سگریٹ کا دھواں ہی پریشان کن ہے ادھر یہاں شراب کی طلب تھی۔۔۔ ساحر نے

خدا جانے کان میں کیا کہا کہ مطالبہ کبابوں پر آ ٹھہرا۔ میں نے ملازم سے کہا۔ وہ کباب لے آیا اور سیر ہو کر چلے گئے۔ اگلے دن علی الصبح پھر موجود تھے۔

"بھئی یہ خطبہ تیار ہو گیا ہے۔ ذرا ایک نظر ڈال لو۔ آپ لوگ خطیب ہو"۔

میں نے کہا: "آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ منٹو کا خطبہ اور میں دیکھوں"۔

اصرار کیا۔ "نہیں ایک نظر ـــــ پبلک کا معاملہ ہے"۔

ظاہر ہے کہ اس میں ان کا تیکھا اندازِ بیان موجود تھا۔ میں نے صاد کیا تو قہقہہ لگایا۔ اور کہا:

"اچھا ایک دس روپے کا نوٹ نکالو"۔

میں نے دس روپے کا نوٹ نذر کیا۔ ایک ردی کاغذ کی طرح اٹھایا اور چلے گئے۔

میں سورج چھپتے ہی ساحر کے ہاں پہنچا تو میز پر بوتل رکھی تھی اور تکوں سے شاد کام ہو رہے تھے ـــــ منٹو دیکھتے ہی اچھلے ـــــ "آ گئے! تمہارا نوٹ کارگر ہو گیا۔ بلا واسطہ نہ سہی بالواسطہ سہی"۔

انہوں نے یہ الفاظ اس تیزی سے کٹے پھٹے لہجہ میں کہے کہ میں نے سوچے سمجھے بغیر کوئی مصرع جڑ دیا۔ منٹو نے پیگ حلق سے نیچے کیا اور میں ان کے شگفتہ چہرے کی طرف دیکھتا رہا جو شراب سے اور بھی نکھر رہا تھا۔ اسے کہتے ہیں:

مال حلال بود بجائے حرام رفت

میں نے منٹو سے ازرہِ شرارت کہا اور منٹو نے کھٹ سے مصرع پلٹا:

"اوبے نہیں۔ مالِ حرام بود بجائے حلال رفت"۔

اور پھر خود ہی اس کی توضیح میں لگ گئے "حرام حرمت سے ہے اور حلال سے مراد ہے صبوحی۔ اور اب ذرا اس پر غور کرو کہ تم صحافی اور خطیب لوگ الفاظ استعمال نہیں کرتے ان سے چار چار نکاح پڑھاتے ہو" ـــــ منٹو کے حواس اور زبان دونوں بے قابو تھے۔

ان میں اور اختر شیرانی میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ مثلاً دونوں شراب کی نذر ہو گئے۔ دونوں نے اس طرح پی کر ان کی زندگی میں سے شراب نکال دی جائے تو ایک چوتھائی رہ جاتی ہے ـــــ دونوں میں انا تھی۔ اختر تو دل رکھاؤ کی بات بھی کر لیتے تھے۔ مثلاً عدم مل گئے تو اس سے کہا:

"عدم۔ تم غزل کے بادشاہ ہو۔ میں نظم کا شہنشاہ"۔

لیکن منٹو میں یہ تکلف بھی نہ تھا یعنی اپنے سوا کسی کو شاذ ہی مانتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اس برصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نویس سمجھتے تھے اور ان کا یہ دعوے کسی حد تک درست بھی تھا لیکن وہ اپنے معاملہ میں سخت غیر روادار تھے۔ ترقی پسندوں سے انکی جھڑپ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ کسی صف میں شریک ہو کر نہ تو اپنی انفرادیت کھونا چاہتے تھے اور نہ انہیں پارٹی فیڈیٹ قبول تھا۔ ان کا خیال تھا ـــــ یہ "ہدایت نامہ خاوند" کوئی منفرد ادیب گوارا نہیں کر سکتا ـــــ انہیں نعرہ بازی سے سخت نفرت تھی۔ وہ بے تحاشا اور بے روک لکھنے کے عادی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک زندگی کی مکروہ صورتیں کو سامنے نہ لاؤ، اور

عوام کو ان کی زبان میں انہی کے زخم نہ دکھاؤ۔ یہ معاشرہ کبھی اصلاح پذیر نہیں ہوگا۔ وہ اس دور میں وعظ کے قائل نہیں بلکہ طنز کے قائل تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ برہنہ معاشرے کو برہنہ گوئی ہی سے زچ کیا جا سکتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے ان کے کسی فیچر پر تعارفی نوٹ میں لکھا کہ:

"منٹو مومن کی طرح سوچتا اور کافر کی طرح لکھتا ہے"۔

تو بہت خوش ہوئے اور کہا۔ "یہ بات تم نے ٹھیک لکھی ہے"۔

وہ اس تیزی سے لکھتے تھے جیسے کوئی بدیہہ گو شاعر شعر کہتا ہے۔ ان آخری برسوں میں انہیں مختلف الاصل ضرورتوں نے خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ ان کا کوئی تیس روپے روز کا خرچ تھا جب تک پورا نہ کر لیتے چین نہ پڑتا۔ اس ضرورت ہی نے انہیں زود نویس بنا ڈالا۔ انہوں نے ایک ایک نشست میں طویل سے طویل افسانہ ہی ختم نہیں کیا بلکہ بسا اوقات ایک ہی نشست میں کئی افسانوں کا مجموعہ لکھ ڈالا۔ ناشر کے پاس لے گئے۔ پیسے کھرے کئے اور دوسرے مجموعہ کی تیاری میں لگ گئے۔

ان کا یہ اصول تھا کہ پہلے مختلف رسائل و جرائد کے پاس علیحدہ علیحدہ قیمت پر افسانے بیچتے۔ پھر کسی ناشر کے پاس ان کا مجموعہ! اور اس طرح ایک معقول رقم پیدا کر لیتے۔ لیکن جو کماتے اس کا بہت بڑا حصہ شراب کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ ان کی زندگی انہی الّلے تللّوں کا ایک دلچسپ مرقع تھی۔

میں انہیں تب سے جانتا ہوں جب وہ پہلے پہل لاہور آئے اور باری علیگ کے ساتھ چنگڑ محلہ میں لدھیانہ لانڈری کے اوپر تین یا چار روپے ماہانہ کی ایک کوٹھڑی میں رہنے لگے۔ یہ ان کے کھلنڈرے پن کا زمانہ تھا۔ اردو بک سٹال کے یعسوب الحسن پیرِ مغاں تھے۔ انہوں نے اس چنڈال چوکڑی کی معیت ہی میں شاہد و شراب کے تجربے شروع کئے اور بمبئی پہنچ کر تو تارو ہو گئے۔

ایک دفعہ نگینہ بیکری میں منٹو کا ذکر ہو رہا تھا۔ باری مرحوم بھی موجود تھے۔ کہنے لگے:

"کل تک تو منٹو ہمارے ساتھ محض ایک یار باش تھا۔ آج وہ سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ اس کی شہرت پر رشک آتا ہے"۔

میں ان سے بمبئی میں ملا تو ـــــ وہ موڈ میں نہ تھے اور میں بھی کچھ غبیہ حاضر سا تھا۔ پاکستان بنا تو لاہور کی ملاقاتیں دوستانہ سانچے میں ڈھلنے لگیں۔

ترقی پسند کانفرنس گزر گئی۔ میں نے 'آزاد' چھوڑ دیا۔ چٹان نکالا۔ ایک روز دفتر میں بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ـــــ گھرر، گھرر، گھرر۔

"شورش دوڑو۔ دو چار آدمی ساتھ لے آؤ۔ یہ بحالیات والے مکان خالی کروانا چاہتے ہیں"۔

لیکن بحالیات والوں کی سمجھ میں یہ بات جلد ہی آ گئی کہ منٹو کون ہے اور اس سے مکان خالی کرانا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے۔

جن دنوں میں "اس بازار میں" لکھ رہا تھا، منٹو سے اکثر ملاقات ہوتی۔ ایک دن مجھے کہنے لگے: "تم نے بہت دلی

لگا دیتے۔ اگر تم نہیں لکھ سکتے تو اس نام سے میں لکھوں گا اور اس بازار ہی پہ لکھوں گا"۔

میں نے کہا: "منٹو صاحب۔ میرا اور آپ کا نقطۂ نگاہ مختلف ہے۔ آپ شوق سے لکھئے میں کوئی اور نام رکھ لوں گا"۔

جب میری کتاب مکمل ہو گئی تو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اس پر دیباچہ لکھیں اور یہ ان کا دوستانہ اخلاص تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں ان سے ڈرتا تھا۔ خدا معلوم وہ کیا لکھ دیں۔

وہ اپنے نظریات میں بالخصوص طوائف کے مسئلہ میں سخت گیر تھے۔ ان کا بس چلتا تو عورت کے اس خونِ عزت کو جو آئے دن فروخت ہوتا تھا ان "سفید داڑھیوں" پر مل دیتے جو طوائف کے وجود پر نیزوں کی طرح تن جاتی ہیں لیکن چوری چھپے اس کی تخلیق کرتی ہیں۔

پار سال قدرت اللہ شہاب پنجاب میں محکمہ صنعت کے ڈائرکٹر تھے۔ انہوں نے ادیب کی حیثیت سے ــــ ایک اور الاٹمنٹوں کی تجدید کے موقع پر ایک برف خانہ میں ان کا حصہ بھی رکھا۔ منٹو کو دفتری اطلاع ملی تو سخت پریشان ہوئے ــ برف خانے گئے تو حصے داروں نے پٹے پر ہاتھ نہ دھرنے دیا۔ اور کہا:

"صاحب۔ اپنے حصے کی برف فروخت کرنے کا خود انتظام کر لو"۔

ذرا غور فرمایئے۔ سعادت حسن منٹو ریڑھی پر برف لادے پھر رہے ہیں اور ایک آدھ "ادبی چربہ" بھی ساتھ ہے۔

ایک دن مجھے فون کیا:

"کہاں ہو۔ جیتے ہو مر گئے ہو۔ توند کیوں بڑھ رہی ہے"۔ "بڑے یہ ہو، بڑے وہ ہو اور تان اس پر ٹوٹی کہ ــــ

"میرے حصے کی برف، بکوا دیا کرو"۔

لیکن اگلے دن معلوم ہوا کہ برف خانے ہی پر دو حرف بھیج چکے ہیں۔ شہاب کے ہاں گئے اور اپنا حصہ واپس کر آئے۔ مجھ سے کہنے لگے:

"سخت پتھر تھا اٹھ نہ سکا، چوم کے چھوڑ دیا۔"

موت سے کوئی تین دن پہلے کافی ہاؤس میں تشریف لائے۔ ہم معمول کے مطابق منڈلی لگائے بیٹھے تھے۔ میرا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے:

"اٹھو"۔

میں نے اعتراض کیا۔ ایک گالی، دو گالیاں، تین گالیاں۔

اور پھر ــــ "یار ایس توں تے میں مرہی جاندا تے اچھا سی"۔

اور کرم آباد میں مجھے ریڈیو نے بتایا کہ ــــ

"آج سعادت حسن منٹو انتقال کر گئے"۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ط



منٹو ایک نفاست پسند یا انداز

سیّد امجد الطاف

منٹو کا ایک افسانہ ہے —— "حسن کی تخلیق" —— اس کی ہیروئن شاہدہ بے حد نفاست پسند ہے۔ اسے صرف خوبصورت چیزیں پسند ہیں۔ وہ کسی بدصورت چیز کو برداشت نہیں کر سکتی چنانچہ

"ایک دن کلاس میں ایک لڑکے کی رینٹھ بہ رہی تھی۔ شاہدہ نے
جب اس کی طرف دیکھا تو فوراً اٹھ کر چلی گئی"۔

منٹو حسین بھی تھا اور نفاست پسند بھی۔ اسے حسن پسند ہی نہ تھا وہ اسے تخلیق بھی کرتا تھا۔ لیکن جہاں تک اس کی نفاست پسندی کا تعلق ہے بے داغ لباس پہننے والا یہ صاف ستھرا کشمیری بہتی ہوئی رینٹھ کو دیکھ کر بھاگتا نہیں تھا بلکہ اس کے قریب جا کر جھک کر اسے غور سے دیکھتا۔ اپنے مشاہدے کی امتحانی نلکیوں میں ڈال کر اس کا تجزیہ کرتا۔ اس گھناؤنی اور جی متلا دینے والی کریہہ شے میں بھی چھپی ہوئی خوبصورتی تلاش کر لیتا اور پھر اسے ایسی فنکارانہ نفاست سے پیش کرتا کہ بڑے بڑے "شاہدہ صفت" نفاست پسندوں کو بھی اس کا قائل ہونا پڑتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ منٹو کے جیتے جی ان حضرات نے قائل ہونے کے باوجود اس کے اعتراف میں ہمیشہ بخل سے کام لیا۔ مبادا کوئی ان کی نفاست پسندی، حسنِ نظر اور ذوقِ سلیم سے منکر ہو جائے اس لئے انہوں نے کہا تو یہی کہا کہ:

"یہ سراسر بے ہودگی ہے۔ تم جو کچھ لکھتے ہو خرافات ہے۔ تم ہنگامہ پسند ہو۔ لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرتے ہو۔ تہذیب و تمدن کو ننگا کرتے ہو۔ اخلاق کے قاتل ہو"۔

خواجہ سعادت حسن منٹو کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ اور افسانہ نگار منٹو کے فن کا سب سے تابناک پہلو یہی تھا کہ اس نے تہذیب و تمدن کو کبھی کپڑے پہنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس معاملے میں وہ واقعی بڑا ہی ڈھیٹ، بے شرم اور ہٹ دھرم تھا —— بالکل اپنے اس کردار کی مانند جو "سیاہ حاشیے" میں کرپانوں کے سائے میں پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

"میں سکھ بننا نہیں چاہتا —— میرا استرا واپس کر دو مجھے"۔

اس نے بداخلاقی کو سات پردوں میں چھپا کر پالنے والے تہذیب و اخلاق کے نمائندوں اور ادب و فن سے بے بہرہ سرکاری محتسبوں کی کرپانوں کے کچوکے مسکرا مسکرا کر برداشت کئے۔ لیکن اپنے "استرے" سے دستبردار ہونے پہ تیار نہ ہوا جس سے وہ اپنے معاشرے کی دکھتی رگوں کو چھیڑ کر فاسد مادے باہر نکالتا تھا۔ اسی فاسد مادے سے اس نے خوشیا، گوپی ناتھ، ممی، سہائے اور ممّو گندھی جیسے بیسیوں کردار پیدا کئے جن کی بظاہر قابلِ نفرت، گھناؤنی بدصورتی کے پیچھے وہ الوہی حسن موجود تھا جس کے باعث خود باری تعالیٰ نے اس ہستی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

"لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم"

شاید یہی وجہ ہے کہ "حسن کی تخلیق" کی نفاست پسند ہیروئن شاہدہ اپنے ہی جیسا حسین شوہر حاصل کرنے کے بعد جس بچے کو جنم دیتی ہے وہ ہسپتال کی نرس کے الفاظ میں:

'بڑا اگلی ہے ___ اس کے سر پہ ایسا معلوم ہوتا ہے سینگ ہیں، دانت بھی ہیں۔ ناک ٹیڑھی ہے۔ دو آنکھیں ہیں۔ پر ایک آنکھ لگتا ہے ماتھے پہ بھی ہے ___ تم لوگ اتنے خوبصورت ہو کر کیسے بچے پیدا کرتا ہے!'

اور منٹو کے نفاست پسند فن کے تخلیقی سانچوں میں ڈھل کر جو کہانیاں ہمارے سامنے آئی ہیں وہ اس بچے کی طرح عجیب الخلقت نہیں۔ ان میں حسن بڑے تناسب اور توازن کے ساتھ موجود ہے۔

سب جانتے ہیں کہ منٹو عمر بھر غیر مطمئن رہا۔ یوں تو موجودہ ماحول میں ہر ادیب بلکہ ہر ذی شعور انسان اطمینان اور سکون سے محروم ہے لیکن منٹو کو اپنی سفید پوشی، وضعداری اور نفاست پسندی نباہنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ خصوصاً اپنی مختصر زندگی کے آخری دور میں پیٹ کی پکار اور خالص تجارت پیشہ ناشروں کے اصرار پر اکثر اپنے فن کو بھی بھینٹ چڑھانا پڑا۔

۱۹۵۱ء میں اس نے لکھا تھا:

"میری موجودہ زندگی مصائب سے پُر ہے۔ دن رات مشقت کرنے کے بعد بمشکل اتنا کماتا ہوں جو میری ضروریات کے لئے کافی ہے۔ یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے آنکھیں میچ لیں تو میری بیوی اور تین کم سن بچیوں کی دیکھ بھال کون کریگا میں فحش نویس، دہشت پسند، سنکی، لطیفہ باز اور رجعت پسند سہی، لیکن ایک بیوی کا خاوند اور تین لڑکیوں کا باپ ہوں۔ ان میں سے اگر کوئی بیمار ہو جائے اور موزوں و مناسب علاج کے لئے مجھے در در کی بھیک مانگنی پڑے تو مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔ میرے دوست بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ مفلوک الحال ہیں۔ بروقت اگر میں ان کی مدد نہ کر سکوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ دنیوی معاملات میں اگر میں کسی کا یا اپنا سر جھکا ہوا دیکھوں تو خدا کی قسم مجھے دکھ ہوتا ہے ....."

اس سے بھی زیادہ دکھ اسے یہ تھا کہ لوگ اس کی بات پسند نہیں کرتے تو نہ سہی، کم از کم اسے سننے اور سمجھنے کی کوشش تو کریں۔ اسے یہ رنج نہیں تھا کہ لوگ اس پہ وار کیوں کرتے ہیں۔ رنج اس کا تھا کہ وہ اتنے اوچھے وار کیوں کرتے ہیں۔ ایسے بھدے

گھاؤ کیوں لگاتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک خالص فنکار ہے۔ اسے گندا کیوں کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ طہارت کا دلدادہ ہے۔ کیا صرف اس لئے کہ "وہ ایک ایسا پاانداز ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکارتا رہتا ہے" اور اپنے پاانداز ہونے کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں بھی اس بات کا احساس دلا دیتا ہے کہ وہ بھی پاانداز ہیں۔ فرق محض یہ ہے کہ وہ اس طرح خود کو جھاڑنے پھٹکارنے کی کوشش نہیں کرتے۔

"میں انسان ہوں۔ وہ انسان جس نے انسانیت کی عصمت دری کی تھی۔
جس نے فنا کو بادۂ ہر جام بنایا تھا۔ جس نے دوسری اجناس کی طرح
انسان کے گوشت پوست کو دکانوں میں سجا سجا کر بیچا تھا۔ میں وہی
انسان ہوں جس نے پیغمبری کا رتبہ حاصل کیا اور میں وہی انسان ہوں
جس نے پیغمبروں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ مجھ میں وہ تمام
کمزوریاں اور خوبیاں موجود ہیں جو دوسرے انسانوں میں ہیں....."

منٹو کو اس کا بھی افسوس تھا کہ لوگوں نے اس کی کمزوریاں ہی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے خوبیوں پر نظر نہیں ڈالی۔ یہی نہیں۔ اسے ایک سالم گنہ گار اور کمزور انسان کی بجائے واقعی نبیوں کا قاتل اور مذہب کا منکر سمجھا حالانکہ وہ اپنا ہر افسانہ خدا کے نام سے شروع کرتا تھا اور روحانیت کی عظمت کا بڑے سے بڑے ملا سے بھی زیادہ قائل تھا۔

"روحانیت یقیناً کوئی چیز ہے۔ آج کے سائنس کے زمانے میں جس میں
ایٹم بم تیار کیا جا سکتا ہے اور جراثیم پھیلائے جا سکتے ہیں۔ یہ چیز بعض
اصحاب کے نزدیک مہمل ہو سکتی ہے لیکن وہ لوگ جو نماز اور روزے
آرتی اور کیرتن سے روحانی طہارت حاصل کرتے ہیں ہم انہیں پاگل نہیں
کہہ سکتے۔ یقیناً روحانیت مسلّم چیز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بدکرداروں
قاتلوں اور سفاکوں کی نجات کا راستہ صرف روحانی تعلیم ہے۔ ملائی طریق
پر نہیں۔ ترقی پسند اصولوں پر۔ ان کو سمجھایا جائے کہ خدا نے انسان ہی
کو افضل ترین مقام بخشا ہے۔ اس کو نبیوں کا خاتم بنایا ہے۔ انسان
کا جو مرتبہ ہے اگر ان کے ذہن نشین ہو جائے گا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ
اپنی لغزشوں سے آگاہ ہو جائیں گے اور اس روحانی غسل سے شفایاب
ہوں گے"۔

لیکن جب منٹو ان بدکرداروں کو روحانیت کا بپتسمہ دینے کے لئے بدکرداروں کے اڈوں کا رخ کرتا تو عالمگیر انسانیت کی تبلیغ کرنے والے دین کے ملا اسے ملحد و بے دین، نجس اور بدمعاش قرار دیتے، سچائی کی تلاش کرنے والوں پر بداخلاقی کا الزام سقراط کے زمانہ سے لگتا چلا آیا ہے۔

غالباً ممتاز حسین نے ایک بار کہا تھا کہ:

"منٹو ایسے ایسے انسانوں کے پیٹ سے نیکی کی کرنیں نکال لیتا ہے جن کے بارے میں آپ اس کی کوئی توقع نہیں رکھتے۔"

خلافِ توقع باتیں کہنا۔ خلافِ توقع نتائج اخذ کرنا ـــــ اور اس طرح اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو چونکا دینا اس فن میں منٹو استادِ کامل کا درجہ رکھتا تھا۔ بقول عصمت چغتائی:

'منٹو کو عجیب و غریب تہلکہ ڈال دینے والی اور سوتوں کو چونکا دینے والی چیزوں سے بڑی رغبت ہے۔ وہ سوچتا ہے اگر بہت سے لوگ سفید کپڑے پہنے بیٹھے ہوں اور کوئی کیچڑ مل کر وہاں چلا جائے تو سب ہکا بکا رہ جائیں گے۔'

منٹو کو اس کی نفاست پسندی نے اپنے سفید کپڑوں پر کیچڑ تو کبھی ملنے کی اجازت نہیں دی البتہ وہ ہم ایسے سفید پوشوں کو ان کے کلف آلود مگر میلے کالروں اور گندے بنیانوں کا احساس دلا کر ضرور چونکاتا رہا۔ اس طریق کار سے منٹو نے اکثر اپنی دھاک بٹھانے اور سکہ جمانے کی کوشش کی اور اپنے آپ سے بیزار بھی کیا۔ لیکن آج اس کی یہ بیزار کن حرکتیں بڑی پیاری ادائیں معلوم ہو رہی ہیں۔ منٹو کو بھی اپنی ان اداؤں کا احساس تھا اور اسے یقین تھا کہ اگر وقت آیا تو خود اللہ میاں کو بھی ان اداؤں سے موہ لے گا۔ چنانچہ وہ ہمارے ہی درمیان سے وہ کردار چن کر ان کی زبان سے یوں گویا ہوتا ہے:

اے خدا! اے رب العالمین۔ اے رحیم! اے کریم! ہم دو گنہ گار بندے تیرے حضور گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں کہ تو سعادت حسن منٹو کو جس کے والد کا نام غلام حسن منٹو ہے اور جو بہت شریف، پرہیزگار اور خدا ترس آدمی تھا ـــــ اس دنیا سے اٹھا لے جہاں وہ خوشبوئیں چھوڑ دیتا ہے اور بدبوؤں کی طرف بھاگتا ہے۔ نور میں وہ آنکھیں نہیں کھولتا لیکن اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ ستر سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ انسانوں کا ننگ دیکھتا ہے۔ مٹھاسوں سے اسے کوئی رغبت نہیں کڑواہٹوں پر البتہ جان دیتا ہے۔ گھریلو عورتوں کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا لیکن بیسواؤں سے گھل مل کر باتیں کرتا ہے۔ صاف پانی چھوڑ کر بدروؤں میں نہاتا ہے۔ جہاں رونا ہے وہاں ہنستا ہے۔ جہاں ہنسنا ہے وہاں روتا ہے۔ کوتوں کی دنیا میں جو اپنا منہ کالا کرتے ہیں ان کی کالک صاف کر کے ہمیں دکھاتا ہے۔

اے رب العالمین! اس شر انگیز، نجس پسند اور شریر انسان کو اس دنیا

سے اٹھالے جس میں وہ بدکرداروں اور بداطواروں کے نامۂ اعمال کی
سیاہیاں مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اے خدا! وہ بہت شر پسند
ہے۔ عدالتوں کے فیصلے اس کا ثبوت ہیں۔ لیکن یہ ارضی عدالتیں ہیں
تو اسے اس دنیا سے اٹھا اور اپنی آسمانی عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ
چلا۔ اور اس کو قرار واقعی سزا دے۔ لیکن دیکھ! اسے ادائیں بہت آتی
ہیں۔ ایسا نہ ہو تجھے اس کی کوئی ادا پسند آجائے۔ لیکن تو سب کچھ
جاننے والا ہے۔ ہماری صرف یہ دعا ہے کہ وہ اس دنیا میں نہ رہے۔
رہے تو ہم جیسا بن کے رہے جو ایک دوسرے کے عیبوں پر پردے
ڈالتے ہیں۔"

منٹو ہمارے عیبوں پر پردہ نہ ڈال سکا اور ہم جیسا نہ بن سکا۔ اس لئے رب العالمین نے ہماری دعا قبول کرتے ہوئے منٹو کے عیبوں پر پردہ ڈال دیا۔

منٹو کو اس زندگی کے دکھوں کے علاوہ ان دکھوں کا غم بھی کھاتا رہتا تھا جو موت کے بعد اس کے پلّے پڑیں گے۔

"اگر گھوڑے کا قدم ایک فٹ آگے بڑھ جاتا تو معلوم نہیں کیا ہوتا
میں سوچ رہا تھا کہ پاکستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار بچ گیا۔
اس وقت مجھے قوم کے نقصان کا خیال تھا۔ یہ احساس مطلق نہیں تھا کہ
میری بیوی ہے تین بچیاں ہیں۔ مجھے اس وقت صرف یہ خیال تھا کہ میں
قوم کا سرمایہ ہوں جو تباہ و برباد ہونے سے بچ گیا ہے۔ حالانکہ یہ
حقیقت ہے کہ میری موت ایک غیر ضروری انسان کی موت ہوتی۔ چند
عزیزوں اور دوستوں کی آنکھیں ضرور نمناک ہوتیں مگر اس ملک کی آنکھ
کبھی آنسو سے بھر نہ آتی جس کا سرمایہ میں خود کو سمجھتا ہوں.....'

یا یہ کہ:

'جب میں سوچتا ہوں اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو
اور لائبریریوں کے دروازے کھول دیئے گئے اور میرے افسانوں کو وہی
رتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے تو میری روح سخت
بے چین ہو گی۔ میں اس بے چینی کے پیش نظر اس سلوک سے بے حد
مطمئن ہوں جو اب تک مجھ سے روا رکھا گیا ہے۔"

اور میں سوچتا ہوں کہ منٹو جس کی روح یہاں اس قدر بے چین اور سیماب وار رہی، مرنے کے بعد کیسے چین پا سکتی ہے۔

اس لئے اگر ہم اس کی تحریروں پر ریڈیو اور لائبریریوں ہی کے نہیں بلکہ نصابِ تعلیم کے دروازے بھی کھول کر اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیں تو آخر اس میں حرج ہی کیا ہے!



تاثرات

یوسف ظفر

کیسے کہوں کہ منٹو آج ہم میں نہیں۔ زندگی سے زیادہ زندہ افسانہ نگار۔ اس لئے کہ زندگی اس کی بے باکی، دور بینی اور صاف گوئی کی متحمل نہ ہو سکی۔ انسان سے زیادہ بڑا انسان کہ موت نے اسے ہم سے چھین کر اس کے قلم پر پہرہ لگا کر، اس کی آنکھوں کو بے نور کر کے، اس کے جسم کی مشینی حس و حرکت ختم کر کے اس کے ذہن کو ماؤف کر کے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ سعادت حسن منٹو ــــ عظیم افسانہ نگار، محبوب دوست، بے باک ادیب، لازوال فنکار، موت اسے نہیں چھو سکے گی۔ وہ ہمارے دلوں میں زندہ رہے گا۔ وہ تاریخِ ادب کے صفحات پر بقائے دوام کی مہر ثبت کر چکا ہے۔

لیکن میں جذباتی ہو گیا ہوں۔

منٹو کی رحلت نے میرے دل و دماغ پر وہ چوٹ لگائی ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے اپنے جذبات کی زبان سے کہوں میں نے منٹو کو کیسا پایا۔ چلتا پھرتا منٹو۔ ہنستا بولتا، مجلس کی جان منٹو۔ اردو کی محفلوں میں پنجابی بولنے کا رسیا۔ دوستوں کی مجلسوں کو اپنے مخصوص انداز سے گرماتا ہوا۔ جانِ محفل ــــ

مجھے یاد ہے منٹو کی نشیلی آنکھوں میں چلبلی ہنسی کی چمک ــــ اس کی باتوں میں محبت کی چاشنی ــــ دل سے نکلتی ہوئی باتیں ــــ اس کے پاس بیٹھ کر ہر شخص ایک ایسی گرمئی خلوص کی حدتِ تپاک کی لذت محسوس کرتا اور اس کی محفل ــــ وہ علما کا گرویدہ تھا، خلوص کا بھوکا تھا۔ اس کی دوستی کے لئے علم کی شرط نہ تھی۔ بصیرت و بصارت کی پابندی نہ تھی۔ وہ انسان کا تمنائی تھا ــــ محبت کا بھکاری تھا۔

میری اس سے سب سے پہلی ملاقات ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ جب وہ بمبئی سے ایک مقدمے کے سلسلے میں آیا۔ وہ میرے سامنے ہر شام دن بھر کے مباحثوں پر تبصرہ کرتا۔ مقدمے میں گواہی دینے والوں کی بوالعجبیوں پر قہقہے لگاتا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر ایک رگ پھول جاتی اور وہ زہر خند کے لہجے میں کہتا:

"سب فراڈ ہیں"

فراڈ اس کا خاص لفظ تھا۔ اس لفظ میں اسے پیار بھی محسوس ہوتا اور نفرت بھی۔ اس کے بعد منٹو سے ملاقات کے لئے جی ترستا رہا۔ اور وہ بمبئی کی فلمی دنیا میں شہرت و عزت کے بام پر چڑھتا چلا گیا۔ تا آنکہ پاکستان بن گیا اور ۱۹۴۸ء کی ایک شام میں نے اسے سینما کے بالمقابل کھڑا پایا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس کی طبیعت کی جولانی اپنی پوری کیفیتوں کے ساتھ جلوہ نما ہوئی۔

اس نے مجھے شاعر جان کر شعریت سے تواضع کرنا ضروری سمجھا ـــــ وہ مجھے پنجابی کی بولیاں سناتا رہا۔ ان کی تشریح کرتا رہا۔ ان کی خصوصیت پر تبصرہ کرتا رہا اور اس کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ منٹو مجموعۂ اضداد، منٹو داخلی طور پر نہایت ہی معقول، نہایت ہی معقول، نہایت ہی معصوم، نہایت ہی شریف انسان ہے۔ اس کی نظر ہر انسان کے دل کو ٹٹولتی ہے۔ وہ ماحول کا نقاد ہے۔ انسانیت کا نقاد ہے۔ وہ افسانہ نگار ہی نہیں بذاتِ خود ایک افسانہ ہے۔ گھر میں وہ ایک مخلص خاوند، اپنی بچیوں سے محبت کرنے والا باپ، اپنے دوستوں کا دلدادہ، اپنے دشمنوں سے پورے جوش سے ٹکر لینے والا، اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہونے والا، اپنی مذمت سے آگ بگولا ہو جانے والا، ایک مکمل انسان ہے۔ ایسے انسان سے قریب تر ہونے کے لئے کون بے تاب نہ ہوگا۔ مکمل انسان جو اپنی کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالتا۔ جو دل کھول کر بات کرتا۔ صاف دلی سے ملتا اور محبت سے کام لیتا۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ وہ اپنی مذمت پر آگ بگولا ہو جاتا تھا لیکن گزشتہ سال میں ایک ایسا دن بھی آیا جب میں نے ایک مجلس میں اسے اپنے افسانوں پر ایک مستند نقاد کا مضمون سنتے ہوئے دیکھا۔ اس کے نقاد نے اسے قیامِ پاکستان کے بعد اسے ایک درجن بہترین افسانوں کا خالق مان کر بھی مُردہ فنکار قرار دیا تھا۔ منٹو سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ سب دیکھ رہے تھے کہ اب اس کا لاوا پھوٹے گا تو کیا ہوگا۔ خود صاحبِ مضمون پڑھتے ہوئے بوکھلا رہے تھے۔ لیکن جب اس مضمون پر بحث کا وقت آیا تو منٹو نے اپنی زبان سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ وہ ہر شخص کو دیکھتا جو اس بحث میں حصہ لے رہا تھا۔ بے چارگی سے، ضبط سے، خلوص سے۔ اور جب یہ محفل برخاست ہوئی تو وہ قریب کے ایک چائے خانہ میں قیامت سامان بیٹھا تھا۔

ضبط کی یہ واحد مثال تھی جو میں نے منٹو سے اپنی ملاقات کے دوران دیکھی ورنہ اس کی زبان کو کون روک سکا ـــــ زندگی نے اس کی زبان پر تالے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی بے باکی اور پُر زور آواز سے زندگی کو انگشت بدنداں کر دیا۔ چنانچہ وہ ضبط اور بے باکی کی دونوں سرحدوں پر موجود ہوتا اور یار لوگ اسی سے اسے مجموعۂ اضداد کہتے۔ میں اسے اس اعتبار سے دیکھنے سے قاصر ہوں۔

میں آج کے دن منٹو کے بارے میں کیا کہوں۔ سمجھ میں کچھ آئے تو کہوں۔ اور سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ میرا دوست منٹو نہیں رہا۔ اردو ادب کا عظیم فن کار نہیں رہا۔ اس کا فن اس کی زندگی کی ضمانت ہے۔ وہ زندہ رہے گا ـــــ لیکن مخلص منٹو، بے باک منٹو، حساس منٹو، دیدۂ بینا منٹو۔ اس کو کہاں سے لاؤں۔ اس کی باتیں کیسے سناؤں۔ زخم مندمل ہولے تو کہوں ـــــ درد کم ہو تو کچھ عرض کروں۔

لوگ اسے کچھ ہی کہیں میرے ذہن میں اس کی متحرک تصویریں ہیں۔ اس کی آوازیں، اس کی حرکتیں، اس کی باتیں، اس کی یادیں ـــــ اب بھی میرے دل میں لوحِ محفوظ کی طرح نقش ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ منٹو مر گیا اور اسے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ـــــ کیا یہ ممکن ہے ـــــ لیکن نہیں! وہ اب بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں



منٹو ایک انسان

احمد شجاع پاشا

بمبئی کی موسمی بارش سے پناہ لینے کے لئے میں جس چائے خانہ میں گھسا تھا وہ تکلیف دہ حد تک مرطوب اور سیلا ہوا تھا۔ ملاڈ کا ریلوے سٹیشن یہاں سے زیادہ دور نہ تھا لیکن مون سون کا حملہ اتنا شدید اور پریشان کن تھا کہ میں باہر نکلنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ چائے خانہ کا مالک حد سے زیادہ باتونی تھا ____ اور اس کی گفتگو اس ٹرین کی کھڑکھڑاہٹ سے مشابہ تھی جو ابھی ابھی میرے سامنے سے گزری تھی اور جس نے مجھے مزید آدھ گھنٹے انتظار پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً ایک منحنی سا شخص چشمہ لگائے ہوئے چائے خانہ میں داخل ہوا۔ اس کی وضع قطع سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی دقیانوسی ناول کا کوئی کردار ہے جس نے الفاظ کا جامہ چھوڑ کر انسانی روپ دھار لیا ہے۔

وہ ایک تاریک سے گوشے میں سب سے الگ جا بیٹھا۔ اس نے بھوری اچکن پہنی ہوئی تھی اور اس کی شخصیت میں جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے پانچ امتیازی بٹن تھے جو اچکن کے سات کاجوں میں ٹکے ہوئے تھے۔ دو بٹن غائب تھے اور یہ اس وقفے کی غمازی کر رہے تھے جو ان کی خریداری اور اچکن کی تیاری کے بعد سے چائے خانے میں داخلے کے وقت کے درمیان حائل تھا۔

میں اس کے پاس چلا گیا۔ محض اس خیال سے کہ یہ آدھ گھنٹہ کا عرصہ اچھی طرح گزار سکوں۔

"کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں"۔

"بڑی خوشی سے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے بے ہنگم کرسی پر ایک نظر ڈالی اور بیٹھ گیا۔

"آپ علی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں"۔

"ایک لحاظ سے"۔

پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ علی گڑھ میں صرف چند مہینے رہا ہے کیونکہ دق کی بیماری کے شبہ نے اسے کالج چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"آپ کا نام"۔

"منٹو۔ سعادت حسن منٹو"۔

یہ میری اس عظیم افسانہ نگار سے پہلی ملاقات تھی۔ اور یہی ملاقات بعد میں ہماری طویل دوستی کی تمہید بن گئی۔ منٹو کے دوستوں اور نقادوں کا خیال ہے کہ اس کی زندگی ایک مستقل عذاب تھی اور موت نے اسے اس عذاب سے نجات دلا دی۔ لیکن میں نے شدت

سے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ وہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا تھا اور اس نے شجرِ ممنوعہ کے ہر ریشے سے زندگی کا رس نچوڑا ہے۔

میں نے منٹو کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھ کر میں نے اس کی دلچسپ اور سنسنی خیز گفت گو سنی ہے اور اس کی ہر حرکت کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ اس نے کبھی مجھ پر یہ اثر نہیں چھوڑا کہ وہ فنوطی ہے۔ حالانکہ اس کے بہت سے قارئین یہی سمجھتے ہیں۔ اس کی تحریریں دنیا جہان کی گندگیوں سے آلودہ ہوتی تھیں لیکن وہ خود ایک صاف ستھرا آدمی تھا۔ اس کی عادتیں بڑی پاک صاف تھیں اور زندگی کے متعلق اس کا نظریہ انتہائی صاف ستھرا اور صحت مند تھا۔

ایک دفعہ ہم اردو ادب کے جدید رجحانات پر بحث کر رہے تھے کہ اچانک اس نے اپنے مخصوص انداز میں آوازِ بلند ان نقادوں کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کر دیئے جو اسے ترقی پسند سمجھتے تھے۔ کہنے لگا:

"میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ لوگ بالکل نہیں جانتے کہ ترقی کس چڑیا کا نام ہے۔ وہ مجھے صرف اس لئے پسند کرتے ہیں کہ میں ان چیزوں کا بے باکی سے ذکر کر دیتا ہوں جن سے وہ خود خائف ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اپنی تحریروں سے کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتا لیکن میں نے اپنے لئے عظمت کے مندر میں ایک مورتی ضرور تخلیق کر لی ہے۔ میں نے لکھنے والوں کو نئے نئے موضوعات دیئے ہیں۔ میرے ساتھ مشکل صرف ایک ہے کہ میں حد سے زیادہ منہ پھٹ واقع ہوا ہوں۔"

منٹو کی تحریروں میں جو گندگی اور عریانی موجود ہوتی ہے اس کے بارے میں اس کا ذہن خود بھی صاف نہیں تھا۔ کبھی وہ کہتا کہ میں زندگی کو جس رنگ میں دیکھتا ہوں پیش کر دیتا ہوں اور کبھی وہ اس نظریہ پر اڑ جاتا کہ اس کے افسانے روزمرہ کے واقعات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جنہیں تہذیب کے بوجھل پردوں میں چھپی ہوئی ہستیاں نام نہاد سوسائٹی میں پیش کرتے ہوئے ہچکچاتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ارسکن کالڈویل کی کتاب "GODS LITTLE ACRE" پڑھنے کے بعد بہت دنوں تک اسے اپنے منہ کا ذائقہ بگڑا ہوا محسوس ہوتا تھا اور اس نے اعتراف کیا کہ یہ کتاب واقعی فحش ہے۔

منٹو سمرسٹ ماہم کی تحریروں سے بہت بری طرح متاثر تھا وہ کہتا تھا:

"مجھے ماہم سے عشق ہے۔ انسانی فطرت اس کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب ہے اور اس کا ایک جملہ انسانی نفسیات کا دفتر ہوتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں بھی اس جیسا لکھ سکوں۔"

منٹو غالباً ۱۹۱۲ء میں ضلع لدھیانہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا جو آجکل مشرقی پنجاب میں شامل ہے۔ وہ امرتسر کے ایک انتہائی معزز کشمیری خاندان کا رکن تھا۔ یہ لوگ اپنی ذہانت کے لئے دور دور مشہور ہیں۔ مقامی سکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ چلا گیا لیکن جلد ہی وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ اس کے بعد امرتسر کے ایک رسالے کے حلقۂ ادارت میں شامل ہو گیا۔ یہ دن عام معاشی بدحالی کے تھے اور منٹو کی تعلیم اس سلسلے میں بالکل مدد نہ کر سکتی تھی اور اگر وہ علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا اور وہ نئے باب جو منٹو کے ناخنِ تدبیر نے وا کئے یونہی بند رہتے کیونکہ منٹو نے خود مجھ سے کہا کہ اعلیٰ تعلیم کے بعد اس کے ذہن میں زندگی گزارنے کے

کئی منصوبے موجود تھے۔

بمبئی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے منٹو کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ وہ بمبئی میں ایک عام ہفتہ وار پرچے کے مدیر کی حیثیت سے داخل ہوا اور جب وہاں سے باہر نکلا تو ایک مشہور آدمی تھا۔ یہیں چھوٹے اور تاریک چائے خانوں میں اس نے وہ معرکہ آرا کہانیاں لکھیں جنہوں نے اسے لازوال شہرت عطا کی۔ قیامِ بمبئی کے ابتدائی دنوں میں منٹو کی زندگی زیادہ پاکیزہ نہیں تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے کردار میں کوئی خاص خامی تھی بلکہ یہ سراسر مالی بدحالی تھی۔

منٹو کی مالی پریشانیوں میں ہمیشہ کی طرح یہاں بھی شغلِ مے نوشی کا ہاتھ تھا کیونکہ اس کے لئے وہ رقم مہیا کرنا بہت مشکل تھا جو بلا نوشی کے لئے کافی ہو سکے لیکن اس نحیف الجثہ انسان نے اپنے ماتھے پر کبھی شکن نہ آنے دی۔ اور ہمیشہ ایک حقارت انگیز مسکراہٹ اپنے خوبصورت لبوں پر لئے زندگی کے خلاف جدوجہد کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے اس پہ فتح پالی۔

منٹو نے کہانی نویس کی حیثیت سے فلمستان لمیٹڈ میں شمولیت اختیار کی تو اس پر ہر طرف سے نکتہ چینی کی گئی لیکن یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ کئی فلمی کہانیاں لکھ چکا تھا اور بمبئی کے فلمی حلقے اس کی ضرورت اور اہمیت محسوس کرنے لگے تھے۔ فلمی صنعت میں منٹو کے داخلے نے بہت سے اچھے لکھنے والوں کے لئے میدان صاف کر دیا۔

لیکن فلمی کہانی نویس کی حیثیت سے منٹو کا کردار کچھ زیادہ روشن نہیں ہے۔ وہ بنیادی طور پر ترقی پسند تھا اور پروڈیوسر پرانی لکیروں کو پیٹنے کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ وہ کسی بھی نئے ذہن کو اپنی اپج اور صلاحیتیں دکھانے کا موقع دینے کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے منٹو نے بھی اس طرف پوری توجہ نہیں دی اور صرف ٹالنے والا کام ہی کرتا رہا۔

میرا دفتر فلمستان سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا اس لئے جب کبھی فرصت ملتی وہ مجھے اپنے مخصوص انداز میں فون کرتا اور ہماری بات چیت شروع ہو جاتی۔

"میں منٹو بول رہا ہوں۔"

"یہ ۴۰۲۷ ہے۔" میں جواب دیتا۔

"اچھا سنو۔ آج تم گھر نہیں جاؤ گے۔ ہاں ہاں میں کوئی معذرت نہیں سننا چاہتا ــــ میں فلانی ونڈیا کے متعلق باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اور تم جانتے ہی ہو کہ محبت انتظار کر سکتی ہے لیکن ــــ منٹو نہیں کر سکتا۔"

"بہت اچھا۔" میں ہار کر جواب دیتا۔ "تو پھر آج شام کا کیا پروگرام رہے گا۔"

"میں نے لندن بار میں ایک میز بک کرالی ہے ــــ رم کی ایک بوتل میرے لئے اور تمہارے لئے لیمن۔" دوسری طرف سے آواز آتی۔

"میں ــــ کو بھی ساتھ لاؤں گا۔ میرا خیال ہے تم بھی اسے پسند کرتے ہو ــــ کیوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں ــــ مگر فلموں میں مجھے اس کا کام ... پسند نہیں۔"

"فلموں کو گولی مار یار۔ وہ ساتھ ہو گی تو لطف رہے گا۔"

منٹو باتیں کرتا تو وہ کسی چہرے یا مقام کو نہیں چھوڑتا تھا جسے اس نے دیکھا ہو۔ پھر وہ اپنی تازہ ترین کہانیوں کے متعلق

اشارے دیتا ——— اور جب بمبئی کی گلیوں اور بازاروں میں شام کا دھندلکا پھیل جاتا تو میں اسے سہارا دے کر بائی کلا کے فلیٹ تک جو اس کی رہائش گاہ تھی پہنچا دیتا۔

وہ مجھ سے کہا کرتا:

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں بڑی خوبصورت پیش کش کی گئی ہے لیکن خدا کے لئے تم فلمی دنیا میں داخل ہونے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ تمہیں اداکار بنائیں گے اور تم جیسے انسان کے ساتھ یہ سب سے بڑا سانحہ ہوگا۔"

میں جواب دیتا: "وہ مجھے اپنی نئی فلم میں ولن کا کام دینا چاہتے ہیں حالانکہ فلموں میں اس قسم کے کام سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

"بہت اچھے میرے لڑکے"، منٹو خوش ہو کر کہتا۔

منٹو حالانکہ خود فلموں سے متعلق تھا لیکن اس صنعت کے ماحول کے پیش نظر وہ نہیں چاہتا تھا کہ ادیب اس طرف متوجہ ہوں کیونکہ اس کے خیال میں سٹوڈیوز کی گھٹی گھٹی فضا اور گندہ ماحول اچھے ادیبوں کے لئے سم قاتل ہے۔

تقسیم کے بعد بمبئی کی فضا ہم میں سے بہت سوں کے لئے ناقابل برداشت سی ہو گئی تھی اور ہم نے پاکستان جانے کا عزم کر لیا منٹو سے اس مسئلے پر میری بات چیت تو نہیں ہوئی لیکن میں نے اس کی ذہنی تبدیلیوں کا بغور مطالعہ کر رکھا تھا۔

ستمبر، ۴۷ء میں جب میں دہلی کے ایک پُر خطر دورے کے بعد بمبئی واپس پہنچا تو میں نے منٹو کو بالکل ہی بدلا ہوا پایا۔ ایک دفعہ دورانِ گفتگو اس نے کہا:

"موت میرے لئے اب تمام رعنائیاں کھو چکی ہے۔ اب میں موت سے نہیں ڈرتا۔"

اس کے چند دن بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ لاہور جا رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ لاہور نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اور پھر وہ گرداب میں پھنس گیا۔ اس نے جتنا اپنے آپکو باہر نکالنے کی کوشش کی اتنا ہی وہ نیچے بیٹھتا گیا ——— یہاں تک کہ وہ ڈوب گیا۔

ہم نے اس کی زندگی میں کچھ نہیں کیا ——— ہم ہمیشہ سے مُردوں کی پرستش کرتے آئے ہیں۔ اور اب ہم اسی پرانے دستور کے مطابق اس کی یاد تازہ رکھنے میں سرگرم ہیں۔

منٹو عمر بھر اس بات کو شدت سے محسوس کرتا رہا کہ دنیا اس کی وہ قدر نہیں کرتی جو اس پائے کے ادیب کا حق ہوتی ہے لیکن وہ اس احساس کو ہمیشہ سینے میں دبائے رہا۔ یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا۔ وہ بیمار ہوا اور ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہ وہاں سے واپس تو آ گیا لیکن پوری طرح صحت مند نہیں تھا۔

اور سب جانتے تھے کہ یہ خاتمے کی تمہید ہے۔ میں نے کئی بار اس سے اس کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار بھی کیا لیکن ہر بار وہ مسکرا کر صرف اتنا کہتا:

"جب منٹو مر جائے تو اس پر مضمون لکھنا ——— لیکن دیکھنا اس کی تحریروں کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ تم اس منٹو پر لکھنا جسے تم بحیثیت انسان کے جانتے تھے۔"

منٹو کو ایمبولینس کار میں ہسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ وہ مر گیا۔
لیکن وہ اپنے دوستوں اور مداحوں کے دلوں اور دماغوں میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔
وہ کبھی نہیں مر سکتا۔



منٹو زندہ ہے

حمید اختر

منٹو مر گیا!

مگر اس کی موت سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ جن لوگوں نے اس کی زندگی میں اس کے نام کی تجارت کر کے پیسہ کمایا۔ مرنے کے بعد بھی انہوں نے وہ تجارت شروع رکھی بلکہ اپنی تاجرانہ سرگرمیوں کو کچھ اور بڑھایا۔ بعض لوگوں نے اس کی انٹ سنٹ تحریریں جمع کر کے فوراً اس کے نام سے مضامین یا افسانوں کا مجموعہ چھپوایا۔ ایک ادبی تجارتی ادارے نے اپنے رسالے کے آخر میں سیاہ حاشیے کے ساتھ ایک صفحہ پر منٹو کی موت کا اعلان کیا اور اگلے چار پانچ صفحوں پر اس کی کتابوں کے اشتہار چھاپے۔ ان کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے گویا منٹو غریب اسی لئے مرا تھا کہ یہ لوگ اس کے جنازے کی تجارت کر سکیں۔

بدقسمتی سے ایسے رسالوں اور اس قسم کے مضامین کو پڑھ کر منٹو کی موت سے جو نقصان ہوا۔ اس کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ نہ ہی سیاہ حاشیے کے ساتھ منٹو کی موت کا اعلان کرنے سے کوئی ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔ ہمدردی ظاہر ہونا تو دور کی بات ہے ظاہر کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ ہم مشرقی لوگ تو دشمن کی موت پر بھی اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان تاجروں نے اس غریب کے بیسویں یا چالیسویں کا بھی انتظار نہیں کیا اور جنازہ کی تجارت شروع کر دی۔ اور یہ تجارت ایک لفظ اظہارِ افسوس کے کہے بغیر ہی شروع کر دی گئی۔

کچھ دوستوں نے منٹو کی موت پر مضامین بھی لکھے لیکن منٹو کی موت پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ منٹو مر گیا.... یہ تو سب کو معلوم ہے۔ مگر وہ کیونکر؟ —— کیا یہ اس کے مرنے کی عمر تھی —— ابھی تو وہ جوان تھا۔ اسے ابھی اپنی ننھی نازک سی بچیوں کو جوان ہوتے ہوئے بڑھتے پھلتے پھولتے دیکھنا تھا۔ زندگی جو کہانیوں سے اٹی پڑی ہے ابھی اس کو اس سے کچھ دیر اور نباہ کرنا تھا۔ —— لیکن وہ مر گیا —— کیوں —— آخر اسے کس چیز نے مار ڈالا۔ اس غیر فطری قبل از وقت موت میں کون سی اندھی طاقت کام کر رہی تھی۔

لوگ کہتے ہیں منٹو کو شراب نے مار ڈالا۔

میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس منٹو کو جانتا تو ضرور ہوں جو شراب پیتا تھا لیکن مجھے اس منہ پھٹ، بے لگام اور انا پرست بے لحاظ منٹو کے پیچھے جو شراب پیتا اصلی منٹو بھی نظر آتا ہے جو انتہائی کمزور، انتہائی نرم و نازک جذبات سے معمور نظر آتا ہے اس منٹو کو

بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن جو اسے جانتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ منٹو کی اصل صورت ہی یہ ہے۔ اس کی بیباکی بے لگامی اور اکھڑ پن اسی چیز کی بازگشت ہے جن لوگوں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تھوڑی سی کوشش کے بعد اس کے اندر جھانک کر دیکھا جائے تو وہ چھلا چھلایا نرم و نازک، نرم دل اور بالکل بے بس و بے کس آدمی نظر آتا ہے۔

اس کی یہ کمزوری یہ نرمی یہ اچھائی اور نیک سیرتی ہی ہے جس کی وجہ سے وہ شراب پیتا تھا۔ میں نے اس کی زندگی میں اس کی شراب نوشی کی اکثر مخالفت کی۔ اسے بیکار سمجھانے کی کوشش کی لیکن مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ وہ شراب نہیں ترک کر سکتا تھا۔ وہ جو کچھ تھا اسے شراب پینا ہی چاہئے تھی حیرت تو ان لوگوں پر ہے جو یہاں شراب نہیں پیتے۔ ان کا حوصلہ قابلِ داد ہے۔

اس زندگی میں جہاں محرومیاں ہی محرومیاں ہیں۔ آسائش کی محرومی، محبت کی محرومی، محبوبہ کی محرومی، اچھے مکان کی محرومی روٹی اور ضروریاتِ زندگی سے محرومی، کہاں کہاں یہ محرومی راستہ روک کر کھڑی رہتی ہے۔ سنگدل، بے مہر اور ظالمانہ محرومی سے ٹکر مار کر انسان شراب نہیں پئے گا تو کیا کرے گا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ منٹو اور منٹو کی طرح کے دوسرے لاکھوں لوگ اچھی شراب سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس سے کسک اور بڑھتی ہے اور نتیجہ جو ہوتا ہے۔ وہ ظاہر ہی ہے۔

منٹو جیسے لوگ سمندر کی تند موجوں کی طرح دنیا کی ہر مخالف قوت سے ٹکراتے ہیں۔ چوٹ جتنے زور سے لگتی ہے ان کا باغیانہ رویہ اتنی ہی شدت سے ابھرتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخالف قوتوں کا کچھ بگڑے یا نہ بگڑے یہ لوگ آخرکار ختم ہو جاتے ہیں۔

مرنے سے پہلے اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ وہ چند دن کا مہمان نظر آتا تھا۔ پھر بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ مر گیا۔ جب اس کی موت کی بابت میں لکھنے لگتا ہوں تو قلم کانپ کانپ جاتا ہے ___ یارو! وہ منٹو۔ زندہ دل خوش باش، نیک سیرت باغی، اور وہ صاف شفاف، موٹی خوبصورت، نگراں، بے بس آنکھوں والا منٹو جو ابھی کل زندگی کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں سے کھیلتا تھا۔ آج مر گیا! ___ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے وہ یہاں اسی دفتر میں میرے سامنے بیٹھا کسی پبلشر سے بات کرتے کرتے یکایک یوں بول اٹھا تھا:

"مجھے اپنی بچیوں کی بہت فکر ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا ہے۔ میری بیوی ہے یہ بچیاں ہیں۔ آخر ان کے مستقبل کا کیا ہو گا!"

ممکن ہے اس نے یہ بات کچھ اور دوستوں سے پہلے بھی کہی ہو لیکن میں نے یہ بات اس کے منہ سے پہلی بار سنی تھی۔ مجھے پہلے تو بڑی حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے وہ ادب کی (وہ بھی ادیبوں کی کمزوریوں کی مخالفت میں) باتیں کرتا تھا۔ بعض ادیبوں کی ٹانگ کھینچتا تھا یا پھر شراب کی اور عدالت کی باتیں کرتا تھا لیکن یہ آج اس کو یکایک کیا ہو گیا۔ مجھے اس وقت ایک جھلک ایک بار پھر اس منٹو کی نظر آئی جو بڑا ہی کمزور اور بظاہر سامنے دکھائی دینے والے منٹو سے بالکل مختلف تھا۔

وہ اس قدر کمزور تھا کہ بعض اوقات بڑی معمولی شخصیت کے لوگوں سے متاثر ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات اچھے نفیس شستہ

پڑھے لکھے مہذب لوگوں کا اثر اس پر فوری طور پہ ہوتا لیکن وہ تسلیم کسی کو بھی نہیں کرتا تھا۔ اپنی اس کمزوری کو محسوس کرتے ہی وہ جھنجھلا جاتا اور کسی نہ کسی کی ٹانگ کھینچنے پر اتر آتا مگر اس سے یہ حقیقت صاف رہتی ہے کہ وہ اکھڑ، بے لگام اور مغرور نہیں تھا بلکہ یہ چیزیں ایک خول تھیں جو اس نے مصنوعی طور پر پہن رکھا تھا۔

گزشتہ ایک دو برس سے اس کی بیوی صفیہ نے اس کی شراب نوشی کے خلاف مہم شروع کر رکھی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ سمجھانے بجھانے سے کوئی اثر نہ ہوگا تو اس نے راشن بندی کی مہم چلائی۔ مگر منٹو ان لوگوں میں سے تھا جن پر جتنی پابندیاں لگائی جائیں۔ وہ پابندیاں توڑنے میں ان سے دس گنا زیادہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے اس پر راشن بندی کا اثر بھی نہ ہوا۔ وہ مقدار سے زیادہ پیتا تھا۔ پھر طلب ہوتی پھر پیتا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے بیوی کی طرف سے لگائی جانے والی پابندی کا احساس بھی رہتا اور ضمیر کا یہ کانٹا اسے تنگ کرتا۔ اس کی چبھن کو دبانے کے لئے وہ اور پیتا۔ یہی دکھ، یہی محرومیاں، یہی پابندیاں تو اسے یہاں تک لے آئی تھیں۔ لیکن ضمیر کی خلش تھی کہ پھر تنگ کئے جاتی تھی۔ یہ خلش میں نے اس کے چہرے پر بڑے صاف اور بڑے واضح طریقے سے ابھرتی ہوئی دیکھی۔ آئینہ کی طرح اس کا چہرہ اس کی تصویر سامنے رکھ دیتا۔

آخر میں صفیہ نے اس کے ساتھ گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ ایک روز میں ٹی ہاؤس میں بیٹھا تھا۔ وہ بیوی بچوں سمیت پاس آکر بیٹھ گیا اور چھوٹتے ہی بولا:

"یہ کہتی تھی ٹی ہاؤس میں کیا کرنے جاتے ہو۔ میں نے کہا جو عیاشی میں وہاں جاکر کرتا ہوں چلو تم بھی چل کر دیکھ لو۔"

چنانچہ بار بار اس سے کہتا تھا دیکھ لو۔ بس یہاں شام کو لوگ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں اور گپ لگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ شام تو اس طرح خیریت سے گزر گئی لیکن اگلی شام کو وہ گھر سے اکیلا نکلا تو واپسی میں بوتل اس کے ہمراہ تھی۔ مجھ سے کہنے لگا:

"تم کبھی میرے گھر آتے ہی نہیں۔ چلو میرے ساتھ چلو۔"

چنانچہ میں بھی اس کے ساتھ تانگے پر بیٹھ گیا۔

گھر کے پاس پہنچتے ہی اس نے بوتل مجھے تھماتے ہوئے کہا: "صفیہ میری جیبیں دیکھنے لگ جاتی ہے۔ یہ بوتل تم اپنے پاس رکھو ـــــ میں گھر جانے کے بعد موقع دیکھ کر لے لوں گا۔"

اس بات پر لڑائی ہو گئی۔ میں نے کہا:

"میں اس حالت میں گھر نہیں جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے بھی انہی دوستوں میں سے سمجھ لیا جائے جو آپ کی صحت اور زندگی برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ بوتل اپنے پاس رکھئے تو میں چلتا ہوں ورنہ میرا سلام۔"

اس پر لڑائی ہو گئی۔ مجھے معلوم تھا منٹو ان لوگوں میں سے نہیں، ہیں جنہیں سمجھانے بجھانے سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے اس لئے میں نے دوسرا طریقہ شروع کیا اور اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں بوتل لے کر نہیں جاؤں گا۔

کافی بحث کے بعد اس نے بوتل نیفے میں اڑس لی اور ہم گھر میں داخل ہوئے۔

مگر میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا کہ مجھے وہاں بیٹھنے کے دوران میں کتنا کرب برداشت کرنا پڑا۔ یہ واقعہ ان ہی دنوں کا ہے جب گزشتہ برس وہ ہسپتال سے ڈاکٹر کے اس مشورہ کے بعد آیا تھا کہ شراب اس کے لئے انتہائی مہلک ثابت ہوگی۔ دو تین ماہ تک اسی مشورہ کے بعد اس نے پینا ترک کر دی تھی اور اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی مگر چند دنوں سے بعض دوستوں کی مہربانیوں اور کچھ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر اس نے پھر یہ شغل اختیار کر لیا تھا اور اب صاف نظر آ رہا تھا کہ موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔

گھر پہنچ کر اس کی بیوی اور بچیوں کو جب میں نے دیکھا اور اس کا حشر بھی سامنے نظر آیا تو میں ایک لحظے کے لئے کانپ اٹھا میں سچ کہتا ہوں کہ اس شراب نوشی سے شدید نفرت کے باوجود مجھے اس وقت منٹو کی شراب نوشی پر ذرا بھی غصہ نہیں آ رہا تھا۔ میں دیر تک یہی سوچتا رہا کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا یہی حشر کیوں ہوتا ہے۔ اختر شیرانی، مجاز، عدم اور منٹو اسی راستے پر گامزن رہے اور ہیں۔ اختر مر گیا۔ مجاز دو بار پاگل ہو چکا ہے اور اب منٹو اپنی ہلاکت کا سامان خود کر رہا ہے۔ جو شخص اس قدر ذہین اتنا سمجھدار اور چالاک ہے کہ زندگی کے انتہائی معمولی اور بظاہر نظر نہ آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے اتنی عظیم الشان کہانیاں ترتیب دیتا ہے۔ جو ماہر ترین کاریگر کی طرح اپنے فن میں انتہائی طاق اور سمجھدار ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ وہ اپنے آپ کو ہلاک کئے جا رہا ہے۔ پھر یہ اس کا مقصد بھی نہیں تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ آخری دنوں میں بار بار یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے لئے، بیوی کے لئے، بچیوں کے لئے، سب کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہے مگر پھر بھی کوئی ضرورت ہے جو اسے مجبور کر کے دھکیلے چلے جا رہی ہے۔

ہر شرابی میں نازک احساسات کی شدت سے فراوانی ہوتی ہے۔ جو لوگ شرابیوں کو دیکھ کر انہیں سخت دل، نا سمجھ اور بے وقوف سمجھتے ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں۔ ہر شرابی کے دل کی تہ میں اتر کر دیکھئے۔ وہاں فرار، کمزوری، بے بسی اور مایوسی کا جذبہ نظر آئے گا۔ احساس کا ایسا بے پایاں سمندر نظر آئے گا جسے یہ لوگ برداشت نہیں کر سکتے ـــــ نیکی، اچھائی اور بھلائی کی صفات جب دنیا کی کمینگی، گھٹیا پن اور بے ہودگی سے ٹکراتی ہیں تو پھر فرار کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے وہی ازلی ابدی، یک گونہ بے خودی کا راستہ۔

اس بے خودی کی فکر میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ منٹو بھی مر گیا۔ مرنا تو اسے بھی تھا۔ ایسے لوگوں کے لئے موت ہی نجات ہوتی ہے۔ بے غیرتی تو ہمارے جیسے لوگوں کی ہے جو اس گلی سڑی بے ہودہ دنیا میں اس کی ساری کمینگیوں کو برداشت کئے جا رہے ہیں۔ ان کو ختم تو نہیں کر سکتے مگر اپنے آپ کو تو ختم کر سکتے ہیں مگر ہمارا حوصلہ اتنا بھی نہیں ہے۔ یہ جری لوگ کچھ وہی ہوتے ہیں جو منٹو کی طرح اس دنیا کو اپنے خیال میں ختم کر دیتے ہیں اور اپنے ازلی سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن سعادت حسن منٹو مر کر اس دنیا کو سونی کر گیا۔ کبھی کبھی میں اس کے گھر کے پاس سے گزرتا ہوں تو مجھے ہر طرف اداسی اور غمگینی کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی جب اس کے گھر کی طرف دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ وہ دن کب آئیں گے جب دنیا منٹو جیسے بڑے لوگوں کے لئے آرام سے رہنے کی جگہ بن جائے گی۔ میں سچ کہتا ہوں اگر یہ دنیا اتنی ظالم، اتنی بدصورت اور اتنی مکروہ نہ ہوتی، اگر منٹو کو زندہ رہنے کا تحفظ ملتا تو وہ ابھی پچاس برس اور زندہ رہتا۔

وہ طبعی موت نہیں مرا۔ اسے مار ڈالا گیا ہے اور اسے مارنے والوں میں سب سے زیادہ ہاتھ اس کے دوستوں کا ہے۔ اچھے اور برے دونوں قسم کے دوستوں کا۔ برے دوستوں نے اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور اس کی دشمنی کے لئے اس کے ساتھ مل کر اسے برباد کرتے رہے اور اچھے دوستوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر کے اسے مار ڈالا ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ منٹو کبھی نہیں مر سکتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا — ہمیشہ ہمیشہ، جب تک دنیا میں افسانہ موجود ہے منٹو کا نام باقی رہے گا۔



منٹو مر گیا

بلقیس عابد علی

منٹو مر گیا۔

بعض حکام کا ہاتھی اب ٹھنڈا پھرا کرے گا۔ ہاتھی سفید ہو یا کالا۔ اس کا پالنا روگ پالنے کے برابر ہے اس لئے ارباب نظم و ضبط اسے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

منٹو زندہ تھا تو عوام کو امید تھی کہ جب بھی کہیں کوئی بے انصافی ہوگی منٹو کے نوٹس میں آجائے گی اور پھر وہ سماج اور عوام کو اور حکومت کو مجبور کرے گا کہ اس حقیقت کے گھناؤنے گوشے کو کم از کم جھانک کر دیکھ لے جسے دیکھ کر کراہت پیدا ہوتی ہے اور ہم لوگ دانستہ آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ جس طرح راہ گیر سڑک پر مری ہوئی خچر یا گھوڑے کی لاش کو دیکھنے پر منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں منٹو اس سڑی بسی لاش کے سرہانے بیٹھ جاتا اور آتے جاتے لوگوں سے کہتا کہ اس طرح منہ پھیرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس لاش کو یہاں سے اٹھواؤ اور جہاں جہاں گندگی پھیلی ہے اسے صاف کراؤ۔ پھر اس جگہ کو ڈس انفیکٹ کرواؤ۔ اور آئندہ احتیاط برتو کہ یہاں مردہ لاشیں نہ پھینکی جائیں ورنہ گندی ہوا سے عوام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

شاید ان سڑی لاشوں کے درمیان پھرنے سے منٹو کی صحت بگڑ گئی اور وہ قبل از وقت چل بسا۔

میں تنقید کے اصولوں سے ناواقف ہوں اور یہ نہیں کہہ سکتی کہ منٹو کی ادبی حیثیت کیا تھی۔ لیکن یہ ضرور کہوں گی ہمارے سماجی ناسور جو جگہ جگہ سے رستے معلوم ہوتے ہیں ان پر کسی ماہر امراض کے مانند صحیح مقام پر اس طرح انگلی رکھتا تھا کہ سارا بدن تلملا اٹھتا۔ اب درد کا مقام، ٹھیک طور پر معلوم کرنے کے بعد آگے چیر پھاڑ کرنا سرجن کا کام ہے لیکن ہمارے ملک میں ابھی سرجری اتنی عام نہیں ہے اس کے لئے نہ معلوم کب تک ناسور برداشت کرنا ہوں گے۔

اب بدن میں جگہ جگہ ٹیسیں اٹھیں گی۔ سارا بدن دکھتا معلوم ہوگا مگر درد کے مقام کی طرف اشارہ کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اب چاہے سڑک مردہ لاشوں سے پٹ جائے۔ گندی ہوا پھیل کر وبا کی صورت اختیار کر لے۔ لوگ بالکل راستہ گزرنا چھوڑ دیں مگر اب اس کی طرف توجہ دلانے والا کوئی نہ ہوگا — اب چاہے "ننگی عورت کی لاش" قیامت تک سڑک پر دوڑتی رہے کوئی پھندنا

نہ ہوگا کہ تمہارے کپڑے کہاں ہیں اور تم بے حیائی کی حالت میں کیوں سڑکوں پر ماری ماری پھرتی ہو۔ شاید اس برہنہ عورت کو سوائے منٹو کے کسی سے شرم نہیں آتی۔

۴۷ء کے فسادات میں جب لاشوں کی برہنگی عام تھی۔ جہاں کہیں منٹو نے ننگی لاش دیکھی اسے ضرور نظر بھر کر دیکھ لیا۔ اس جرم پر ارباب اقتدار نے اسے دار پر کھینچا۔ مگر وہ منصور نعرۂ حق لگانے سے کبھی باز نہ آیا۔

میں نے منٹو کو زندگی میں صرف ایک دفعہ دیکھا ہے جب اس نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" پڑھا تھا۔ اس سے پیشتر میں اسے پہچانتی نہ تھی لیکن جب سٹیج پر آکے اس نے پڑھنا شروع کیا تو افسانے کے عنوان کی اپج اور انوکھے پن سے میں فوراً پہچان گئی کہ یہ سڈول بدن کا خوبصورت نوجوان منٹو ہے۔ افسانہ پڑھتے پڑھتے وہ اچٹتی سی نظر سامعین پر ڈالتا۔ لیکن دیکھنے والے کو یوں احساس ہوتا گویا مارے رعونت کے کسی سے آنکھ ملانا گوارا نہیں کی۔ کم از کم مجھے تو یہی احساس ہوا۔ انداز بے پرواہانہ تھا اور چہرے سے بادشاہوں کی سی رعونت ٹپکتی تھی۔

میرے دل میں خواہش تھی کہ منٹو سے ملاقات کروں لیکن افسانہ پڑھنے کے بعد وہ جس برجستگی سے سٹیج پر آیا تھا اسی بے ساختہ پن کے ساتھ ہال سے باہر نکل گیا۔ میری یہ تمنا دل ہی دل میں رہ گئی۔ اس کے بعد پھر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پچھلے چند سالوں سے اس نے بہت زیادہ لکھنا شروع کر دیا تھا (شاید کم نویسی ضروریات کی کفیل نہ ہو سکتی تھی) اس لئے بہت سی ایسی باتیں لکھی ہوتیں جن سے قارئین کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ لیکن پڑھتے پڑھتے یک لخت کوئی ایسا فقرہ آجاتا جس سے معلوم ہوتا کہ ناگہاں منٹو مضمون سے قطع نظر پڑھنے والا اس کی شخصیت کے سحر میں گم ہو جاتا۔

افسوس وہ انوکھا انسان۔ وہ پر اسرار شخصیت، آج زندہ لوگوں کے درمیان نہیں ہے۔ زندگی بھر اس نے کسی کا کہا نہیں کیا تو مرنے پر ہم لوگوں کی توقعات کیوں پوری کرتا۔

دنیا کہتی تھی کہ ابھی تمہارے مرنے کے دن نہیں ہیں لیکن جیتے جی عام انسانوں کی ڈگر پر چلنا اسے ناپسند تھا۔ جب ہجوم کو ایک ہی راستے پر چلتے دیکھا تو سفر زندگی ناتمام چھوڑ دیا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس جہانِ فانی سے چلا گیا ہماری آنکھیں اسے دیکھنے کو ترسا کریں گی۔ مگر اس کی لازوال کہانیاں تنہائی کے مقام سے اہل نظر کو اب بھی تڑپاتی رہیں گی۔

چوں آں محفل افروز در خانہ نیست — تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

زندگی کے زہر کو اپنے افسانوں میں سموتے ہوئے منٹو سنکی بن گیا تھا۔ اب منٹو کو انسان پر اعتماد ہے اور وہ موپاساں کی طرح یہ احساس دلاتا ہے کہ انسان میں گندگی ہے، بدی ہے، بدصورتی ہے۔ لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔



ممتاز شیریں



عزّت کے لئے

چونی لال نے اپنی موٹر سائیکل سٹال کے ساتھ روکی اور گدی پر بیٹھے بیٹھے صبح کے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ سائیکل رکتے ہی سٹال پر بیٹھے ہوئے دونوں ملازموں نے اسے نمستے کی تھی جس کا جواب چونی لال نے اپنے سر کی خفیف جنبش سے دے دیا تھا۔ سرخیوں پہ سرسری نظر ڈال کر چونی لال نے ایک بندھے ہوئے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسے فوراً دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی بی ایس اے موٹر سائیکل کا انجن سٹارٹ کیا اور یہ جا وہ جا۔

موڈرن نیوز ایجنسی قائم ہوئے پورے چار برس ہو چلے تھے۔ چونی لال اس کا مالک تھا۔ لیکن ان چار برسوں میں ایک دن بھی سٹال پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ ہر روز صبح اپنی موٹر سائیکل پر آتا۔ ملازموں کی نمستے کا جواب سر کی خفیف جنبش سے دیتا۔ تازہ اخباروں کی سرخیاں ایک نظر دیکھتا۔ ہاتھ بڑھا کر بنڈل لیتا اور یہ جا وہ جا۔

چونی لال کا سٹال معمولی سٹال نہیں تھا۔ حالانکہ امرتسر میں لوگوں کو انگریزی اور امریکی رسالوں اور پرچوں سے کوئی اتنی دلچسپی نہیں تھی لیکن موڈرن نیوز ایجنسی ہر اچھا انگریزی اور امریکی رسالہ منگواتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چونی لال منگواتا تھا حالانکہ اسے پڑھنے وڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔

شہر میں بہت کم آدمی جانتے تھے کہ موڈرن نیوز ایجنسی کھولنے سے چونی لال کا اصل مقصد کیا تھا۔ یوں تو اس سے چونی لال کو خاصی آمدن ہو جاتی تھی اس لئے کہ وہ قریب قریب ہر بڑے اخبار کا ایجنٹ تھا۔ لیکن سمندر پار سے جو اخبار اور رسالے آتے بہت ہی کم بکتے۔ پھر بھی ہر ہفتے ولایت کی ڈاک سے موڈرن نیوز ایجنسی کے نام کئی خوبصورت بنڈل اور پیکٹ آتے ہی رہتے۔ اصل میں چونی لال یہ پرچے بیچنے کے لئے نہیں بلکہ مفت بانٹنے کے لئے منگواتا تھا۔ چنانچہ ہر روز صبح سویرے وہ ان ہی پرچوں کا بنڈل لینے آتا تھا جو اس کے ملازموں نے باندھ کر رکھ چھوڑے ہوتے تھے۔

شہر کے جتنے بڑے افسر تھے۔ وہ چونی لال کے واقف تھے۔ بعض کی واقفیت صرف یہیں تک محدود تھی کہ ہر ہفتے ان کے یہاں جو انگریزی اور امریکی پرچے آتے ہیں شہر میں کوئی موڈرن نیوز ایجنسی ہے۔ اس کا مالک چونی لال ہے۔ وہ بھیجتا ہے اور بل کبھی روانہ نہیں کرتا۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کو معلوم تھا کہ چونی لال کا گھر بہت ہی خوبصورت ہے۔ ہے تو چھوٹا سا مگر بہت ہی نفیس طریقے پر سجا ہے۔ ایک نوکر ہے راما۔ بڑا صاف ستھرا اور سو فیصدی نوکر۔ سمجھدار، معمولی سا اشارہ سمجھنے والا، جس کو صرف اپنے کام سے غرض ہے۔ دوسرے کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے اس سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں۔

چونی لال گھر پر موجود ہو جب بھی ایک بات ہے، موجود نہ ہو جب بھی ایک بات۔ مہمان کس غرض سے آیا ہے یہ اس کو اس کی شکل دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ کبھی ضرورت محسوس نہیں کی ہو گی کہ اس سے سوڈے برف کے لئے کہا جائے یا پانوں کا آرڈر دیا جائے۔ ہر چیز خود بخود وقت پر مل جائے گی اور پھر تاک جھانک کا کوئی خدشہ نہیں۔ اس بات کا بھی کوئی کھٹکا نہیں کہ بات کہیں باہر نکل جائے گی۔ چونی لال اور اس کا نوکر راما، دونوں کے ہونٹ دریا کے دریا پینے پر بھی خشک رہتے تھے۔

مکان بہت ہی چھوٹا تھا۔ بمبئی سٹائل کا۔ یہ چونی لال نے خود بنوایا تھا۔ باپ کی وفات پر اسے دس ہزار روپے ملے تھے جس میں سے پانچ ہزار اس نے اپنی چھوٹی بہن رُوپا کو دے دیئے تھے اور جدی مکان بھی اور خود علیحدہ ہو گیا تھا۔ روپا اپنی ماں کے ساتھ اس میں رہتی تھی اور چونی لال الگ اپنے بمبئے سٹائل کے مکان میں۔ شروع شروع میں ماں بہن نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ رہے ساتھ نہ رہے تو کم از کم ان سے ملتا ہی رہے مگر چونی لال کو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اپنی ماں اور بہن سے نفرت تھی۔ دراصل اسے شروع ہی سے ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ باپ سے ضرور تھی کہ وہ تھانیدار تھا لیکن جب وہ ریٹائر ہوا تو چونی لال کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جس وقت اسے کالج میں کسی سے کہنا پڑتا کہ اس کے والد ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں تو اسے بہت کوفت ہوتی۔

چونی لال کو اچھی پوشش اور اچھے کھانے کا بہت شوق تھا۔ طبیعت میں نفاست تھی چنانچہ وہ لوگ جو اس کے مکان میں ایک دفعہ بھی گئے اس کے سلیقے کی تعریف اب تک کرتے ہیں۔ این ڈبلیو آر کے ایک نیلام میں اس نے ریل کے ڈبے کی ایک سیٹ خریدی تھی۔ اس کو اس نے اپنے دماغ سے بہت ہی عمدہ دیوان میں تبدیل کروالیا تھا۔ چونی لال کو یہ اس قدر پسند تھا کہ اس نے اپنی خوابگاہ میں رکھوایا ہوا تھا۔

شراب اس نے کبھی چھوئی نہیں تھی لیکن دوسروں کو پلانے کا بہت شوق تھا۔ ایرے غیرے کو نہیں، خاص الخاص آدمیوں کو جن کی سوسائٹی میں اونچی پوزیشن ہو۔ جو کوئی مرتبہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی وہ اکثر دعوت کرتا۔ کسی ہوٹل یا قہوہ خانے میں نہیں۔ اپنے گھر میں جو اس نے خاص اپنے لئے بنوایا تھا۔

زیادہ پینے پر اگر کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو اسے کسی تردّد کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ چونی لال کے پاس ایسی چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں جن سے نشہ کم ہو جاتا ہے۔ ڈر کے مارے کوئی گھر نہ جانا چاہے تو علیحدہ سجے سجائے دو کمرے موجود تھے۔ چھوٹا سا ہال تھا۔ اس میں کبھی کبھی مجرے بھی ہوتے تھے۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ چونی لال کے اس مکان میں اس کے دوست کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں اپنی سہیلیوں سمیت رہے لیکن اس نے ان کو مطلق خبر نہ ہونے دی کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ البتہ جب اس کا کوئی دوست اس کی ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرتا تو چونی لال غیر متوقع طور پر بے تکلف ہو کر کہتا:

"کیا کہتے ہو یار، مکان تمہارا اپنا ہے۔"

عام گفتگو میں وہ اپنے دوستوں کے اونچے مرتبے کے پیش نظر ایسی بے تکلفی کبھی نہیں برتتا تھا۔

چونی لال کا باپ، لالہ گردھاری لال عین اسوقت ریٹائر ہوا جب چونی لال تھرڈ ڈویژن میں انٹرنس پاس کر کے کالج میں داخل

ہوا۔ پہلے تو یہ تھا کہ صبح شام گھر پہ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ڈالیوں پہ ڈالیاں آرہی ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ تنخواہ تو بس سیدھی بنک میں چلی جاتی تھی۔ لیکن ریٹائر ہونے پر کچھ ایسا پانسہ پلٹا کہ لالہ گردھاری لال کا نام جیسے بڑے آدمیوں کے رجسٹر ہی سے کٹ گیا۔ یوں تو جمع پونجی کافی تھی لیکن گردھاری لال نے بیکار مباش کچھ کیا کر، مکانوں کا سٹہ کھیلنا شروع کر دیا اور دو برسوں ہی میں آدھی سے زیادہ جائداد گنوا دی۔ پھر لمبی بیماری نے آگھیرا۔ ان تمام واقعات کا چونی لال کے اوپر عجیب و غریب اثر ہوا۔ لالہ گردھاری لال کا حال پتلا ہونے کے ساتھ ساتھ چونی لال کے دل میں اپنا پرانا ٹھاٹ اور اپنی پرانی ساکھ قائم رکھنے کی خواہش بڑھتی گئی اور آخر میں اس کے ذہن نے آہستہ آہستہ کچھ ایسی کروٹ لی کہ وہ بڑے آدمیوں کا بظاہر ہم جلیس تھا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا لیکن اصل میں وہ ان سے بہت دور تھا۔ ان کے رتبے سے، ان کی جاہ و منزلت سے البتہ اس کا وہی رشتہ تھا جو ایک بت کا پجاری سے ہوتا ہے یا ایک آقا سے غلام کا۔

ہو سکتا ہے کہ چونی لال کے وجود کے کسی گوشے میں بہت ہی بڑا آدمی بننے کی خواہش تھی جو وہیں کی وہیں دب گئی اور یہ صورت اختیار کر گئی جواب اس کے دل و دماغ میں تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرتا تھا اس میں انتہائی درجے کا خلوص تھا۔ کوئی بڑا آدمی اس سے ملے نہ ملے یہی کافی تھا کہ وہ اس کے دیئے ہوئے امریکی اور انگریزی رسالے ایک نظر دیکھ لیتا۔

فسادات ابھی شروع نہیں ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقسیم کی بات بھی ابھی نہیں چلی تھی کہ چونی لال کی بہت دنوں کی پرانی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔

ایک بہت ہی بڑے افسر تھے جن سے چونی لال کی جان پہچان نہ ہو سکی تھی۔ ایک دفعہ اس کے مکان پر شہر کی سب سے خوبصورت طوائف کا مجرا ہوا۔ چند دوستوں کے ہمراہ اس بڑے افسر کا شرمیلا بیٹا ہربنس بھی چلا آیا۔ چنانچہ جب چونی لال کی اس نوجوان سے دوستی ہو گئی تو اس نے سمجھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے باپ سے بھی راہ و رسم پیدا ہو ہی جائے گی۔

ہربنس جس نے تعیش کی زندگی میں نیا نیا قدم رکھا تھا بہت ہی الہڑ تھا۔ چونی لال خود تو شراب نہیں پیتا تھا لیکن ہربنس کا شوق پورا کرنے کے لئے اور اسے شراب نوشی کے ادب آداب سکھانے کے لئے ایک دو دفعہ اسے بھی پینی پڑی لیکن بہت ہی قلیل مقدار میں۔

لڑکے کو شراب پینی آ گئی تو اس کا دل کسی اور چیز کو چاہا۔ چونی لال نے یہ بھی مہیا کر دی اور کچھ اس انداز سے کہ ہربنس کو جھینپنے کا موقع نہ ملنے دیا۔

جب کچھ دن گزر گئے تو چونی لال کو محسوس ہوا کہ ہربنس ہی کی دوستی کافی ہے کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ لوگوں کی سفارشیں پوری کرا لیتا تھا۔ ویسے تو شہر میں چونی لال کے اثر و رسوخ کا ہر شخص قائل تھا لیکن جب سے ہربنس اس کے حلقۂ واقفیت میں آیا تھا اس کی دھاک اور بھی زیادہ بیٹھ گئی تھی۔

اکثر یہی سمجھتے تھے کہ چونی لال اپنے اثر و رسوخ سے ذاتی فائدہ اٹھاتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے لئے کبھی کسی سے سفارش نہیں کی تھی۔ اس کو شوق تھا دوسروں کے کام کرنے اور انہیں اپنا ممنونِ احسان بنانے کا بلکہ یوں کہئے کہ ان کے دل و دماغ پر کچھ ایسے خیالات طاری کرنے کا کہ..... بھئی کمال ہے۔ ایک معمولی سی نیوز ایجنسی کا مالک ہے لیکن بڑے بڑے حاکموں

تک اس کی رسائی ہے۔۔۔۔۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن چونی لال حقیقت میں جو کچھ تھا بہت ہی کم آدمی جانتے تھے۔

ایک کو خوش کیجئے تو بہت سوں کو ناراض کرنا پڑتا ہے چنانچہ چونی لال کے جہاں احسانمند تھے وہاں دشمن بھی تھے اور اس تاک میں رہتے تھے کہ موقع ملے اور اس سے بدلہ لیں۔

فسادات شروع ہوئے تو چونی لال کی مصروفیات زیادہ ہو گئیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے لئے اس نے کام کیا لیکن صرف ان ہی کے لئے جن کا سوسائٹی میں کوئی درجہ تھا۔ اس کے گھر کی رونق بھی بڑھ گئی۔ قریب قریب ہر روز ہی کوئی نہ کوئی سلسلہ رہتا۔ سٹور روم جو سیڑھیوں کے نیچے تھا بیئر کی خالی بوتلوں سے بھر گیا تھا۔

ہربنس کا الھڑپن اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ اب اسے چونی لال کی مدد کی ضرورت نہ تھی۔ بڑے آدمی کا لڑکا تھا۔ فسادات نے دسترخوان بچھا کر نت نئی چیزیں اس کے لئے چن دی تھیں۔ چنانچہ قریب قریب ہر روز وہ چونی لال کے مکان پر موجود ہوتا۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ چونی لال اپنے کمرے میں ریل گاڑی کی سیٹ سے بنائے ہوئے دیوان پر بیٹھا اپنے پستول کو انگلی پر گھما رہا تھا کہ دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ چونی لال چونک پڑا اور سوچنے لگا:

"بلوائی۔۔۔۔۔ نہیں!۔۔۔ راما۔۔۔ نہیں وہ تو کئی دنوں سے کرفیو کے باعث نہیں آ رہا تھا۔"

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ہربنس کی سہمی ہوئی ڈری ہوئی آواز آئی۔ چونی لال نے دروازہ کھولا۔ ہربنس کا رنگ ہلدی کے گابے کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ تک پیلے تھے۔

چونی لال نے پوچھا۔ "کیا ہوا۔"

"وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔" ہربنس کے سوکھے ہوئے گلے میں آواز اٹک گئی۔

چونی لال نے اس کو دلاسہ دیا: "گھبرائیے نہیں۔۔۔۔۔ بتائیے کیا ہوا ہے۔"

ہربنس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری: "وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ لہو۔۔۔۔۔ بند ہی نہیں ہوتا لہو۔"

چونی لال سمجھا تھا کہ شاید لڑکی مر گئی ہے چنانچہ یہ سن کر اسے ناامیدی سی ہوئی کیونکہ وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کی پوری سکیم اپنے ہوشیار دماغ میں تیار کر چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ بہت مستعد ہو جاتا تھا۔ مسکرا کر اس نے ہربنس کی طرف دیکھا جو کہ لرز رہا تھا:

"میں سب کچھ ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اس کمرے کا رخ کیا جس میں ہربنس تقریباً سات بجے سے ایک لڑکی کے ساتھ جانے کیا کر رہا تھا۔ چونی لال نے ایک دم بہت سی باتیں سوچیں۔ ڈاکٹر۔۔۔۔۔ نہیں۔ بات باہر نکل جائے گی۔ ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا سوال ہے۔ اور یہ سوچتے ہوئے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت اسے محسوس ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑے آدمی کے ننگ و ناموس کا محافظ ہے۔

راما۔۔۔۔۔ کرفیو کے باعث وہ کئی دنوں سے نہیں آ رہا تھا۔۔۔ برف!۔۔۔ ہاں برف ٹھیک ہے۔ ریفریجریٹر موجود

تھا...... لیکن سب سے بڑی پریشانی چونی لال کو یہ تھی کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے ایسے معاملوں سے بالکل بے خبر تھا لیکن اس نے سوچا۔ کچھ بھی ہو کوئی نہ کوئی اُپائے نکالنا ہی پڑے گا۔

چونی لال نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ ساگوان کے سپرنگوں والے پلنگ پر ایک لڑکی لیٹی تھی اور سفید چادر خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ چونی لال کو بہت گھن آئی لیکن وہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے کروٹ بدلی اور ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔

"بھیا!"

چونی لال نے بھینچی ہوئی آواز میں کہا: "روپا"...... اور اس کے دماغ میں اوپر تلے سیکڑوں باتوں کا انبار لگ گیا۔ ان میں سب سے ضروری بات یہ تھی کہ ہربنس کو پتہ نہ چلے کہ روپا اس کی بہن ہے۔ چنانچہ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل کر معاملے پر غور کرنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔

دہلیز میں ہربنس کھڑا تھا اور اس کا رنگ اب پہلے سے بھی زرد تھا۔ ہونٹ بالکل بے جان ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں دہشت تھی۔ چونی لال کو دوبدو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

چونی لال نے دروازہ بھیڑ دیا۔ ہربنس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

چونی لال خاموش تھا۔ اس کے چہرے کا کوئی خط بگڑا ہوا نہیں تھا۔ اصل میں وہ سارے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ اسقدر تعمق سے غور کر رہا تھا کہ وہ ہربنس کی موجودگی سے بھی غافل تھا مگر ہربنس کو چونی لال کی غیر معمولی خاموشی میں اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ چونی لال اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ہربنس زور سے چیخا۔ اور دوڑ کر چونی لال کو ایک طرف دھکا دے کر خود اس میں داخل ہو گیا۔ بہت ہی زور سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریل گاڑی کی سیٹ پر سے پستول اٹھایا اور باہر نکل کر چونی لال کی طرف تان دیا۔

چونی لال پھر بھی کچھ نہ بولا۔ وہ ابھی تک معاملہ سلجھانے میں مستغرق تھا۔ سوال ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا تھا۔

پستول ہربنس کے ہاتھ میں کپکپانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد فیصلہ ہو جائے لیکن وہ اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا تھا۔

چونی لال اور ہربنس دونوں کچھ دیر خاموش رہے...... لیکن ہربنس زیادہ دیر تک چُپ نہ رہ سکا۔ اس کے دل و دماغ میں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک دم اس نے بولنا شروع کیا:

"میں...... میں...... مجھے کچھ معلوم نہیں...... مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ...... کہ یہ تمہاری بہن ہے...... یہ ساری شرارت اس مسلمان کی ہے...... اس مسلمان سب انسپکٹر کی...... کیا نام ہے اس کا...... کیا نام ہے اس کا...... محمد طفیل...... ہاں ہاں محمد طفیل...... نہیں نہیں...... بشیر احمد...... نہیں نہیں بشیر احمد...... نہیں نہیں محمد طفیل وہی...... وہی محمد طفیل جس کی ترقی تم نے رکوائی تھی...... اس نے مجھے یہ لڑکی لا کر دی...... اور کہا کہ مسلمان ہے...... مجھے معلوم ہوتا تمہاری بہن ہے تو کیا میں اسے یہاں لے کر آتا...... تم...... تم بولتے کیوں نہیں...... تم بولتے کیوں نہیں۔"

اور اس نے چلّانا شروع کر دیا...... "تم بولتے کیوں نہیں...... تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو...... لیکن میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا...... مجھے کچھ معلوم نہیں تھا...... مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

چونی لال نے آہستہ سے کہا: "گھبرائیے نہیں..... آپ کے پتاجی کی عزت کا سوال ہے۔"

لیکن ہر بنس چیخ چلا رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ سنا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستول داغ دیا۔

تیسرے روز کرفیو آرڈر ہٹنے پر چونی لال کے دو نوکروں نے موڈرن نیوز ایجنسی کا سٹال کھولا۔ تازہ اخبار اپنی اپنی جگہ پر رکھے۔ چونی لال کے لئے اخباروں اور رسالوں کا ایک بنڈل باندھ کر الگ رکھ دیا مگر وہ نہ آیا۔

کئی راہ چلتے آدمیوں نے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم کیا کہ موڈرن نیوز ایجنسی کے مالک چونی لال نے اپنی سگی بہن کے ساتھ منہ کالا کیا اور بعد میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔

سعادت حسن منٹو غلطی سے کسی چھابڑی بیچنے والے کو مزدوروں کا نمائندہ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی زبان سے سیٹھ (مالک مکان) کو گالی دلوا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے انقلابی ادب کی تخلیق کی ہے۔ لیکن مزدور یہ کہانی پڑھ کر منٹو کی سادگی پر ہنس پڑتا ہے۔ منٹو کا یہ مزدور بنیادی طور سے کسان ہے جس نے شہر میں آکر اپنی معصومیت کھو دی ہے لیکن منٹو کے ہاتھ میں پڑ کر وہ "ہتک" کی ہیروئن (منٹو کی اس محبوب رنڈی) سے زیادہ قریب ہو گیا ہے جو اپنے گاہک کی زبان سے اپنی بدصورتی اور بڑھاپے کے بارے میں ایک فقرہ سن کر انتقاماً اپنے خارش زدہ کتے کے ساتھ سو جاتی ہے۔ وہ مزدوروں کی ذہنی سطح کی پستی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے فن کی بلندی کو ثابت کرنے کی طرح طرح سے کوشش کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ خود اس ذہنی سطح پر پہنچ گیا ہے جس کی پستی گندے نالوں اور چہ بچوں تک کو شرما دیتی ہے۔ بو —— ٹھنڈا گوشت —— ہتک —— پڑھئے کلمہ وغیرہ سماج کی تخلیقی قوتوں سے دوری اور عوام کے ساتھ فطری یگانگت نہ ہونے کا ہی نتیجہ ہے۔

علی سردار جعفری

منٹو کا فنی شعور غالباً افسانہ نویسی کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ اس میں ایک طرح کا فطری بہاؤ، ایک قسم کی زبردست آمد تھی۔ ان کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ بغیر زیادہ کاوش کے وجود میں آگئے ہیں۔ لیکن ان کی انفرادیت پسندی کبھی کبھی شعوری طور پر انہیں ایسے موضوعات منتخب کرنے پر مجبور کرتی تھی جو وقت کی انقلابی حقیقت سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ یہ بات ۱۹۴۷ء تک کم تھی بعد میں زیادہ بڑھی۔ تاہم ان کے متعدد افسانے اس عہد کی افسانہ نویسی کا لازوال سرمایہ ہیں۔

احتشام حسین 



گورمکھ سنگھ کی وصیت

پہلے چھرا بھونکنے کی اکا دکا واردات ہوتی تھیں، اب دونوں فریقوں میں باقاعدہ لڑائی کی خبریں آنے لگی تھیں جن میں چاقو چھریوں کے علاوہ کرپانیں، تلواریں اور بندوقیں عام استعمال کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی دیسی ساخت کے بم پھٹنے کی اطلاع بھی ملتی تھی۔

امرتسر میں قریب قریب ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ یہ فرقہ وارانہ فسادات دیر تک جاری نہیں رہیں گے۔ جوش ہے جوں ہی ٹھنڈا ہوا فضا پھر اپنی اصلی حالت پر آجائے گی۔ اس سے پہلے ایسے کئی فساد امرتسر میں ہو چکے تھے جو دیر پا نہیں تھے۔ دس پندرہ روز تک مار کٹائی کا ہنگامہ رہتا تھا پھر خود بخود فرو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پرانے تجربے کی بنا پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ یہ آگ تھوڑی دیر کے بعد اپنا زور ختم کر کے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ بلوؤں کا زور دن بہ دن بڑھتا ہی گیا۔

ہندوؤں کے محلے میں جو مسلمان رہتے تھے، بھاگنے لگے۔ اسی طرح وہ ہندو جو مسلمانوں کے محلے میں تھے اپنا گھر بار چھوڑ کے محفوظ مقاموں کا رخ کرنے لگے مگر یہ انتظام سب کے نزدیک عارضی تھا۔ اس وقت تک کے لیے جب فضا فسادات کے تکدر سے پاک ہو جانے والی تھی۔

میاں عبدالحی، ریٹائرڈ سب جج کو تو سو فی صد یقین تھا کہ صورت حال بہت جلد درست ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہیں تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا گیارہ برس کا، ایک لڑکی تھی سترہ برس کی۔ ایک پرانا ملازم تھا جس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ مختصر سا خاندان تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو میاں صاحب نے بطور حفظ ما تقدم کافی راشن گھر میں جمع کر لیا تھا۔ اس طرف سے وہ بالکل مطمئن تھے کہ اگر خدانخواستہ حالات کچھ زیادہ بگڑ گئے اور دکانیں وغیرہ بند ہو گئیں تو انہیں کھانے پینے کے معاملے میں تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن ان کی جوان لڑکی صغرا بہت متردد تھی۔ ان کا گھر تین منزلہ تھا۔ دوسری عمارتوں کے مقابلے میں کافی اونچا۔ اس کی ممٹی سے شہر کا تین چوتھائی حصہ بخوبی نظر آتا تھا۔ صغرا اب کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نزدیک دور کہیں نہ کہیں آگ لگی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی پر اب وہ بھی بند ہو گئی تھی اس لیے کہ جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگی تھی۔

رات کو اب کچھ اور ہی سماں ہوتا۔ گھپ اندھیرے میں آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھتے جیسے دیو ہیں جو اپنے منہ سے آگ کے فوارے چھوڑ رہے ہیں۔ پھر عجیب عجیب سی آوازیں آتیں جو ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ مل کر بہت ہی وحشت ناک بن جاتیں۔

صغرا اپنے باپ سے اس خوف و ہراس کا ذکر نہیں کرتی تھی اس لیے کہ وہ ایک بار گھر میں کہہ چکے تھے کہ ڈرنے کی کوئی وجہ

نہیں، سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میاں صاحب کی اکثر باتیں درست ہوا کرتی تھیں۔ صغرا کو اس سے یک گونہ اطمینان تھا مگر جب بجلی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ساتھ ہی نلوں میں پانی آنا بند ہو گیا تو اس نے میاں صاحب سے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ڈرتے ڈرتے اپنی رائے دی تھی کہ چند روز کے لئے شریف پورے اٹھ جائیں جہاں اڑوس پڑوس کے سارے مسلمان آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ میاں صاحب نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور کہا:

"بیکار گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

مگر حالات بہت جلدی ٹھیک نہ ہوئے اور دن بدن بگڑتے گئے۔ وہ محلہ جس میں میاں عبدالحئی کا مکان تھا مسلمانوں سے خالی ہو گیا اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میاں صاحب پر ایک روز اچانک فالج گرا جس کے باعث وہ صاحبِ فراش ہو گئے۔ ان کا لڑکا بشارت بھی جو پہلے اکیلا گھر میں اوپر نیچے طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف رہتا تھا اب باپ کی چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور حالات کی نزاکت سمجھنے لگا۔ وہ بازار جو ان کے مکان کے ساتھ ملحق تھا، سنسان پڑا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ کی ڈسپنسری مدت سے بند پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر ڈاکٹر گوراندتامل تھے۔ صغرا نے شہ نشین سے دیکھا تھا کہ ان کی دکان میں بھی تالے پڑے ہیں۔ میاں صاحب کی حالت بہت ہی مخدوش تھی۔ صغرا اس قدر پریشان تھی کہ اس کے ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے تھے۔ بشارت کو الگ لے جا کر اس نے کہا:

"خدا کے لئے تم ہی کچھ کرو۔ میں جانتی ہوں کہ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں مگر تم جاؤ، کسی کو بھی بلا لاؤ۔ اباجی کی حالت بہت خطرناک ہے۔"

بشارت گیا مگر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چوک میں اس نے ایک لاش دیکھی تھی خون سے تر بتر اور پاس ہی بہت سے آدمی ڈھاٹے باندھے ایک دکان لوٹ رہے تھے۔ صغرا نے اپنے خوف زدہ بھائی کو سینے کے ساتھ لگایا اور صبر شکر کر کے بیٹھ گئی مگر اس سے اپنے باپ کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ میاں صاحب کے جسم کا داہنا حصہ بالکل سن ہو گیا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ گویائی میں بھی فرق پڑ گیا تھا اور وہ زیادہ تر اشاروں ہی سے باتیں کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ صغرا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کچھ بھی ٹھیک نہ ہوا۔ روزے ختم ہونے والے تھے صرف دو رہ گئے تھے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ عید سے پہلے پہلے فضا بالکل صاف ہو جائے گی مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید عید ہی کا روز روزِ قیامت ہو کیونکہ ممٹی پر سے اب شہر کے قریب قریب ہر حصے سے دھوئیں کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ رات کو بم پھٹنے کی ایسی ایسی ہولناک آوازیں آتی تھیں کہ صغرا اور بشارت ایک لحظے کے لئے بھی سو نہیں سکتے تھے۔ صغرا کو تو یوں بھی باپ کی تیمارداری کے لئے جاگنا پڑتا تھا مگر اب یہ دھماکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ کے اندر ہو رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنے مفلوج باپ کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے وحشت زدہ بھائی کی طرف۔ بہتر برس کا بڈھا ملازم اکبر تھا جس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات پڑا اپنی کوٹھڑی میں کھانستا کھنکارتا اور بلغم نکالتا رہتا تھا۔ ایک روز صغرا اس پر برس پڑی:

"تم کس مرض کی دوا ہو۔ دیکھتے نہیں ہو میاں صاحب کی کیا حالت ہے۔ اصل میں تم پرلے درجے کے نمک حرام ہو۔ اب خدمت کا

موقع آیا ہے تو دے کا بہانہ کر کے یہاں پڑے رہتے ہو۔ وہ بھی خادم تھے جو آقا کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے"۔

صغرا اپنا جی ہلکا کر کے چلی گئی۔ بعد میں اس کو افسوس ہوا کہ ناحق اس غریب کو اتنی لعنت ملامت کی۔ رات کا کھانا تھال میں لگا کر اس کوٹھڑی میں گئی تو دیکھا خالی ہے۔ بشارت نے گھر میں ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میاں صاحب کے لئے کچھ کرنے گیا ہے۔ صغرا نے بہت دعائیں مانگیں کہ خدا اسے کامیاب کرے لیکن دو دن گزر گئے اور وہ نہ آیا۔

شام کا وقت تھا۔ ایسی کئی شامیں صغرا اور بشارت دیکھ چکے تھے جب عید کی آمد آمد کے ہنگامے برپا ہوتے تھے۔ جب آسمان پر چاند دیکھنے کے لئے ان کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ دوسرے روز عید تھی صرف چاند کو اس کا اعلان کرنا تھا۔ دونوں اس اعلان کے لئے کتنے بے تاب ہوا کرتے تھے۔ آسمان پر چاند والی جگہ پر اگر بادل کا کوئی ہٹیلا ٹکڑا جم جاتا تو کتنی کوفت ہوتی تھی۔ اب گھماب چاروں طرف دھوئیں کے بادل تھے۔ صغرا اور بشارت دونوں مٹی پر چڑھے۔ دور دور کہیں کہیں کوٹھوں پر لوگوں کے سائے دھبوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے مگر معلوم نہیں یہ چاند دیکھ رہے تھے یا جگہ جگہ سلگتی اور بھڑکتی ہوئی آگ!

چاند بھی کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ دھوئیں کی چادر میں سے بھی نظر آ گیا۔ صغرا نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدا اپنا فضل کرے اور اس کے باپ کو تندرستی عطا فرمائے۔ بشارت دل ہی دل میں کوفت محسوس کر رہا تھا کہ گڑبڑ کے باعث ایک اچھی بھلی عید غارت گئی۔

دن ابھی پوری طرح ڈھلا نہیں تھا یعنی شام کی سیاہی ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کی چارپائی چھڑکاؤ کئے ہوئے صحن میں بچھی تھی۔ وہ اس پر بے حس و حرکت لیٹے تھے اور دور آسمان پر نگاہیں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ عید کا چاند دیکھ کر جب صغرا نے پاس آ کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے اشارے سے جواب دیا۔ صغرا نے سر جھکایا تو انہوں نے وہ بازو جو ٹھیک تھا اٹھایا اور اس پر شفقت سے پھیرا۔ صغرا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو میاں صاحب کی آنکھیں بھی نم ناک ہو گئیں۔ مگر انہوں نے تسلی دینے کی خاطر بہ مشکل اپنی نیم مفلوج زبان سے یہ الفاظ نکالے:

"اللہ تبارک و تعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا"۔

عین اسی وقت باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ صغرا کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ اس نے بشارت کی طرف دیکھا جس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میاں صاحب صغرا سے مخاطب ہوئے: "دیکھو کون ہے"؟

صغرا نے سوچا کہ شاید بڈھا اکبر ہو۔ اس خیال ہی سے اس کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ بشارت کا بازو دبکڑ کر اس نے کہا: "جاؤ دیکھو شاید اکبر آیا ہے"۔

یہ سن کر میاں صاحب نے نفی میں یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہے ہوں "نہیں یہ اکبر نہیں ہے"۔

صغرا نے کہا: "تو اور کون ہو سکتا ہے ابا جی"۔

میاں عبدالحی نے اپنی قوت گویائی پر زور دے کر کچھ کہنے کی کوشش کی کہ بشارت آ گیا۔ وہ سخت خوف زدہ تھا۔ ایک سانس اوپر ایک نیچے۔ صغرا کو، میاں صاحب کی چارپائی سے ایک طرف ہٹا کر اس نے ہولے سے کہا: "ایک سکھ ہے"۔

صغرا کی چیخ نکل گئی: "سکھ؟ کیا کہتا ہے"۔
بشارت نے جواب دیا: "کہتا ہے۔ دروازہ کھولو"۔
صغرا نے کانپتے ہوئے بشارت کو کھینچ کر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور باپ کی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف ویران نظروں سے دیکھنے لگی۔

میاں عبدالحیٔ کے پتلے پتلے بے جان ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی:
"جاؤ..... گورمکھ سنگھ ہے"۔
بشارت نے نفی میں سر ہلایا: "کوئی اور ہے"۔
میاں صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا: "جاؤ صغرا۔ وہی ہے"۔
صغرا اٹھی۔ وہ گورمکھ سنگھ کو جانتی تھی۔ پنشن لینے سے کچھ عرصہ پہلے اس کے باپ نے اس نام کے ایک سکھ کا کوئی کام کیا تھا۔ صغرا کو اچھی طرح یاد نہیں تھا شاید اس کو ایک جھوٹے مقدمے سے نجات دلائی تھی۔ جب سے وہ ہر چھوٹی عید سے ایک دن پہلے رومالی سویوں کا ایک تھیلا لے کر آیا کرتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا:
"سردار جی۔ آپ یہ تکلیف نہ کیا کریں"۔
مگر وہ ہاتھ جوڑ کر جواب دیتا:
"میاں صاحب! واہگورو کی کرپا سے آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ یہ تو ایک تحفہ ہے جو میں جناب کی خدمت میں ہر سال لے کر آتا ہوں۔ مجھ پر جو آپ نے احسان کیا تھا اس کا بدلہ تو میری سو پشت بھی نہیں چکا سکتی۔ خدا آپ کو خوش رکھے"۔
سردار گورمکھ سنگھ کو ہر سال عید سے ایک روز پہلے سویوں کا تھیلا لاتے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ صغرا کو حیرت ہوئی کہ اس نے دستک سن کر یہ کیوں خیال نہ کیا کہ وہی ہوگا۔ مگر بشارت بھی تو اس کو سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ پھر اس نے کیوں کہا، کوئی اور ہے۔ اور کون ہو سکتا ہے؟ یہ سوچتی ہوئی صغرا ڈیوڑھی تک پہنچی۔ دروازہ کھولے یا اندر ہی سے پوچھے۔ اس کے متعلق وہ ابھی فیصلہ کر ہی رہی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ صغرا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بہ مشکل تمام اس کے حلق سے آواز نکلی: "کون ہے"۔

بشارت پاس کھڑا تھا۔ اس نے دروازے کی ایک درز کی طرف اشارہ کیا اور صغرا سے کہا: "اس میں سے دیکھو"۔
صغرا نے درز میں سے دیکھا۔ گورمکھ سنگھ نہیں تھا۔ وہ تو بہت بوڑھا تھا۔ لیکن یہ جو باہر تھڑے پر کھڑا تھا جوان تھا۔ صغرا ابھی درز پر آنکھ جمائے اس کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صغرا نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا تھیلا تھا۔ ویسا ہی جیسا گورمکھ سنگھ لایا کرتا تھا۔
صغرا نے درز سے آنکھ ہٹائی اور ذرا بلند آواز میں دستک دینے والے سے پوچھا: "کون ہیں آپ؟"
باہر سے آواز آئی: "جی..... جی میں... میں سردار گورمکھ سنگھ کا بیٹا ہوں، سنتوکھ"۔
صغرا کا خوف بہت حد تک دور ہو گیا تھا۔ بڑی شائستگی سے اس نے پوچھا: "فرمایئے۔ آپ کیسے آئے ہیں"؟

باہر سے آواز آئی۔ "جی..... جج صاحب کہاں ہیں"۔

صغرا نے جواب دیا: "بیمار ہیں"۔

سردار سنتو کھ سنگھ نے افسوس آمیز لہجے میں کہا۔ "اوہ" ـــــ پھر اس نے کاغذ کا تھیلا کھڑکھڑایا: "جی یہ سویاں ہیں۔ سردار جی کا دیہانت ہو گیا ہے، وہ مر گئے ہیں"۔

صغرا نے جلدی سے پوچھا۔ "مر گئے ہیں؟"

باہر سے آواز آئی۔ "جی ہاں۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ دیکھو بیٹا۔ میں جج صاحب کی خدمت میں پورے دس برس سے ہر چھوٹی عید پر سویاں لے جاتا رہا ہوں۔ یہ کام میرے مرنے کے بعد اب تمہیں کرنا ہوگا۔ میں نے انہیں بچن دیا تھا جو میں پورا کر رہا ہوں۔ لے لیجئے سویاں"۔

صغرا اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ سردار گورمکھ سنگھ کے لڑکے نے سویوں کا تھیلا آگے بڑھا دیا جو صغرا نے پکڑ لیا اور کہا: "خدا سردار جی کو جنت نصیب کرے"۔

گورمکھ سنگھ کا لڑکا کچھ توقف کے بعد بولا: "جج صاحب بیمار ہیں"۔

صغرا نے جواب دیا: "ہاں"۔

"کیا بیماری ہے"۔

"فالج"۔

"اوہ، سردار جی زندہ ہوتے تو انہیں یہ سن کر بہت دکھ ہوتا۔ مرتے دم تک انہیں جج صاحب کا احسان یاد تھا۔ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں دیوتا ہیں۔ اللہ میاں انہیں زندہ رکھے، انہیں میرا سلام"۔

اور یہ کہہ کر وہ تھڑے سے اتر گیا۔ صغرا سوچتی ہی رہ گئی کہ اسے ٹھہرائے اور کہے جج صاحب کے لئے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر دے۔

سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا سنتو کھ جج صاحب کے مکان کے تھڑے سے اتر کر چند گز آگے بڑھا تو چار ڈھاٹا باندھے ہوئے آدمی اس کے پاس آئے۔ دو کے پاس جلتی مشعلیں تھیں اور دو کے پاس مٹی کے تیل کے کنستر اور کچھ دوسری آتش خیز چیزیں۔ ایک نے سنتو کھ سے پوچھا: "کیوں سردار جی۔ اپنا کام کر آئے"۔

سنتو کھ نے سر ہلا کر جواب دیا: "ہاں، کر آیا"۔

اس آدمی نے ڈھاٹے کے اندر ہنس کر پوچھا: "تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا؟"

"ہاں، جیسے تمہاری مرضی"۔

یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔



ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا۔ کلونت کور پلنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ شہر کا مضافات ایک عجیب پراسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے اُلجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا ہاتھ میں کرپان لئے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گذر گئے۔ کلونت کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا اور دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولہے تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور کچھ بہت ہی زیادہ اُوپر کو اُٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے

ایشر سنگھ گو سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اُس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے۔ مگر اس کے قد و قامت اور خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی میں گزر گئے، تو کلونت کور چھلک پڑی۔ لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی، "ایشر سیاں"

ایشر سنگھ نے گردن اُٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلائی، "ایشر سیاں" لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی "کہاں رہے تم اتنے دن؟"

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، "مجھے معلوم نہیں۔"

کلونت کور بھنا گئی۔ "یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے؟"

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا جو اب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ "جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟"

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا

"کلونت!"

آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آگئی "ہاں جانی" کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا اس کے گوشت بھرے کولہے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا: "یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے"۔

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا: ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟"

"بُرے کی ماں کے گھر" ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کر دیکھا اور دفعتہً دونوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔

"قسم واہگورو کی، بڑی جاندار عورت ہو"۔

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیئے اور پوچھا "تمہیں میری قسم بتاؤ کہاں رہے؟ —— شہر گئے تھے"؟

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا "نہیں"

کلونت کور چڑ گئی: "نہیں تم ضرور شہر گئے تھے —— اور تم نے بہت سا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو"

"وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے"۔

کلونت کور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔ لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی: "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا؟ —— اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے۔ مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کے لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے"۔

ایشر سنگھ کا زرد رنگ ہوگیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا۔ "دیکھا کیسے رنگ نیلا پڑ گیا —— ایشر سیاں قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے"؟

"تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں"۔

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہوگیا۔ بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "ایشر سیاں، کیا بات ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے"

ایشر سنگھ ایک دم اُٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اُس ے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ "جانی میں وہی ہوں ...... گھٹ گھٹ پا چھیاں، تیری نکلے ہڈاں ی گرمی ......"

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی۔ "تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟"

"بُرے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔"

"بتاؤ گے نہیں؟"

"کوئی بات ہو تو بتاؤں۔"

"مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو!"

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیئے۔ مونچھوں کے بال کلونت ر کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آ گئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا، "آ جاؤ! ایک بازی تاش کی ہو جاتے!"

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں، ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا: "چل دفان ہو۔"

ایشر سنگھ نے اُس کے بھرے ہوئے کولھے پر چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ "نہ کر ایشر سیاں، یرے درد ہوتا ہے!"

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اتار کے پھینک دیا اور کہا: "لو، پھر ہو جائے ترپ چال ......"

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں، اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا پھر اُس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور ور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا: "کلونت، قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو!"

کلونت کور اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی۔ "بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں!"

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا: "ہونے دے آج ظلم" اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کئے۔ کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا۔ کان کی لوؤں کو کاٹا، اُبھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا۔ بھرے ہوئے کولھوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے۔ گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لیے۔ چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح اُبلنے لگی۔ لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا جتنے گُر اور داؤ اُسے یاد تھے سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیئے پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور

نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے۔ غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا: "ایشر سیاں کافی پھینٹ چکا ہے۔ اب پتا پھینک!"

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی، ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا۔ اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اُسے گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا۔ لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی۔ اس کو اُتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایشر سیاں، وہ کون حرامزدی ہے، جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے اور جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے۔"؟

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے اُبلنے لگی۔ "میں پوچھتی ہوں کون ہے وہ چڈو —— کون ہے وہ الفتی —— کون ہے وہ چور پتا؟"

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "کوئی بھی نہیں کلونت کور، کوئی بھی نہیں۔"

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا، ایشر سیاں میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی —— کھا واہگورو جی کی قسم —— کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟"

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی۔ "قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں، —— تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا —— لے اب کھا واہگورو کی قسم....... کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں"؟

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی۔ لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی۔ میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اُتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے پھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی، "جانے دے اب کلونت! جانے دے۔"

آواز میں بلا کا درد تھا، کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون، ایشر سنگھ کے گلے سے اُڑ اُڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا، اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔ "میری جان! تم نے بہت جلدی کی —— لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔"

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا: "مگر وہ کون ہے تیری ماں؟"

لہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا، جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"اور میں —— اور میں —— بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں —— اسی کرپان سے......"

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی "میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟"

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں، ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور کلونت کور سے کہا۔ گالی نہ دے اُس بھڑوی کو۔"

کلونت چلائی "میں پوچھتی ہوں، وہ کون ہے"؟

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی "بتاتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔ "انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے"۔

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی "ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر"۔

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی —— "مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں..... گلا چرا ہے ماں یا میرا..... اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا"۔

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے۔

کلونت! میری جان..... میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا؟..... انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے..... شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا..... گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے میں نے تمہیں دے دیئے..... لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی"۔

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔ "کون سی بات"؟

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا "جس مکان پر..... میں نے دھاوا بولا تھا..... اس میں سات..... اس میں سات آدمی تھے —— چھ میں نے..... قتل کر دیئے..... اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے..... چھوڑ اسے..... سُن..... ایک لڑکی تھی بہت ہی سُندر..... اس کو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا"۔

کلونت کور خاموشی سے سنتی رہی، ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اُڑایا۔ "کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی..... میں اُسے مار ڈالتا، پر میں نے کہا "نہیں، ایشر سیاں کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ"۔

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا "ہوں....."!

اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا..... راستے میں..... کیا کہہ رہا تھا میں؟..... ہاں راستے میں..... نہر کی پٹڑی کے پاس، تھوہر کی جھاڑیوں تلے میں نے اُسے لٹا دیا..... پہلے سوچا کہ پھینٹوں لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں"..... یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا: "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے: "میں نے ...... میں نے پتّا پھینکا ......

"لیکن ...... لیکن"

اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا: "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا، جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی "...... وہ مری ہوئی تھی ...... لاش تھی ...... بالکل ٹھنڈا گوشت ...... جانی مجھے اپنا ہاتھ دے ......"

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا، جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

منٹو کے یہاں جنس کا طلسم جس میں ان کا شعور اور لاشعور چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے حد درجہ مریضانہ ہے۔ جنس نے سعادت حسن منٹو کے یہاں مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ جس مصنف کے ذہن پر جنس چھائی ہو جنون بھی اس سے زیادہ دور نہیں رہتا۔ منٹو کا انقلابی ہیرو بھی بجائے اس کے کہ سلجھے ہوئے عمل سے محنت اور کوشش سے تبلیغ سے ملک کو کوئی فائدہ پہنچائے بالعموم اپنے جوشِ جنوں میں پاگل خانے یا مرگھٹ پہنچتا ہے۔ سب سے بڑا اعتراض منٹو پر یہ عائد ہوتا ہے کہ اس میں انسانیت کا راسخ عقیدہ کہیں نظر نہیں آتا۔

عزیز احمد

سعادت حسن منٹو اردو کے ایک نہایت اچھے افسانہ نگار ہیں اور میں کہوں گا کہ ان کے چند افسانے ہمارے ادب کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے بعض افسانے خراب ہیں۔ بعض رجعت پسند ہیں۔ میں نے خود منٹو صاحب سے ایک مرتبہ ان کے افسانے "بو" کے متعلق یہ کہا کہ آپ کا یہ افسانہ ایک بہت ہی دردناک لیکن فضول افسانہ ہے اس لئے کہ درمیانی طبقے کے ہر آسودہ حال فرد کی جنسی بدعنوانیوں کا تذکرہ چاہے وہ کتنا ہی حقیقت پر مبنی کیوں نہ ہو لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کے لئے تضیع اوقات ہے۔



سجاد ظہیر



بُو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ ساگوان کے اس سپرنگوں و پلنگ پر جواب کھڑکی کے پاس سے ذرا ادھر کو سرکا دیا گیا تھا۔ ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھ

کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہ تھے اور وہ گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی تھی۔ شام کے قریب دن بھر ایک انگریزی اخبار کی تم خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد جب وہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو جو غا والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لیے املی کے درخت کے نیچے کھڑی تھی کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور آخر میں ہاتھ کے اشارے سے اوپر بلایا تھا۔

وہ کئی دنوں سے شدید قسم کی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی قریب قریب تمام کرسچین جو پہلے سستے داموں پر مل جاتی تھیں۔ عورتوں کی اگزالری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں سے بعض نے فو کے علاقے میں ڈانسنگ اسکول کھول لیے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی ـــــ رندھیر بہت ا ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئیں تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی۔ کہ رندھیر گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ، صحت مند اور خوبصورت تھا۔ صرف اس لیے اس پر فورٹ اکثر قحبہ خانوں کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے کہ اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر، ناگپاڑہ اور تاج ہوٹل کے گرد و نواح کی کئی کرسچین لڑکیوں سے جسمانی ملاقات کر چکا اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی ملاقات کے آداب سے وہ ان کرسچین لونڈوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیہ رکھتا ہے۔ جن سے یہ لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغد سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہیزل سے اس کی تازہ تازہ پیدا شدہ رعونت کا بدلہ لینے کی خاطر اس گھا کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیزل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح کو وردی پہن کر اور اپنے کٹے ہو بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویے پر جما کر باہر نکلتی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی گویا فٹ پاتھ پر تمام جا والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر وہ کیوں ان کرسچین چھوکریوں کی طرف آنا راغب ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام قابل نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کیے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سناتی ہیں۔ جب ڈانس کی دھن سنتی ہیں تو اپنی ٹانگیں تھرکانا شروع کر دیتی ہیں ـــــ یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی عورت بھی ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے بلایا تھا تو اسے ہرگز ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ سلائے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا کہیں ایسا نہ ہو، بے چاری کو نمونیہ ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا۔ "یہ کپڑے اتار دو، سردی لگ جائے گی"

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ کیوں کہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے مگر بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی سفید دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا۔ جس کا میل بھیگنے کے باعث اور زیادہ ابھر آیا تھا ـــــ کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی بھنسی بھنسی چولی اتارنے کی کوشش شروع کی۔ جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ یہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر ـــــ میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک کر ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا۔ "میں کیا کروں نہیں کھلتی"

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا۔ دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور زور سے کھینچا۔ گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھر ـــــ ادھر ہٹے اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ رندھیر نے ایک لمحے کے لیے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو چابکدست کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔

مٹیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں۔ ایک عجیب قسم کی چمک محلول تھی۔ سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار دیئے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔

برسات کے یہی دن تھے کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے کپکپا رہے تھے اس گھاٹی لڑکی کے دونو کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے

ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں نائیوں کے غلیظ مگر گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی تھی۔

ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔ دونوں گویا ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے انہوں نے مشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیوں کہ جو کچھ انہیں کہنا سننا تھا۔ سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہوتا رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جو ان کے اردگرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اس ہوائی لمس سے بھی جاگ اُٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لحظے کے لیے کپکپا اُٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الھڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ تمام باتیں سنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سنانا چاہئیں، وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی تھیں۔ اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں۔ مگر یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا۔ بہت ہی مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے بدن سے عجیب و غریب قسم کی بو آتی رہی تھی۔ اس بو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبو تھی۔ وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے ہر جگہ سے یہ بو جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی رندھیر کے ہر سانس میں موجود ہوتی تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی۔ اگر اس کے ننگے بدن سے یہ بو نہ اُڑتی ——— یہ بو جو اس کے دل و دماغ کے ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی۔ اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بو نے اس لڑکی کو اور رندھیر کو ایک رات کے لیے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گئے تھے۔ جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی۔ جو مائل بہ پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی ——— وہ دونوں ایک ایسا پنچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتا اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس بو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلتی تھی۔ رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے ...... لیکن نہیں وہ بو کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ بالکل اصلی تھی ——— عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بُو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبو دار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بُو دب جائے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار ــــ ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی۔ بلکہ عجیب طرح کی لذّت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بُو نکلتی تھی جو غایت درجہ قابلِ فہم ہونے کے باوجود ناقابلِ فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے پہچانتا ہے اس کا مطلب بھی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو سمجھا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے ...... یہی، کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تھا تو پیپل کے پتّے لرز لرز کر نہا رہے تھے۔ ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی دھندلی سی روشنی اتر آئی تھی۔ ــــ برسات کے یہی دن تھے۔ جب رندھیر کے اس کمرے میں ساگوان کا صرف ایک پلنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ بارش کے قطروں کے ساتھ تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی بھی اُتر رہی تھی مگر فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ایک گوری چٹی لڑکی اپنے ستر کو ننگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے غالباً سو گئی تھی ــــ اس کی لال شلوار ریشمی دوسرے پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گہرے سرخ آزار بند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا اس پلنگ پر اس کے دوسرے رکھے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کے سنہرے پھولوں والی قمیض، انگیا، جانگیا اور دوپٹہ ــــ سب کا رنگ سرخ تھا بے حد سرخ، یہ سب کپڑے حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مقیش کے ذرّے گرد کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے، سرخی اور مقیش کے ذرّات نے مل جل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ بے جان سا، اُڑا اُڑا اور اس کے گورے سینے پر انگیا کے کچّے رنگ نے جا بجا لال لال دھبّے ڈال دیئے تھے۔

چھاتیاں دُودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی تھوڑی نیلاہٹ بھی ہوتی ہے بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے۔ جس کے باعث وہاں سرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا کیا ایسا نہیں لگتا۔ جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اسے لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے۔ کتابوں اور چینی کے برتنوں کی طرح۔ کیوں کہ جس طرح کتابوں پر داب کے نشان ہوتے ہیں اور چینی کے برتنوں پر ہلنے جلنے سے خراشیں آ جاتی ہیں ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر کئی جگہ ایسے نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں پیٹھ پر اور سامنے سینے کے نرم نرم گوشت

پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے اردگرد کس کر بندھے ہوئے آزاربند کا نشان —— وزنی اور نوکیلے جڑاؤ نکلیس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پیدا ہوگئی تھیں جیسے ناخنوں سے بڑے زور کے ساتھ کھجایا گیا ہے۔ برسات کے وہی دن تھے۔ پیپل کی نرم نرم کومل پتیوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ جیسی کہ رندھیر اس روز تمام رات سنتا رہا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل تھی۔ لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ اس نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں اسے سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا پتہ بھی چلا تھا۔ جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے چھیڑے ہوئے تاروں کی آواز سنی —— لیکن وہ پکار کہاں تھی۔ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بُو میں سونگھی تھی —— وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے کہیں زیادہ قابلِ فہم تھی —— وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہوگئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے۔ مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دور —— بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں اسے مٹیلے بادلوں میں ایک عجیب قسم کی دھندلی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جیسے اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی۔ ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی جس کا جسم دودھ اور گھی ملے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی۔ اس کے سوئے ہوئے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ جو اب تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو دم توڑتی اور حالتِ نزع کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس سی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جس طرح بدہضمی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے، اداس، بے رنگ، بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکیاں، بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی، سفید سفید دھبوں کی صورت میں........ اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بُو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکل رہی تھی وہ بُو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دور رس تھی۔ جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا۔ جو خود بخود ناک کے رستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیالے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی...... اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی۔ جس نے بی اے تک تعلیم

پائی تھی اور اپنے کالج کے ہینگ ڈن لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی۔ رندھیر کی نبض تیز نہ کر سکی — وہ خاکی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بُو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں جب کہ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے۔ اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔

منوں مٹی کے تلے پہنچتے ہی منٹو نے پھر سوچا کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا بھگوان —

بھگوان نے منٹو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ تم نے لکھا ہے"۔

منٹو نے کہا: "لکھا ہے تو کیا ہوا۔ اگر تم سے بیالیس برس آٹھ مہینے اور سات دن ادھار لئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میری کہانی کے اچھے ناقد بھی ہو سکتے ہو — ہٹاؤ اپنا یہ ہاتھ"۔

بھگوان کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے منٹو کے کندھے پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا: "جا تیرے سب گناہ معاف کئے" — اور پلٹ کر چلا گیا۔

چند لمحوں کے لئے منٹو بالکل خاموش رہا۔ وہ اس تعریف سے بالکل خوش نہ ہوا۔ وہ بڑا رنجیدہ اور ملول اور خفا خفا سا نظر آنے لگا۔

"سالا کیا سمجھتا ہے۔ مجھے ہراساں کرتا ہے۔ اس نے مجھے صرف بیالیس برس آٹھ مہینے اور سات دن ادھار دیئے تھے۔ میں نے تو سوگندھی کو صدیاں دی ہیں"۔

دیویندر ستیارتھی

منٹو زبان سے خواہ کچھ بھی کہتا رہا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کھیل سے اکتا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس ... پا جائے۔ فحش نگاری کے سلسلے میں کراچی میں اس پر جو آخری مقدمہ چلا۔ اس کی کارروائی چند ہی لمحوں میں ختم ہو گئی۔ منٹو نے اپنی مدافعت میں کوئی دھواں دھار تقریر کی اور نہ قانونی مشیروں سے ہنگامہ ہی برپا کرایا۔ یہاں تک کہ احتجاج میں ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ چپکے سے جرمانہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔ وہ مقدمہ بازی ہی سے نہیں ادب سے بھی بلکہ زندگی سے بھی اکتا گیا تھا۔ وہ گھریلو بندھنوں، سماج کے رکھ رکھاؤ اور عام دنیوی علائق سے بے گانہ سا ہو گیا تھا۔ گراوٹ کا یہ وہ درجہ ہے کہ کم زور انسان خودکشی کر لیا کرتے ہیں مگر منٹو کا رہا سہا دم خم آڑے آ گیا۔ اس نے خودکشی نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اپنے کو ایک ایسے راستے پر ڈال لیا جو انجام کار خودکشی ہی کا مترادف بنا۔



غلام عباس



ننگی آوازیں

بھولو اور گاما دو بھائی تھے۔ بے حد محنتی۔ بھولو قلعی گر تھا صبح دھونکنی سر پہ رکھ کر نکلتا اور دن بھر شہر کی گلیوں میں "بھانڈے قلعی کرالو" کی صدائیں لگاتا رہتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہہ بند کے ڈب میں تین چار روپے کا کریانہ ضرور ہوتا۔

گاما خوانچہ فروش تھا اس کو بھی دن بھر چھابڑی سر پہ اٹھائے گھومنا پڑتا تھا۔ تین چار روپے یہ بھی کما لیتا تھا۔ مگر اس کو شراب کی لت تھی۔ شام کو دینے کے بھٹیار خانے سے کھانا کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اُسے ضرور چاہیئے تھی۔ پینے کے بعد وہ خوب چہکتا۔ دینے کے بھٹیار خانے میں رونق لگ جاتی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے اور اسی کے سہارے جیتا ہے۔

بھولو نے گاما کو جو کہ اس سے دو سال بڑا تھا بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ شراب کی لت بہت بُری ہے شادی شدہ ہو۔ بیکار پیسہ برباد کرتے ہو۔ یہی جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر رکھو تو بھابی ٹھاٹھ سے رہا کرے۔ ننگی بچی اچھی لگتی ہے تمہیں اپنی گھر والی۔ گاما نے اس کان سنا۔ اس کان سے نکال دیا۔ بھولو جب تھک ہار گیا تو اس نے کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

دونوں مہاجر تھے۔ ایک بڑی بلڈنگ کے ساتھ سرونٹ کوارٹر تھے۔ ان پر جہاں اوروں نے قبضہ جما رکھا تھا، وہاں ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارٹر کو جو کہ دوسری منزل پر تھا اپنی رہائش کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

سردیاں آرام سے گزر گئیں۔ گرمیاں آئیں تو گاما کو بہت تکلیف ہوئی۔ بھولو تو اوپر کوٹھے پر کھاٹ بچھا کر سو جاتا تھا۔ گاما کیا کرتا۔ بیوی تھی۔ اور اوپر پردے کا کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ایک گاما ہی کو یہ تکلیف نہیں تھی۔ کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔

کلّن کو ایک بات سوجھی۔ اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے ارد گرد ٹاٹ تان دیا۔ اس طرح پردے کا انتظام ہو گیا۔ کلّن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی اور چند دنوں ہی میں بانس وغیرہ گاڑ کر، ٹاٹ اور کمبل جوڑ کر پردے کا انتظام کر دیا۔ یوں ہوا تو رک جاتی تھی مگر

نیچے کوارٹر کے دوزخ سے ہر حالت میں یہ جگہ بہتر تھی۔

اُوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہوگیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہ جنجال کبھی نہیں پالے گا جب گاما کبھی اس کے بیاہ کی بات چھیڑتا تو وہ کہا کرتا۔ "نا بھائی" "میں اپنے نروئے پنڈے پر جونکیں نہیں لگوانا چاہتا۔" لیکن جب گرمیاں آئیں اور اس نے اُوپر کھاٹ بچھا کر سونا شروع کیا تو دس پندرہ دن ہی میں اس کے خیالات بدل گئے ایک شام کو دینے کے بھٹیار خانے میں اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ "میری شادی کر دو، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

گاما نے جب یہ سُنا تو اس نے کہا۔ "یہ کیا مذاق سوجھا ہے تمہیں۔"

بھولو کو بہت سنجیدہ ہو گیا۔ "تمہیں نہیں معلوم —— پندرہ راتیں ہو گئیں ہیں مجھے جاگتے ہوئے۔"

"گاما نے پوچھا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں یار —— دائیں بائیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے...... عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ نیند کیا آئے گی۔ خاک!"

گاما زور سے اپنی گھنی مونچھوں میں ہنسا۔ بھولو شرما گیا۔ "وہ جو کلن ہے۔ اس نے تو حد ہی کر دی ہے —— سالا رات بھر بکواس کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی —— بچے پڑے رو رہے ہیں مگر وہ........"

گاما حسبِ معمول نشے میں تھا۔ بھولو گیا تو اس نے دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چہک چہک کر بتایا کہ اس کے بھائی کو آج کل نیند نہیں آتی، اس کا باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تو سُننے والوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کے بل پڑ گئے۔ جب یہ لوگ بھولو سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کوئی اس سے پوچھتا۔ "ہاں بھئی، کلن اپنی بیوی سے کیا باتیں کرتا ہے۔" کوئی کہتا "میاں مفت میں مزے لیتے ہو —— ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو —— سو فیصدی گاتی بولتی۔"

بعضوں نے گندے گندے مذاق کیے۔ بھولو چڑ گیا۔ گاما صوفی حالت میں تھا تو اس نے اس سے کہا۔ "تم نے تو یار میرا مذاق بنا دیا ہے —— دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے جھوٹ نہیں۔ میں انسان ہوں۔ خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی آج بیس دن ہو گئے ہیں جاگتے ہوئے —— تم میری شادی کا بندوبست کر دو، ورنہ قسم پنج تن پاک کی میرا خانہ خراب ہو جائے گا —— بھابی کے پاس میرا پانسو روپیہ جمع ہے —— جلدی کر دو بندوبست۔"

گاما نے مونچھ مروڑ کر پہلے سوچا پھر کہا۔ "اچھا ہو جائے گا بندوبست۔ تمہاری بھابی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ گچھ کرے۔"

ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر بات پکی ہو گئی۔ صمد قلعی گر کی لڑکی عائشہ گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔ خوبصورت تھی۔ گھر کا کام کاج جانتی تھی۔ ویسے صمد بھی شریف تھا۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ بھولو محنتی تھا۔ تندرست

تھا جون کے وسط میں شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ صمد نے بہت کہا۔ کہ وہ لڑکی اتنی گرمیوں میں نہیں بیاہے گا۔ مگر بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔

شادی سے چار دن پہلے بھولو نے اپنی دلہن کے لیے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندوبست کیا۔ بانس بڑی مضبوطی سے فرش میں گاڑے۔ ٹاٹ خوب کس کر لگایا۔ چارپائیوں پر نئے کھیس بچھائے۔ نئی صراحی منڈیر پر رکھی۔ شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔ سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کئے۔

رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر کر سویا تو اس کو عجیب سا لگا۔ وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سونا شروع کر دیا۔ پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو وہ پسینے میں تر بتر ہوگیا۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں گونجنے لگیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔

کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا؟ —— کیا آس پاس کے لوگ یہ آوازیں سنیں گے۔ کیا وہ بھی اس کے مانند راتیں جاگ کر کاٹیں گے۔ کسی نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہوگیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستاتی رہتی کہ ٹاٹ کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے، پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات کی خاموشی میں ہلکی سی سرگوشی بھی دوسرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے —— لوگ کیسے یہ ننگی زندگی بسر کرتے ہیں —— ایک کوٹھا ہے۔ اس چارپائی پر بیوی لیٹی ہے۔ اس چارپائی پر خاوند پڑا ہے۔ سینکڑوں کان آس پاس کھلے ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ہلکی سی آہٹ پوری تصویر بن کر سامنے آجاتی ہے —— یہ ٹاٹ کا پردہ کیا ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری چیزیں بے نقاب کر دیتی ہے وہ سامنے کلن اپنی بیوی کی چھاتیاں دبا رہا ہے۔ وہ کونے میں اس کا بھائی گاما لیٹا ہے۔ تہبند کھل کر ایک طرف پڑا ہے۔ ادھر عیدو حلوائی کی کنواری بیٹی شاماں کا پیٹ چھدرے ٹاٹ سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے۔

شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے مگر کہاں جاتا۔ اب تو وہ جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو صمد ضرور خودکشی کر لیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا گزرتی۔ جو طوفان مچتا وہ الگ۔

" اچھا جو ہوتا ہے ہونے دو —— میرے ساتھی اور بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی مجھے بھی "

—— بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور اپنی نئی نویلی دلہن کی ڈولی گھر لے آیا۔

کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہوگئی۔ لوگوں نے بھولو اور گاما کو خوب مبارک بادیں دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست تھے، انہوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لیے کئی کامیاب گر بتلائے۔ بھولو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی بھابی نے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردوں کے نیچے بستر کا بندوبست کر دیا۔ گاما نے چار موتیے کے بڑے بڑے ہار تکیے کے پاس رکھ دیئے۔ ایک دوست اس کے لیے جلیبیوں والا دودھ لے آیا۔

دیر تک وہ نیچے کوارٹر میں اپنی دلہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بے چاری شرم کی ماری سر نیوڑھائے،

گھونگٹ کاڑھے سمٹی ہوئی تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کا نیا کرتہ اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پنکھا چل رہا تھا مگر ہوا جیسے بالکل غائب ہی ہو گئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا نیچے کوارٹر ہی میں رات کاٹے گا مگر جب گرمی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ اٹھا اور دلہن سے چلنے کو کہا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسکین تھی کہ سب سو رہے ہوں گے۔ کوئی اس کو نہیں دیکھے گا۔ چپ چاپ دبے قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے اپنی دولہن سمیت داخل ہو جائے گا اور صبح منہ اندھیرے نیچے اتر جائے گا۔

جب وہ کوٹھے پر پہونچا تو بالکل خاموشی تھی۔ دولہن نے شرماتے ہوئے قدم اٹھائے تو پازیب کے نقرئی گھنگھرو بجنے لگے۔ ایک دم بھولو نے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی چونک کر جاگ پڑی ہے۔ چارپائیوں پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے کھانسنے، کھنکارنے کی آوازیں اِدھر اُدھر ابھریں۔ دبی دبی سرگوشیاں اس تپی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ بھولو نے گھبرا کر اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ٹاٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آوازیں اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرائیں۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ بیوی سے بات کی تو پاس ہی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ دور کونے میں جہاں کلن کی جگہ تھی وہاں چارپائی کی چرچوں چرچوں ہونے لگی۔ یہ دھیمی پڑی تو گاما کی لوہے کی چارپائی بولنے لگی —— عیدو حلوائی کی کنواری لڑکی شاداں نے تین بار اٹھ کر پانی پیا۔ گھڑے کے ساتھ اس کا گلاس ٹکرایا تو ایک چھناکا سا پیدا ہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکے کی چارپائی سے بار بار ماچس جلانے کی آواز آتی تھی۔

بھولو اپنی دولہن سے کوئی بات نہ کر سکا اسے ڈر تھا کہ آس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات نگل جائیں گے اور ساری چارپائیاں چرچوں چرچوں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا۔ کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گٹھڑی سی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی۔ کچھ دیر جاگتی رہی، پھر سو گئی۔

بھولو نے چاہا کہ وہ بھی سو جائے مگر اس کو نیند نہ آئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں —— آوازیں جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔

اس کے دل میں بڑے ولولے تھے۔ بڑا جوش تھا۔ جب اس نے شادی کا ارادہ کیا تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ ناآشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بڑی راحت بخش گرمی، مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آوازیں —— وہ تصویریں کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم برہم کر دیتیں۔ وہ خود کو ننگا محسوس کرتا۔ الف ننگا، جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

صبح چار بجے کے قریب وہ اٹھا، باہر نکل کر اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا، کچھ سوچا۔ وہ جھجک جو اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی اس کو کسی قدر دور کیا۔ اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کافی تیز تھی —— بھولو کی نگاہیں کرنے

کی طرف مڑیں کلن کا گھسا ہوا ٹاٹ ہل رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بالکل ننگ دھڑنگ لیٹا تھا۔ بھولو کو بڑی گھن آئی۔ ساتھ ہی غصہ بھی آیا کہ ہوا ایسے کوٹھوں پر کیوں چلتی ہے چلتی ہے تو ٹاٹوں کو کیوں چھیڑتی ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ کوٹھے پر جتنے ٹاٹ ہیں، سب نوچ ڈالے اور ننگا ہو کے ناچنے لگے۔

بھولو نیچے اتر گیا۔ جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے۔ سب نے اس سے پہلی رات کی سرگزشت پوچھی۔ پیرے درزی نے اس کو دُور ہی سے آواز دی۔ "کیوں استاد بھولو، کیسے رہے، کہیں ہمارے نام پر بٹہ تو نہیں لگا دیا تم نے۔"

چھاگے ٹین ساز نے اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا "دیکھو اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بتا دو۔ ایک بڑا اچھا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔"

بالے نے اس کے کاندھے پر زور سے دھپا مارا۔ "کیوں پہلوان کیسا رہا دنگل؟"

بھولو خاموش رہا۔

صبح اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ پانچ چھ روز کے بعد واپس آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوٹھے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند راتیں خاموشی رہی لیکن جب وہ اوپر سوتے تو وہی کھسر پھسر، وہی چرچوں، وہی کھانسنا کھنکارنا —— وہی گھڑے کے ساتھ گلاس کے ٹکرانے کے چھناکے —— کروٹوں پر کروٹیں۔ دبی دبی ہنسی —— بھولو ساری رات اپنی چارپائی پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دولہن کو دیکھ لیتا اور دل میں کڑھتا۔ "مجھے کیا ہو گیا ہے —— یہ مجھے کیا ہو گیا ہے —— یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

سات راتوں تک یہی ہوتا رہا، آخر تنگ آ کر بھولو نے اپنی دولہن کو میکے بھیج دیا۔ بیس پچیس روز گزر گئے تو گاما نے بھولو سے کہا "یار تم بڑے عجیب و غریب آدمی ہو نئی نئی شادی اور بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے تم اکیلے سوتے کیسے ہو۔"

بھولو نے صرف اتنا کہا "ٹھیک ہے؟"

گاما نے پوچھا "ٹھیک کیا ہے —— جو بات ہے بتاؤ کیا تمہیں پسند نہیں آئی عائشہ؟"

"یہ بات نہیں ہے۔"

یہ بات نہیں تو اور کیا بات ہے؟"

بھولو بات گول کر گیا مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھر بات چھیڑی۔ بھولو اٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اس کو اپنی بھابی کی آواز سنائی دی وہ گاما سے کہہ رہی تھی "تم جو کہتے ہو ناکہ بھولو کو عائشہ پسند نہیں آئی، یہ غلط ہے۔"

گاما کی آواز آئی "تو اور کیا بات ہے —— بھولو کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"دلچسپی کیا ہو"

"کیوں ؟"

گاما کی بیوی کا جواب بھولو نہ سن سکا اس کے باوجود اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاون میں ڈال کر کوٹ دی ہے۔ ایک دم گاما اونچی آواز میں بولا۔ "نہیں نہیں ——— یہ تم سے کس نے کہا"

گاما کی بیوی بولی "عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے ذکر کیا ——— بات اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچ گئی"

بڑی صدمہ زدہ آواز میں گاما نے کہا "یہ تو بہت برا ہوا!"

بھولو کے دل میں چھری سی پیوست ہو گئی۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اُٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ لگے تھے اکھیڑنے شروع کر دیئے۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا۔ بات بڑھ گئی۔ کلّن نے بانس اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارا۔ بھولو چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔

اب وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

منٹو جس طرح پیٹنا جانتا تھا لیکن پٹنا نہیں۔ پدانا جانتا تھا لیکن پدنا نہیں اسی طرح مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اس میں مفقود تھی۔ وہ بہت ذکی الحس تھا (اپنے مضامین میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے) لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے ہیں دوسروں کو بھی بات چبھ سکتی ہے اسے وہ اونچے درجے کا افسانہ نگار اور ماہرِ نفسیات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا۔

اوپندر ناتھ اشک

منٹو اور جنس یوں لازم و ملزوم ہوئے کہ ایک کے حوالے سے دوسرا گالی بن کر رہ گیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ منٹو کے بعض شاہکار افسانے جیسے "بابو گوپی ناتھ" ——— "موذیل" ——— "نیا قانون" ——— "خوشیا" ——— "کالی شلوار" ——— "ہتک" ——— "یزید" ——— اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" وغیرہ میں جنس نہیں۔ دراصل مقدمات کی سنسنی خیزی نے اس کے تمام فن کو غلط رنگ میں پیش کیا جس کی وجہ سے اس کے افسانوں کی کتاب چھوتے ہی کنواری باجیوں کے گال سرخ سرخ ہو جاتے۔

سلیم اختر





کھول دو

امرتسر سے سپیشل ٹرین دوپہر دو بجے کو چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔ راستے میں کئی مارے گئے۔ متعدد زخمی ہوئے اور کچھ اِدھر اُدھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے ——— کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک متلاطم سمندر دیکھا تو اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہو گئیں۔ وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا۔ لیکن بوڑھے سراج دین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے رگ و ریشے میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اُوپر تلے اس کے دماغ پر کئی تصویریں دوڑ گئیں لُوٹ، آگ ——— بھاگم بھاگ ——— اسٹیشن ——— گولیاں ------ رات اور سکینہ ------- سراجدین ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح اس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ "سکینہ سکینہ" پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا۔ مگر اسے اُس کی جوان، اکلوتی بیٹی کا کوئی پتہ نہ ملا۔ چاروں طرف ایک دھاندلی سی مچی تھی۔ کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ماں، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔ سراج الدین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی لیکن سوچتے سوچتے اس کا دماغ سکینہ کی ماں کی لاش پر جم جاتا۔ جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے وہ اور کچھ نہ سوچ سکتا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اُس نے سراجدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔ لیکن سکینہ کہاں تھی۔ جس کے متعلق اُس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا: "مجھے چھوڑ دو اور سکینہ کو لے کر جلدی یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کے لیے اس نے رُکنا چاہا تھا مگر سکینہ نے چلا کر کہا تھا: "ابا جی ——— چھوڑیئے" لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا ------- یہ

سوچتے سوچتے اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑا نکالا ——
سکینہ کا وہی دوپٹہ تھا ...... لیکن سکینہ کہاں تھی؟

سراجدین نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بہت زور دیا مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن تک لے آیا تھا؟ —— کیا وہ اس کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار تھی؟ راستہ میں جب گاڑی روکی گئی تھی اور بلوائی اندر گھس آئے تھے تو کیا وہ بے ہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گئے؟

سراج دین کے دماغ میں سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کو ہمدردی کی ضرورت تھی لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ سراج دین نے رونا چاہا مگر آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

چھ روز کے بعد جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو سراج الدین اُن لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ آٹھ نوجوان تھے۔ جن کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔ سراج دین نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا۔ "گورا رنگ ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے ...... مجھ پر نہیں اپنی ماں پر تھی ...... عمر سترہ برس کے قریب ہے ...... آنکھیں بڑی بڑی ...... بال سیاہ، دہنے گال پر موٹا سا تل ...... میری اکلوتی لڑکی ہے۔ ڈھونڈ لاؤ۔ تمہارا خدا بھلا کرے گا۔"

رضاکار نوجوانوں نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراجدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوئی تو چند ہی دنوں میں اس کے پاس ہوگی۔

آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی۔ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر وہ امرتسر گئے۔ کئی عورتوں کئی مردوں اور کئی بچوں کو نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا۔ دس روز گزر گئے مگر انھیں سکینہ نہ ملی۔

ایک روز وہ اسی خدمت کے لیے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھ ہرٹہ کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی۔ لاری کی آواز سن کر وہ بدکی اور بھاگنا شروع کر دیا۔ رضاکاروں نے موٹر روکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے۔ ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ دیکھا تو بہت خوبصورت تھی۔ دہنے گال پر موٹا تل تھا۔ ایک لڑکے نے اس سے کہا، "گھبراؤ نہیں —— کیا تمہارا نام سکینہ ہے؟"

لڑکی کا رنگ اور بھی زرد ہو گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب تمام لڑکوں نے اُسے دم دلاسا دیا تو اس کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج دین کی بیٹی سکینہ ہے۔

آٹھ رضاکاروں نے ہر طرح سکینہ کی دل جوئی کی۔ اُسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کُرتا اتار کر اُسے دے دیا۔ کیوں کہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت اُلجھن محسوس کر رہی تھی اور بار بار بانہوں سے اپنے سینے کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

کئی دن گزر گئے —— سراج دین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔ وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر

کاٹتا رہتا۔ لیکن کہیں سے بھی اس کی بیٹی کا پتہ نہ چلا۔ رات کو وہ بہت دیر تک ان رضاکار نوجوانوں کی کامیابی کیلیے دعائیں مانگتا رہتا۔ جنہوں نے اس کو یقین دلایا تھا کہ اگر سکینہ زندہ ہوئی تو چند دنوں ہی میں وہ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔

ایک روز سراج دین نے کیمپ میں ان نوجوان رضاکاروں کو دیکھا۔ لاری میں بیٹھے تھے۔ سراج دین بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا۔ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا۔ "بیٹا میری سکینہ کا پتہ چلا؟"

سب نے یک زبان ہو کر کہا: "چل جائے گا، چل جائے گا" اور لاری چلا دی۔

سراج دین نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعا مانگی اور اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

شام کے قریب کیمپ میں جہاں سراج الدین بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑ سی ہوئی، چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بے ہوش پڑی تھی۔ لوگ اُسے اٹھا کر لائے ہیں۔ سراجدین ان کے پیچھے ہو لیا۔ لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال والوں کے سپرد کیا اور چلے گئے۔

کچھ دیر وہ ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔ سراجدین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔ کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔ سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا "سکینہ"

ڈاکٹر نے جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج دین سے پوچھا"

"کیا ہے؟"

سراج دین کے حلق سے صرف اس قدر نکل سکا "جی میں ----- جی میں ----- اس کا باپ ہوں!"

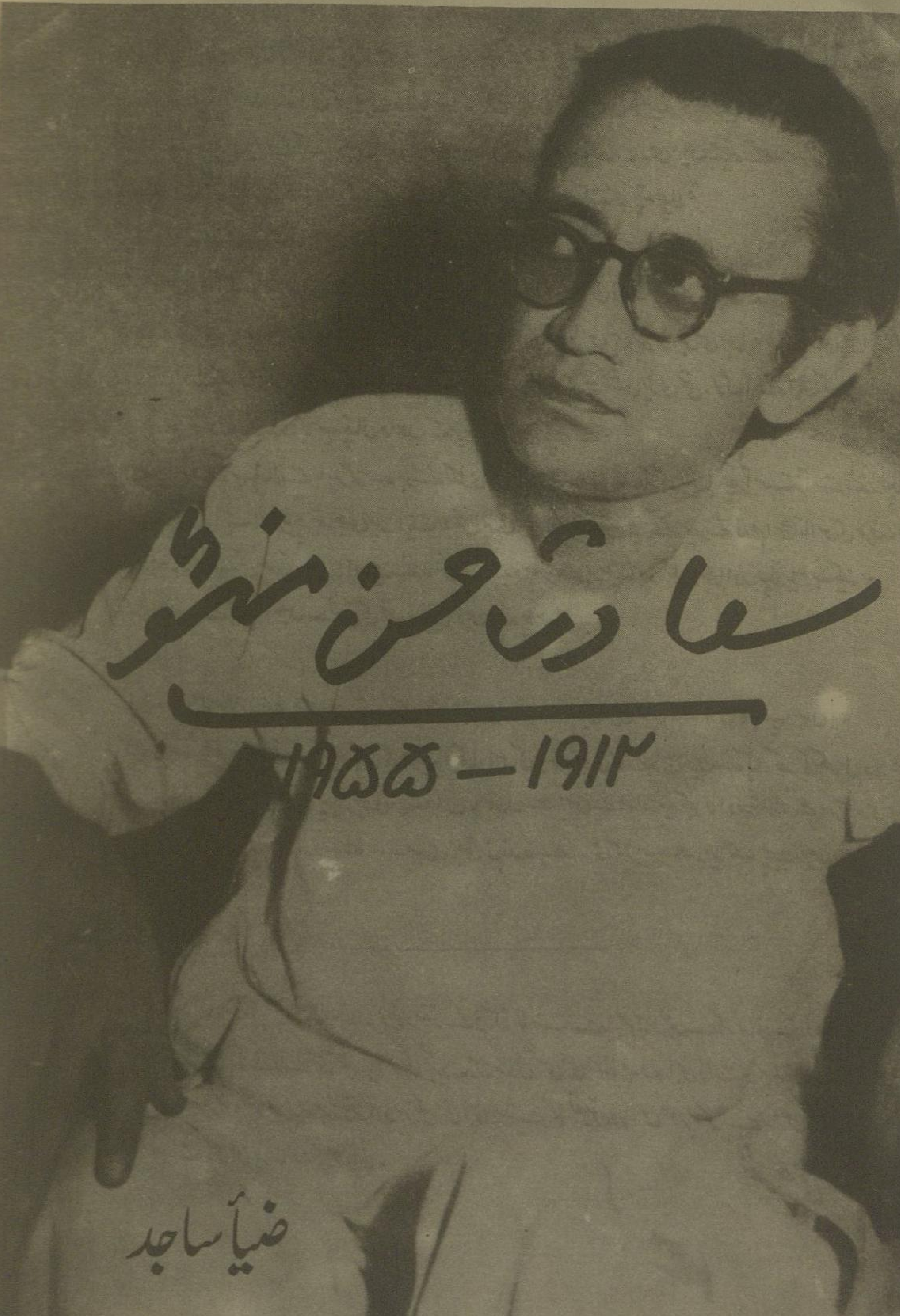
ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی نبض ٹٹولی اور سراج دین سے کہا، کھڑکی کھول دو"

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج دین خوشی سے چلایا۔ "زندہ ہے ـــ میری بیٹی زندہ ہے۔" ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔

بحیثیت افسانہ نگار منٹو کے وژن کا سب سے اہم پہلو یہی ہے کہ کہانی کے ڈھانچے کی تعمیر میں کام آنے والے کسی مظہر یا اس کی ہیئت میں شامل کسی بھی لفظ پر وہ اپنی ذات کو مسلط نہیں کرتا۔ ہر شے، ہر اسم، تصویر کے ہر نقطے اور ہر لکیر کی اپنی حیثیت کا تعین وہ اس طور پر کرتا ہے کہ اس کی اپنی شخصیت کبھی ان پر غالب نہیں آتی۔

شمیم حنفی




سعادت حسن منٹو
۱۹۱۲ - ۱۹۵۵
ضیا ساجد



زحمتِ مہرِ درخشاں

بمبئی چھوڑ کر کراچی سے ہوتا ہوا غالباً سات یا آٹھ جنوری ۱۹۴۸ء کو یہاں لاہور پہنچا۔ تین مہینے میرے دماغ کی عجیب و غریب حالت رہی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ بمبئی میں ہوں۔ کراچی میں اپنے دوست حسن عباس کے گھر بیٹھا ہوں یا لاہور میں ہوں جہاں کئی ریستورانوں میں قائد اعظم فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں رقص و سرود کی محفلیں اکثر جمتی تھیں۔

تین مہینے تک میرا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پردے پر ایک ساتھ کئی فلم چل رہے ہیں، آپس میں گڈمڈ —— کبھی بمبئی کے بازار اور اس کی گلیاں، کبھی کراچی کی چھوٹی چھوٹی تیز رفتار ٹریمیں اور گدھا گاڑیاں اور کبھی لاہور کے پرشور ریستوران —— سمجھ میں نہیں آتا تھا میں کہاں ہوں —— سارا دن کرسی پر بیٹھا خیالات میں کھویا رہتا، آخر ایک دن چونکا کیونکہ جو روپیہ بمبئی سے اپنے ساتھ لایا تھا کچھ تو گھر میں اور کچھ گھر سے دور کلفٹن بار میں جذب ہو چکا تھا۔ اب مجھے قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ میں لاہور میں ہوں، جہاں کبھی کبھی میں اپنے مقدمات کے سلسلے میں آیا کرتا تھا اور کرنال شاپ سے بہت سے خوبصورت چپل خرید کر اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔

میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کام کیا جائے۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ تقسیم کے بعد فلمی کاروبار قریب قریب مفلوج ہو چکا ہے۔ جن فلم کمپنیوں کے بورڈ نظر آتے ہیں وہ ان بورڈوں ہی تک محدود ہیں —— بہت تشویش ہوئی —— الاٹمنٹوں کا بازار گرم تھا۔ مہاجر اور غیر مہاجر دھڑا دھڑ اپنے اثر و رسوخ سے کارخانے اور دکانیں الاٹ کرا رہے تھے۔ مجھے مشورہ دیا گیا مگر میں نے اس لوٹ کھسوٹ میں حصہ نہ لیا۔

انہی دنوں معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض اور چراغ حسن حسرت مل کر ایک روزنامہ جدید خطوط پر شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں ان حضرات سے ملا، اخبار کا نام "امروز" تھا جو آج ہر ایک کی زبان پر ہے۔ پہلی ملاقات پر اخبار کی "ڈمی" تیار کی جا رہی تھی۔ دوسری ملاقات ہوئی تو "امروز" کے غالباً چار پرچے نکل چکے تھے۔ اخبار کی گٹ اپ دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ طبیعت میں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ لکھوں لیکن جب لکھنے بیٹھا تو دماغ کو منتشر پایا، کوشش کے باوجود ہندوستان کو پاکستان سے اور پاکستان کو ہندوستان سے علیحدہ نہ کر سکا۔ بار بار دماغ میں الجھن پیدا کرنے والا سوال گونجتا، کیا پاکستان کا ادب علیحدہ ہوگا —— اگر ہوگا تو کیسے ہوگا۔ وہ سب کچھ جو سالم ہندوستان میں لکھا گیا تھا اس کا مالک کون ہے —— کیا اس کو

بھی تقسیم کیا جائے گا۔ کیا ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بنیادی مسائل ایک جیسے نہیں ــــــ کیا ادھر اردو بالکل ناپید ہو جائے گی۔ یہاں پاکستان میں اردو کیا شکل اختیار کرے گی ــــــ کیا ہماری اسٹیٹ مذہبی اسٹیٹ ہے ــــــ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے مگر کیا ہمیں حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہو گی ــــــ آزاد ہو کر کیا یہاں کے حالات فرنگی عہد حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے۔

گرد و پیش جدھر بھی نظر ڈالتا تھا انتشار ہی انتشار دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگ بے حد خوش تھے کیونکہ ان کے پاس ایک دم دولت آ گئی تھی۔ لیکن اس خوشی میں بھی انتشار تھا جیسے وہ بکھر کر ایک دن ہوا ہو جانے والی ہے ــــــ اکثر مغموم و متفکر تھے کیونکہ وہ لٹ پٹ کر آئے تھے ــــــ مہاجروں کے کیمپ دیکھے۔ یہاں خود انتشار کے رونگٹے کھڑے دیکھے کسی نے کہا اب تو حالات بہت بہتر ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کی حالت دیدنی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر یہ حالات کی بہتری ہے تو ابتری معلوم نہیں کیسی ہو گی ــــــ غرض کہ عجیب افراط و تفریط کا عالم تھا۔ ایک کا قہقہہ دوسرے کی آہ سے دست و گریباں تھا۔ ایک کی زندگی دوسرے کے عالمِ نزع سے مصروفِ پیکار تھی۔ دو دھارے بہہ رہے تھے۔ ایک زندگی کا دھارا۔ ایک موت کا، ان کے درمیان خشکی تھی جس پر گرسنگی و تشنگی۔ شکم سیری و بلانوشی ساتھ ساتھ چلتی تھیں ــــــ!

فضا پر مردنی طاری تھی جس طرح گرمیوں کے آغاز میں آسمان پر بے مقصد اڑتی ہوئی چیلوں کی چیخیں اداس ہوتی ہیں۔ اسی طرح "پاکستان زندہ باد" اور "قائدِ اعظم زندہ باد" کے نعرے بھی کانوں کو اداس اداس لگتے تھے۔

ریڈیو کی لہریں اقبال مرحوم کا ایک آہنگ کلام شب و روز اپنے کاندھوں پر اٹھا کر تھک اور اکتا گئی تھیں فیچر پروگرام کچھ اس قسم کے ہوتے تھے کہ مرغیاں کس طرح پالی جاتی ہیں۔ جوتے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ فنِ دباغت کیا ہے ریفیوجی کیمپوں میں کتنے آدمی آئے اور کتنے گئے۔

قریب قریب تمام درخت ننگے بُچے تھے ــــــ سردیوں سے بچنے کے لئے غریب مہاجرین نے ان کی چھال اتار کر اپنی کھال گرم کی تھی۔ ٹہنیاں کاٹ کر پیٹ کی آگ ٹھنڈی کی تھی۔ ان ننگے بچے درختوں سے فضا اور بھی دل شکن حد تک اداس ہو گئی تھی۔

بلڈنگوں کی طرف دیکھتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا سوگ میں ہیں ان کے مکین بھی ماتم زدہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے، کھیلتے تھے۔ کوئی کام مل جاتا تھا تو وہ بھی کرتے تھے مگر گویا یہ سب کچھ خلا میں ہو رہا تھا۔ ایک ایسے خلا میں جو لبالب ہونے پر بھی خالی تھا۔

میں اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی سے ملا۔ ساحر لدھیانوی سے ملا۔ ان کے علاوہ اور لوگوں سے بھی ملا۔ سب میری طرح ذہنی طور پر مفلوج تھے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ جو اتنا زبردست بھونچال آیا ہے۔ شاید اس کے کچھ جھٹکے آتش فشاں پہاڑ میں اٹکے ہوئے ہیں۔ باہر نکل آئیں تو فضا کی نوک پلک درست ہو گی۔ پھر صحیح طور پر معلوم ہو سکے گا کہ صورتِ حالات کیا ہے۔

سوچ سوچ کر میں عاجز آ گیا تھا۔ چنانچہ آوارہ گردی شروع کر دی۔ بے مطلب سارا دن گھومتا رہتا۔ خود خاموش

رہتا۔ لیکن دوسروں کی سنتا رہتا — بے ہنگم باتیں۔ بے جوڑ دلیلیں۔ خام سیاسی مباحثے — اس آوارہ گردی سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے دماغ میں جو گرد و غبار اڑ رہا تھا آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور میں نے سوچا کہ ہلکے پھلکے مضامین لکھنا چاہئیں چنانچہ میں نے "ناک کی قسمیں" "دیواروں پر لکھنا" جیسے لکا ہیہ مضامین "امروز" کے لئے لکھے جو پسند کیے گئے — آہستہ آہستہ مزاح خود بخود طنز یہ رنگ اختیار کر گیا۔ یہ تبدیلی مجھے بالکل محسوس نہ ہوئی — میں لکھتا گیا اور میرے قلم سے سوال پیدا ہوتا ہے اور سویرے جو کل آنکھ میری کھلی جیسے تیز و تند مضمون نکل گئے — جب مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ میرے قلم نے گرد و پیش چھائی ہوئی دھند میں ٹٹول ٹٹول کر ایک راستہ تلاش کر لیا ہے تو مجھے خوشی ہوئی دماغ کا بوجھ بھی کسی قدر ہلکا ہو گیا میں نے زور و شور سے لکھنا شروع کر دیا — مضامین کا یہ مجموعہ بعد میں "تلخ ترش اور شیریں" کے عنوان سے شائع ہوا۔

طبیعت افسانے کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی اس صنفِ ادب کو میں بہت سنگین سمجھتا ہوں۔ اس لئے افسانہ لکھنے سے گریز کرتا تھا۔ لیکن انہی دنوں میرے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی جو غالباً اوٹ پٹانگ چیزیں لکھ لکھ کر تنگ آ گئے تھے۔ ریڈیو پاکستان پشاور سے علیحدہ ہو کر لاہور چلے آئے اور "ادارہ فروغ اردو" کے اشتراک سے ایک ماہنامہ پرچہ نقوش جاری کیا۔ ان کے اصرار کے باوجود میں "نقوش" کے پہلے چند پرچوں کے لئے کوئی کہانی نہ لکھ سکا۔ جب وہ ناراض ہو گئے تو میں نے پاکستان میں اپنا پہلا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لکھا جو میرے اس مجموعے کا اب عنوان ہو گیا ہے۔

قاسمی صاحب نے یہ افسانہ میرے سامنے پڑھا۔ وہ خاموش پڑھتے رہے۔ مگر مجھے اس کا ردِ عمل معلوم نہ ہو سکا۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ "منٹو صاحب معاف کیجئے افسانہ بہت اچھا ہے لیکن نقوش کے لئے بہت گرم ہے"۔

قاسمی صاحب سے کبھی بحث نہیں ہوئی تھی اس لئے میں نے خاموشی سے افسانہ واپس لے لیا اور ان سے کہا "بہت بہتر تو میں آپ کے لئے دوسرا افسانہ لکھ دوں گا۔ آپ کل شام تشریف لے آئیے گا"۔

قاسمی صاحب جب دوسرے روز شام کو تشریف لائے تو میں اپنے دوسرے افسانے کھول دو کی اختتامی سطور لکھ رہا تھا۔ میں نے قاسمی صاحب سے کہا۔ ایک منٹ — آپ بیٹھئے میں افسانہ مکمل کر کے آپ کو دیتا ہوں — اس افسانے کی اختتامی سطور چونکہ بہت ہی اہم تھیں اس لئے قاسمی صاحب کو کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب افسانہ مکمل ہو گیا تو میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔ "پڑھ لیجئے خدا کرے آپ کو پسند آ جائے"۔

قاسمی صاحب نے افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ اختتامی سطور پر پہنچے تو میں نے نوٹ کیا جیسے کسی نے ان کو جھنجھوڑ دیا ہے — افسانہ ختم کرنے کے بعد وہ کچھ نہ بولے میں نے ان سے پوچھا "کیسا ہے"؟

قاسمی صاحب پر افسانے کا اثر ابھی تک غالب تھا۔ مختصراً کہا۔ اچھا ہے میں لے جاتا ہوں۔

اور آپ رخصت لے کر چلے گئے۔

"کھول دو" قاسمی صاحب کے پرچے نقوش نمبر ۳ میں شائع ہوا، قارئین نے پسند کیا۔ ہر ایک کا ردِ عمل یکساں تھا۔

آخری سطور سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھیں لیکن ایک دم ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ حکومت کو یہ افسانہ امن عامہ کے مفاد کے منافی نظر آیا۔ چنانچہ حکم ہوا کہ "نقوش" کی اشاعت چھ مہینے تک بند ہے —— اخباروں میں حکومت کے اس اقدام کے خلاف احتجاجاً بہت کچھ لکھا گیا مگر امتناعی حکم اپنی جگہ قائم رہا۔

میں نے ایک روز قاسمی صاحب سے مسکرا کر کہا "اگر آپ ٹھنڈا گوشت شائع کرتے تو شاید یہ بجلی آپ کے آشیانے پر نہ گرتی"۔

کافی دن گذرنے پر "ادبِ لطیف" کے نائب مدیر میرے پاس آئے اور "ٹھنڈا گوشت" لے گئے —— افسانے کی کتابت ہو گئی۔ کاپیاں جم گئیں۔ پروف نکل آئے۔ غلطیاں درست کر کے جب واپس پریس گئیں تو کسی کی نظر "ٹھنڈا گوشت" والی کاپی پر پڑی۔ اس نے افسانہ پڑھا تو چھاپنے سے انکار —— قہرِ درویش برجان درویش اس افسانے کے بغیر ہی پرچہ شائع کیا گیا۔

چودھری برکت علی صاحب کوئٹے میں تھے واپس آئے تو انہوں نے "ادبِ لطیف" کے دوسرے شمارے میں "ٹھنڈا گوشت" چھپوانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے —— افسانے کا مسودہ مجھے واپس دے دیا گیا۔

اس دوران میں کراچی سے محترم ممتاز شیریں کے متعدد خط آ چکے تھے کہ میں ان کے "نیا دور" کے لئے کوئی افسانہ بھیجوں۔ میں نے اٹھا کر "ٹھنڈا گوشت" ان کو روانہ کر دیا۔ کافی دیر کے بعد جواب آیا کہ ہم دیر تک سوچتے رہے کہ اسے شائع کیا جائے یا نہیں۔ افسانہ بہت اچھا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے لیکن ڈر ہے کہ حکومت کے احتساب کے شکار نہ ہو جائیں —— "ٹھنڈا گوشت" یہاں سے بھی ٹھنڈا ہو کر واپس میرے پاس پہنچ گیا —— میں نے سوچا اب اسے کسی رسالے میں نہیں چھپوانا چاہیئے۔

چھ مہینے کی مدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ حکومت نے "نقوش" پر سے "نہ چھاپو" والی قید ہٹا دی چنانچہ میں نے نیا ادارہ کے لئے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا عنوان میں نے "نمرود کی خدائی" رکھا، اس میں "کھول دو" کے ساتھ میں نے "ٹھنڈا گوشت" بھی شامل کر دیا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عزیزی عارف عبدالمتین رسالہ "جاوید" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو آپ میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ اشاعت کے لئے دوں۔ کافی دیر میں ٹال مٹول کی مگر آخر کار ان کے پیہم اصرار پر میں نے "نیا ادارہ" کے مالک چوہدری نذیر احمد صاحب کو ایک چٹ لکھ دی کہ یہ "جاوید" والے اپنا پرچہ ضبط کرانا چاہتے ہیں —— براہ کرم ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ دے دیجیے۔ عارف صاحب افسانے کا مسودہ لے آئے اور اسے "جاوید" کے خاص نمبر مطبوعہ مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع کر دیا۔

پرچہ چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا۔ اندرونی اور بیرونی ایجنسیوں میں بھی تقسیم ہو گیا۔ یہاں تک تو خیریت رہی۔ ایک مہینہ گزر گیا میں مطمئن ہو گیا کہ اب "ٹھنڈا گوشت" پر کوئی آفت نہ آئے گی مگر پریس برانچ کی باگیں ابھی تک چوہدری محمد حسین صاحب (اب مرحوم) کے ہاتھ میں تھیں۔ گو ضعیفی کے باعث ان کے ہاتھ بہت کمزور ہو چکے تھے مگر انہوں نے زور کا ایک جھٹکا دیا اور پریس کی مشینری حرکت میں آ گئی۔

میں نے ایک روز اڑتی اڑتی خبر سنی کہ چھاپہ پڑا ہے اور پولیس "جاوید" کے خاص نمبر کے پرچے اٹھا کرلے گئی ہے۔ میں نے جان پہچان کے چند لوگوں سے پوچھا کسی نے اس خبر کی تصدیق کی۔ کسی نے کہا "اجی ہٹایئے۔ یہ جاوید والوں کا پبلسٹی اسٹنٹ ہے"۔ اس دوران میں "جاوید" کے مالک مسٹر نصیر انور کا رقعہ ملا۔

منٹو صاحب

ایک خبر سنیئے ——— آج پولیس نے دفتر "جاوید" پر چھاپہ مارا۔ تلاشی لینے پر بچے کھچے چند پرچے اپنے قبضے میں لے لئے۔ باقی پرچوں کی جانچ پڑتال ہوئی تو ڈسپیچ رجسٹر نے واضح کر دیا کہ تمام پرچہ ہند و پاک کے مختلف اسٹیشنوں پر سپلائی ہو چکا ہے۔

رجسٹر میں سے تمام ایجنسیوں کے پتے نوٹ کر لئے گئے اور آئندہ سپلائی کا حساب کتاب بند کر دیا گیا۔ یہ کارروائی گرفتاری کا پیش خیمہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی ملزموں کے کٹہرے میں ہوں گے ——— لیکن ایک بات قابل ذکر ہے کہ ایک مقامی ادارہ اس چھاپے کو اختراع اور پروپیگنڈے سے منسوب کرتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیوں ہے۔

خیر اس کی تصدیق خود بخود ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ اب ذرا وہیں چلئے۔ جہاں تین بار سزا پانے پر آپ بری قرار دیئے گئے

"میرا خیال ہے کہ یہ بار آخری بار ہوگی"۔

خبر کی تصدیق ہو گئی۔ معاملہ پریس ایڈوائزری بورڈ کے سامنے پیش ہوا جس کے کنونیر کرنل فیض احمد فیض اڈیٹر پاکستان ٹائمز تھے اس میں "جاوید" کے مالک مسٹر نصیر انور بھی موجود تھے۔ ان کی زبانی اس میٹنگ کی مختصر روداد سنیئے۔

پاکستان ٹائمز کے دفتر میں پریس ایڈوائزری بورڈ کی میٹنگ تھی۔ فیض احمد فیض کنونیر تھے۔ میٹنگ میں ایف ڈبلیو بسٹن (سول ملٹری گزٹ)، مولانا اختر علی (زمیندار) حمید نظامی (نوائے وقت) وقار انبالوی (سفینہ) اور امین الدین صحرائی (جدید نظام) شریک تھے۔ چوہدری محمد حسین نے "جاوید" کا خاص نمبر پیش کیا۔ آپ نے سب سے پہلے پرچے کے باغیانہ اور اشتعال انگیز مضامین نظم و نثر گنوائے۔ "غلامی سے آزادی تک" رقص بسمل ——— "سیلاب چین" یہ تھیں نظمیں۔ مضامین میں سے لورنگ سے فلیٹی تک "کھیرا بہادر کی جے" اور "چین کتنی دور ہے"۔ زیر بحث لائے گئے۔ فیض حکومت کے عائد کردہ الزام کی تردید کرتے رہے۔ دیگر اراکین نے ہاں میں ہاں ملائی اور یوں یہ سیاسی الزام ٹل گیا۔ لیکن نزلہ گرا "ٹھنڈا گوشت" پر فیض نے جب اسے غیر فحش قرار دیا تو مولانا اختر علی گرج اٹھے "نہیں نہیں۔ اب ایسا ادب پاکستان میں نہیں چلے گا"۔ جناب صحرائی نے اس پر صاد کیا۔ وقار صاحب نے افسانے کو ملعون و مطعون قرار دیا۔ حمید نظامی نے نوائے وقت کا ساتھ دیا اور جب ایف ڈبلیو بسٹن کو چوہدری صاحب نے انگریزی میں "ٹھنڈا گوشت" سمجھایا تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی فرمانے لگے۔ اس کہانی کی تھیم یہ ہے کہ ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مردہ لڑکی تک نہیں چھوڑی .... مجھے ہنسی تو آ گئی تھی لیکن جب چوہدری

صاحب غلط ترجمانی پر مُصر رہے تو مجھے افسوس ہوا ——— میں نے لاکھ سمجھایا، فیض صاحب نے ہر طرح سے اطمینان دلایا لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ اب عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے"۔

چنانچہ چند دن بعد میں نصیر انور اور عارف عبدالمتین گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتار کرنے والے سب انسپکٹر چوہدری خدا بخش تھے بے حد شریف۔ کئی دن میرے مکان کے چکر کاٹتے رہے۔ ان دنوں میں اکثر باہر ہوتا۔ آخر ایک روز وہ مجھ سے ملنے میں کامیاب ہو گئے بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کہا "کل صبح کسی دوست کے ساتھ تھانہ سول لائنز میں تشریف لے آئیے گا تاکہ آپ کی ضمانت ہو جائے" ——— اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھے پولیس کے آدمیوں سے پالا پڑ چکا تھا۔ چودھری خدا بخش صاحب کا نرم رویہ مجھ پر بہت اثر انداز ہوا۔

دوسرے روز صبح کو میں تھانے میں حاضر ہو گیا۔ میرے دوست شیخ سلیم نے دستخط کئے اور ہم مقدمے کے پہلے مرحلے سے فارغ ہو گئے۔

عارف عبدالمتین بہت ہی پریشان تھے ان کا حلق خشک ہو جاتا تھا۔ یہ حیرت کی بات ہے کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ عدالت سے خدا معلوم کیوں اتنے خائف تھے۔ بہر حال سمن جاری ہوئے۔ سماعت کی تاریخ مقرر ہوئی اور ہم تینوں ضلع میں حاضر ہوئے۔

میرے لئے یہ جگہ کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ اپنے پچھلے تین مقدموں کے سلسلے میں یہاں کئی مرتبہ آ چکا تھا اور دھول پھانک چکا تھا ——— نام تو ضلع کچہری ہے لیکن بے حد غلیظ جگہ ہے، مچھر، مکھیاں، کیڑے مکوڑے ——— ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکاریں نہایت ہی دقیانوس ٹائپ رائٹروں کی اکتا دینے والی ٹپ ٹپ۔ تین ٹانگوں والی کرسیاں جن کی نشست کا بید ہی غائب ہے۔ دیواروں پر سے پلستر اکھڑ رہا ہے۔ باغ ہے جس کا لان افلاس زدہ میلے کچیلے کشمیری کے سر کی طرح گنجا ہے۔ برقع پوش عورتیں ننگے گردے اٹے ہوئے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہیں۔ کوئی گندی گالیاں بک رہا ہے کوئی لیبو رہا ہے۔ اندر کمروں میں مجسٹریٹ صاحبان نہایت ہی واہیات میزوں کے پاس بیٹھے مقدموں کی سماعت فرما رہے ہیں۔ پاس دوست یار بیٹھے ہیں۔ دورانِ سماعت میں ان سے بھی گفتگو جاری رہتی ہے۔ الفاظ ضلع کچہری کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتے ——— یہاں کی فضا الگ، یہاں کا ماحول الگ یہاں کی زبان الگ یہاں کی اصطلاحات الگ ——— عجیب و غریب جگہ ہے۔ خدا اس سے دور ہی رکھے۔

آپ کو نقل لینی ہو تو درخواست کے ساتھ "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ کوئی مثل معائنے کے لئے نکلوانی ہو تو بھی "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ کسی افسر سے ملنا ہو تو بھی پہیے لگانے پڑیں گے۔ اگر کام فوری کرانا ہے تو پہیوں کی تعداد بڑھ جائے گی ——— غور سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں تو آپ کو ضلع کچہری میں ہر عرضی پہیوں پر چلتی نظر آئے گی۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک چار پہیے۔ دوسرے دفتر سے تیسرے دفتر تک جانے کے لئے آٹھ پہیے وقس علی ہذا ——— اگر آپ عادی مجرم نہیں تو آپ کے دل میں یہ زبردست خواہش پیدا ہو گی کہ کوئی آپ کے پہیے لگا دے اور دھکا دیدے تاکہ آپ ضلع کچہری سے باہر نکل جائیں۔

وکیل کا سوال درپیش تھا۔ عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے جناب تصدق حسین خالد سے ملاقات ہوئی آپ نے کمال مہربانی سے خود ہی کہا کہ وہ ہمارے مقدمے کی پیروی کرنے میں مسرت محسوس کریں گے۔ چنانچہ ان کو ہی تکلیف دی گئی۔

خالد صاحب آئے۔ ہم ملزمین میاں اے ایم سعید پی۔سی۔ایس مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت میں پیش ہوئے۔ میاں صاحب موصوف کسی زمانے میں کپتانی کے عہدے پر فائز تھے۔ مگر اب ان سے بندوق لے کر عدل وانصاف کی ترازو ان کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی —— چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں۔ چھریرا بدن۔ رنگ سانولا —— کرسی پر بڑی تمکنت سے بیٹھے تھے ہم ملزمین سلام کرکے کٹہرے میں کھڑے ہوئے تو آپ ہماری طرف دیکھے بغیر میاں تصدق حسین خالد کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک بار پھر ضمانتیں ہوئیں۔ اس کے بعد دوسری سماعت کی تاریخ مل گئی۔ ہم نے میاں سعید صاحب کو سلام کیا اور عدالت سے باہر نکل آئے —— جون کا مہینہ تھا۔ سب کے حلق خشک تھے مگر عارف عبدالمتین کا حلق تو بالکل لکڑی ہو رہا تھا۔ کاش وہاں کوئی پارٹی ممبر ہوتا۔

دو تین پیشیاں اس طرح بھگتیں۔ موسم ظالمانہ حد تک گرم ہو چکا تھا۔ لیکن قہر درویش برجان درویش آواز پڑنے تک عدالت کے باہر کھڑے رہتے کیونکہ ڈر تھا کہ اگر ہم ادھر ادھر ہو گئے تو مجسٹریٹ صاحب کا قہر نازل ہو جائے گا۔ شروع ہی سے ان کا رویہ بہت سخت تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے اپنے دل میں ہمارے خلاف فیصلہ مرتب کر چکے ہیں۔ میاں خالد نے مجھ سے کہا "کیوں نہ ہم اس عدالت سے اپنا مقدمہ منتقل کرا لیں۔ مجسٹریٹ کا رویہ صاف مخاصمانہ ہے" —— میں نے کہا "میاں صاحب چھوڑیئے۔ دوسری عدالت میں مقدمہ لے گئے تو کیا ہمیں وہاں لڈو پیڑے کھلائے جائیں گے۔ رہنے دیجئے مقدمے کو یہیں"۔

میاں خالد مان گئے۔ چنانچہ دو تین پیشیاں بھگتیں۔ استغاثے کی طرف سے مسٹر محمد یعقوب ولد میاں غلام قادر مینیجر کوآرٹ پریس لاہور۔ شیخ محمد طفیل حلیم اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ڈی سی آفس لاہور سید ضیاء الدین احمد مترجم پریس برانچ پنجاب گورنمنٹ اور چند حضرات رسمی طور پر پیش کیے گئے۔

سید ضیاء الدین نے کہا کہ میری رائے میں "ٹھنڈا گوشت" تمام کا تمام فحش ہے۔ میاں خالد کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جہاں تک مصنف کی کوشش کا تعلق ہے وہ نیک ہے مگر اندازِ اظہار اور استعمال الفاظ غلط ہے۔ میاں خالد نے گواہ سے ایک اور سوال کیا۔ کیا مصنف کو اپنے کردار کے منہ میں ایسے الفاظ نہیں ڈالنے چاہئیں جو اس کی صحیح شخصیت پیش کریں"۔ سید صاحب نے جواب دیا جس قسم کا کردار ہو ویسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں آپ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مصنف کا یہ کام ہے کہ وہ اچھے برے کردار تخلیق کرے۔

شہادت استغاثہ ختم ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے حسب ضابطہ رسمی طور پر ہم سے چند سوال کیے جن کا مختصر جواب دیدیا گیا یہ سلسلہ عدالتی زبان میں "استفسار ملزم بلاحلف" کہلاتا ہے اور کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔

سوال عدالت: آپ پر الزام ہے کہ آپ نے بحیثیت مصنف مضمون "ٹھنڈا گوشت" جو کہ رسالہ "جاوید" کے خاص نمبر

میں بغرض اشاعت نصیر انور پرنٹر و پبلشر ملزم ہمراہی اور عارف عبدالمتین اور نصیر انور اڈیٹر رسالہ مذکور کو جو فحش تھا دیا۔ یہ جرم دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند کی تعریف میں آتا ہے آپ وجہ ظاہر کریں کہ کیوں نہ آپ کو اس جرم کی سزا دی جائے؟

جواب: (جو خالد صاحب نے میری طرف سے دیا) میں نے افسانہ "ٹھنڈا گوشت" جاوید میں بغرض اشاعت دیا لیکن وہ فحش نہیں تھا اور نہ میں اسے فحش تصور کرتا ہوں۔ یہ افسانہ اصلاحی ہے۔

سوال عدالت۔ مقدمہ کیوں بنایا گیا؟

جواب۔ پولیس بہتر جانتی ہے اس کا نقطۂ اخلاق و اصلاح ہم سے مختلف ہے۔

سوال عدالت۔ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟

جواب۔ اس موقع پر نہیں!

اب ہم سے صفائی کے گواہوں کی فہرست پیش کرنے کے لئے کہا گیا۔ یہ فہرست ہم نے پہلے ہی تیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ فوراً پیش کر دی گئی۔ میاں سعید صاحب نے جب بتیس نام دیکھے تو خفا ہو گئے کہا "میں اتنا ہجوم نہیں بلا سکتا" — میاں خالد نے اصرار کیا کہ ہر گواہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ میاں سعید نے اپنے انداز میں مضحکہ اڑانے کی کوشش کی۔ ممتاز شیریں صاحبہ کا نام پڑھا تو ارشاد کیا "یہ ممتاز شانتی کون ہے" — عدالت کے آدمی میاں صاحب کے اس مذاق پر ہنسے ہم ہونٹ بھینچے خاموش رہے۔

بڑی مشکلوں کے بعد مجسٹریٹ صاحب درجہ اوّل چودہ گواہ بلانے پر راضی ہوئے چنانچہ فہرست پر نشان لگا دیئے گئے۔ سمن جاری ہوئے۔ میں کسی گواہ سے نہ ملا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ہر ایک میرے افسانے کے متعلق اپنی بے لاگ رائے دے تاکہ مجھے اپنی صحیح پوزیشن معلوم ہو سکے۔

جن گواہوں کے سمن کی تعمیل ہو چکی تھی ان کو صبح سویرے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ میں بے حد شرمندہ تھا۔ کیونکہ غریب کام کاج چھوڑ کر کئی کئی گھنٹے کھڑے رہتے تھے۔ ہم تو ملزم تھے لیکن ان کی حالت بھی ہم جیسی تھی ہم اندر کٹہرے میں کھڑے رہتے تھے اور وہ عدالت کے باہر لوہے کے جنگلے کے ساتھ لگے انتظار کرتے رہتے تھے کہ انہیں کب آواز پڑتی ہے۔

میرے دوست شیخ سلیم کی حالت قابل رحم تھی۔ صبح شام پینے کا عادی، سارا دن جمائیاں لیتا رہتا تھا آخر اس سے یہ اذیت برداشت نہ کی گئی۔ چھوٹی بوتل میں وسکی بھر کے لے آتا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پیتا رہتا — ادب سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں — لیکن جب وہ دوسروں سے باتیں کرتا تو یہی کہتا "آخر فحاشی ہے کیا۔ منٹو کا افسانہ ٹھنڈا گوشت" میں نے پڑھا نہیں لیکن یہ فحش نہیں ہو سکتا۔ منٹو آرٹسٹ ہے"۔

ہماری طرف سے پہلے گواہ سید عابد علی عابد ایم اے ایل ایل بی پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ میں نے رسالہ جاوید میں "ٹھنڈا گوشت" پڑھا ہے — یہ ایک ادب پارہ ہے — منٹو صاحب کی میں نے تمام تصانیف پڑھی ہیں۔ پریم چند کے بعد جو مختصر افسانہ نگار مشہور ہوئے ان میں سعادت حسن منٹو کو ایک خاص

مقام حاصل ہے ـــــ اس افسانے سے ایشر سنگھ کے کردار کا نمایاں ترین اثر یہ ہے کہ اس نے جو نا روا حرکت کی، اس کی سزا اسے فطرت کی طرف سے نفسیاتی نامردی کی صورت میں مل گئی"۔

عدالت کے ایک سوال پر عابد صاحب نے کہا "ولی سے لے کر غالب تک سب وہ چیز جسے فحش کہا جاتا ہے۔ ملتے چلے آئے ہیں۔ لٹریچر کبھی فحش نہیں ہوتا۔ جو ایک بار لٹریچر قرار دیا جا چکا ہو"۔

استغاثہ کی طرف سے سوال کیا گیا "کیا ادب مقصود بالذات ہے"؟

عابد صاحب نے جواب دیا "میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ادب تنقید حیات ہے اور اس میں اس سوال کا جواب شامل ہے۔ ہر معقول انسان کے قول اور فعل کا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن تمام انسان معقول نہیں ہوتے۔ ہر قول یا فعل سوسائٹی کی نظروں میں اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔ اچھے اور برے فعل جانچنے کے لئے بے شمار معیار ہوتے ہیں"۔

استغاثے کے ایک اور سوال کے جواب میں عابد صاحب نے کہا "یہ افسانہ میرے سب بچوں اور بچیوں نے پڑھا ہے ـــــ میری ایک لڑکی جو فورتھ ائیر میں پڑھتی ہے۔ اس سے کئی بار "سیکس" پر علمی بحث ہو چکی ہے جو اس کے نصاب کا جزو ہے" ـــــ پھر آپ نے کہا "خاص آدمیوں سے جو کہ ادیب ہیں اس افسانے کے بارے میں میرا تبادلۂ خیالات ہوا۔ سب نے اس کو بہت سراہا"۔

صفائی کے دوسرے گواہ مسٹر احمد سعید پروفیسر نفسیات دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" فحش نہیں ہے اس میں ایک بہت بڑا جنسی مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک لفظ فحش کی کوئی بنیاد ہی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں فحاشی ایک اضافی چیز ہے۔ ذہنی طور پر بیمار اشخاص پر "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے سے برا اثر ہو سکتا ہے۔

تیسرے گواہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی سابق ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا "انسانی نفسیات کے اندر جو خیر و شر ہے۔ ادیب کا یہ کام ہے کہ اس کو اس انداز سے پیش کرے کہ جس سے انسانی زندگی کے حقائق سمجھنے میں مدد مل سکے۔ برے کردار کو اس انداز سے پیش کرے کہ اس کی برائی دیکھ کر نفرت پیدا ہو"۔

خلیفہ صاحب نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا زیر بحث افسانے کے کردار ایشر سنگھ سے شدید کراہت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کردار بالکل صحیح ہے۔ ایسے کرداروں پر خاص کیفیتوں کے ماتحت جسمانی حالت درست ہونے کے باوجود نفسیاتی نامردی طاری ہو سکتی ہے۔

ان تینوں گواہوں کے بیان ایک پیشی میں ہوئے چونکہ یہ خاصے طویل تھے اور ایک ایک لفظ خود مجسٹریٹ صاحب کو لکھنا پڑتا تھا اس لئے وہ جھنجلا جھنجلا جاتے تھے۔ کئی بار آپ نے تنگ آ کر کہا میں مجسٹریٹ ہوں یا محرر ـــــ لیکن بہر حال انہیں اپنا فرض ادا کرنا ہی تھا۔

اس پیشی میں ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ میرے ہاتھ میں سگرٹوں کا ڈبہ غالباً "کریون" لے تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر پڑی تو آپ نے مجھے ایک بہت بڑی ڈانٹ پلائی۔ یہ گھر نہیں ہے ـــــ عدالت ہے"۔ میں نے مودبانہ عرض

کیا۔ "لیکن حضور میں پی تو نہیں رہا ہوں"۔ آپ نے اور زیادہ گرم ہو کر کہا۔ "خاموش رہو۔ ڈبہ اپنی جیب میں رکھو۔" میں نے حکم کی تعمیل کی —— مجسٹریٹ صاحب درجہ اوّل نے میز پر سے اپنا سگریٹ ٹن اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر پینا شروع کر دیا —— اور میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا اس کا بکھرا ہوا دھواں پیتا رہا۔

اگلی پیشی پر میاں تصدق حسین خالد تشریف نہ لائے کیونکہ ان کے گھر میں کوئی علیل تھا۔ ہمیں تاریخ مل گئی۔ اس تاریخ پر میاں صاحب موصوف تشریف نہ لائے۔ ان کا لڑکا ولایت سے واپس آ رہا تھا۔ وہ کراچی اس کے استقبال کے لئے چلے گئے تھے۔ ہم سخت الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے مودبانہ گزارش کی کہ ہمیں تاریخ دیدی جائے۔ اس لئے کہ ہمارا وکیل موجود نہیں —— آپ نے اس سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ کارروائی شروع ہو۔

میں بہت پٹپٹایا۔ گواہ کو آواز دی گئی۔ ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے۔ ایل۔ ایل بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ ایس۔ سی ان دنوں پاکستان ایئر فورس کے سویلین افیسر، تشریف لائے۔ اب میں سوچنے لگا کیا کروں۔ مگر شاید اس لئے کہ خاندان کے سب بزرگ وکیل اور باپ سب جج تھے دو بڑے بھائی بیرسٹر ہیں اور اس لحاظ سے خون میں کسی قدر قانون گھلا ہوا تھا۔ میں نے میاں تصدق حسین صاحب خالد کی جگہ سنبھالی اور اپنے گواہ نمبر ۲ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب سے بیان دلوانا شروع کر دیا۔ بات بات پر مجسٹریٹ صاحب مجھے ٹوکتے۔ تم اس طرح سوال نہیں کر سکتے —— تم یہ بات نہیں پوچھ سکتے —— میں ڈٹا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کا بیان آدھا ختم ہوا تھا کہ عدالت کے کمرے میں چار نوجوان وکیل کالے کوٹ پہنے بڑے چست بڑے بانکے داخل ہوئے اور ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ایک جس کی پتلی پتلی مونچھیں تھیں اور جس کا رنگ باقی دو کے مقابلے میں کسی قدر سانولا تھا۔ میرے ساتھ کٹہرے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھے سانس لینے کا موقع ملا تو اس نے میرے کان میں کہا۔ "منٹو صاحب کیا آپ کے مقدمے کی پیروی کر سکتے ہیں۔" میں نے کچھ نہ سوچا اور کہا۔ "جی ہاں آپ کر سکتے ہیں" —— چنانچہ پتلی پتلی مونچھوں والے اس نوجوان وکیل نے پیروی شروع کر دی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس سے پوچھا۔ "آپ کیسے"؟

وکیل نے مسکرا کر جواب دیا۔ "حضور میں ان کا وکیل ہوں۔ کیوں منٹو صاحب —— میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کارروائی شروع ہوئی۔ اس وکیل کے باقی تین ساتھی بھی حصہ لینے لگے —— ان کی سرگرمی میں بڑا دلکش لڑکپن تھا وہ جو کالج کے زندہ دل طلبا میں ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ بھنا گئے۔ آپ نے ان تین سے پوچھا۔ "آپ حضرات کیوں بیچ میں بول رہے ہیں" —— انہوں نے جواب دیا۔ "حضور ہم ملزموں کے وکیل —— کیوں منٹو صاحب" —— میں نے پہلے کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

ڈاکٹر سعید اللہ صاحب نے اپنے بیان میں جو کچھ کہا میں اسے مختصراً پیش کرتا ہوں —— آپ نے فرمایا ٹھنڈا گوشت پڑھنے کے بعد میں خود ٹھنڈا گوشت بن گیا۔ پژمردگی اور افسردگی یہ تھا اس کا اثر یہ افسانہ شہوانی ہیجان

ہر گز پیدا نہیں کرتا ——— ایشر سنگھ کا کردار پیش کرنے کے لئے مصنف نے دو تین دفعہ گالی استعمال کی ہے۔ مگر شاید فنکار نے اسے مناسب سمجھا ہو۔ مگر گالی کی شکل اس نے اس طرح بدلی ہے کہ گالی معلوم نہیں ہوتی ——— اگر وہ گالی جو ایشر سنگھ نے استعمال کی ہے۔ گالی بھی رہتی تو بھی میرے نزدیک افسانہ فحش نہ ہوتا۔ گالی فحش بھی ہو سکتی ہے اور فحش نہیں بھی ہو سکتی۔ اگر فن کار صحیح فن کار ہے تو وہ گالی کو بغیر ضرورت کبھی استعمال نہیں کرتا۔ اس افسانے میں گالی کا استعمال فنکارانہ ہے۔"

پروسی کیوٹر صاحب بڑے نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ بہت بانکے۔ کجکلاہ، گردن میں ہلکا سا شاندار خم، آنکھوں پر "رم لس" چشمہ جسے وہ بار بار اپنی ناک سے اتارتے اور جماتے تھے۔ آپ نے ازراہ تمسخر کچھ کہا تو ڈاکٹر صاحب برس پڑے۔ اس زور سے کہ دوسرے کمرے میں صوفی تبسم صاحب کرسی پر اچھل کر باہر نکل آئے۔ بہر حال معاملہ ٹل گیا۔

پروسی کیوٹر صاحب نے جن کا نام غالباً محمد اقبال تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ "نفس مضمون کے لحاظ سے مختلف ادبا کو مختلف القاب دیئے گئے ہیں۔ مثلاً راشد الخیری کو مصور غم، اقبال کو مصور حقیقت اور خواجہ حسن نظامی کو مصورِ فطرت ...... آپ ....."

ڈاکٹر صاحب نے اقبال صاحب کی بات کاٹ کر کہا "میں "ٹھنڈا گوشت" کے مصنف کو مصورِ حیات کا لقب دوں گا۔"

اب کرنل فیض احمد فیض اڈیٹر پاکستان ٹائمز کی باری آئی۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا "میری رائے میں افسانہ فحش نہیں ہے۔ ایک افسانے کے الگ الفاظ کو فحش یا غیر فحش کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ افسانے پر تنقید کرتے وقت مجموعی طور پر تمام افسانہ زیر نظر ہوگا اور ہونا چاہیئے۔ محض عریانی کسی چیز کے فحش ہونے کی دلیل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے کے مصنف نے فحش نگاری نہیں کی لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں زندگی کے بنیادی مسائل کا تسلی بخش تجزیہ نہیں ہے۔"

جرح کے جواب میں فیض صاحب نے کہا "میری پھبیاں لے رہے تھے" ——— اگر موضوع تقاضا کرے تو میں ایسے الفاظ کا استعمال جائز سمجھتا ہوں۔ "منہ بھر بھر کے بوسے لئے"۔ "چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا"۔ یہ الفاظ پارلیمنٹری نہیں لیکن ادبی اعتبار سے جائز ہیں۔"



فیض صاحب کے بعد صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور تشریف لائے ——— آپ نے اپنے بیان میں کہا۔ "افسانہ "ٹھنڈا گوشت"، لوگوں کے اخلاق کو خراب نہیں کرتا، ہو سکتا ہے۔ اس کے بعض فقرے الگ ہو کر فحش ہوں اور بعض نہ ہوں۔ انسانی جنسیات کو ادب کا موضوع بنا کر ہمارے لٹریچر کا رجحان ایک صحیح سمت کی طرف جا رہا ہے۔

جرح کا جواب دیتے ہوئے صوفی صاحب نے فرمایا۔ "کوئی افسانہ یا ادب پارہ فحش نہیں ہو سکتا۔ جب تک لکھنے والے کا مقصد ادب نگاری ہے۔ ادب بحیثیت ادب کے کبھی فحش نہیں ہوتا۔"

اقبال صاحب نے اپنی ناک پر سے کئی مرتبہ جلدی جلدی "رم لس" چشمہ اتارا اور جمایا۔ وہ صوفی صاحب کو گھیر گھار کر اپنے مطلب کی بات کہلوانا چاہتے تھے۔ مگر صوفی صاحب طفل مکتب نہیں تھے۔ بیس برس سے استادی کرتے چلے آئے تھے۔ اقبال صاحب کے جال میں نہ پھنسے۔ ایک مرتبہ تو آپ نے صاف کہہ دیا۔ "دیکھئے صاحب آپ لاکھ الٹ پھیر کریں۔ لیکن میں وہی کچھ کہوں گا جو مجھے کہنا ہے۔

اقبال صاحب نے سوال کیا ——— "اگر کسی تحریر۔ افسانے یا ادب پارے کے نتائج مخرب الاخلاق ہوں مگر مصنف کا مقصد تخریب اخلاق نہ ہو تو آپ اس افسانے کو فحش کہیں گے یا نہیں۔"

صاف ظاہر تھا کہ اقبال صاحب کیا چاہتے ہیں۔ صوفی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔ نہیں ——— اس لیے کہ پڑھنے والوں کے اپنے ذہنی رجحانات شامل ہوں گے نہ کہ مصنف کا مطلب ——— تخلیق ادب مصنف اپنی طبع سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔ یہ تخلیق اوروں کے لیے بھی ہوتی ہے۔

اقبال صاحب نے ایک اور سوال کیا۔ اگر اس تصنیف سے لوگوں کے اخلاق پر برا اثر پڑے تو اس کی ذمہ داری ادیب پر ہو گی یا نہیں۔"

صوفی صاحب نے کھٹ سے جواب دیا۔ "وہ بری الذمہ ہے۔"

اقبال صاحب نے عاجز آ کر پوچھا۔ "آخر مخرب اخلاق تحریر کیا ہے؟"

صوفی صاحب نے جواب دیا۔ "وہ تحریر جس سے لکھنے والے کا مقصد محض تخریب اخلاق ہو۔"

اقبال صاحب نے پھر اپنا "رم لس" چشمہ جمایا اور گردن کو ذرا اور خمیدہ کر کے جرح بند کر دی۔

ڈاکٹر آئی۔ لطیف ہیڈ آف دی سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ ایف سی کالج لاہور بلائے گئے۔ میں نے ان کا نام سنا تھا لیکن دیکھا کبھی نہیں تھا۔ آپ صوفی صاحب کے بیان کے دوران میں میاں سعید صاحب کے پاس بیٹھے تھے اور رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ان کی طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔ جب وہ بیان دینے لگے تو میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ کالا رنگ۔ سب سے پہلے مجھے ان کی تیکھی مونچھیں نظر آئیں۔ آپ نے رسالہ ایک طرف رکھا اور کہنا شروع کیا "میں نے ٹھنڈا گوشت" ابھی ابھی پڑھا ہے۔ یہ ایک غلط رسالے میں چھپا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ یہ افسانہ ایک پوپولر رسالے میں نہیں چھپنا چاہیے تھا۔ اگر یہ کسی سائنٹیفک رسالے میں کیس ہسٹری کے طور پر مردی اور نامردی کی تائید یا تردید میں چھپتا تو اس پر فحاشی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا ——— جن الفاظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بولنے میں ان کو برا سمجھتا ہوں۔ لیکن کیس ہسٹری میں یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھیں گے۔"

خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ ڈاکٹر لطیف نے ایک دم پوچھا۔ ”مسٹر منٹو کون ہیں؟“ میں نے کہا ”جناب یہ خاکسار ہے۔“ ڈاکٹر صاحب کی تیکھی مونچھیں تھرتھرائیں۔ آپ نے مجھ سے کچھ نہ کہا اور بیان دینے میں مشغول ہو گئے۔ وکیل صاحب نے میرے کان میں کہا۔ ”منٹو صاحب آپ کا یہ گواہ تو ہوسٹائل ہو گیا ہے۔ اب آپ اس پر جرح کر سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہٹائیے۔“

لیکن وکیل صاحب نے جرح کر ہی دی۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر لطیف صاحب نے کہا۔ ”افسانہ ایسے رسالے میں جس کو ہر بچہ بوڑھا۔ لڑکا۔ لڑکی پڑھ سکے نہیں چھپنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ایسی طبائع جو جذبات کو مشتعل کرنے والے تاثرات قبول کرنے والی ہوں۔ یہ افسانہ پڑھ کر مشتعل ہوں گی۔“

جرح ختم ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب میرے پاس آئے۔ ہاتھ ملایا اور کہا۔ آپنے مجھے گواہی کے لیے بلایا تھا تو کم از کم مل لیے ہوتے۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ انشاء اللہ اب ملاقات کا شرف حاصل کروں گا۔“

ڈاکٹر صاحب نے پھر ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

اب میں ان چار نوجوان وکیلوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو بڑے ڈرامائی انداز میں میرے مقدمے میں داخل ہوئے تھے۔ پتلی پتلی مونچھوں۔ تیکھی ناک اور سانولے رنگ والے شیخ خورشید احمد تھے۔ کافی ہاؤس ان کے بغیر نامکمل ہے۔ دوسرے تین تھے۔ مسٹر مظہر الحق، مسٹر سردار محمد اقبال اور مسٹر اعجاز محمد خاں۔ آپ لوگوں کو بار روم میں معلوم ہوا کہ میں خود اپنا کیس کنڈکٹ کر رہا ہوں اور پریشان ہوں تو وہ میری مدد کے لیے چلے آئے —— میں نے ان کا شکریہ مناسب و موزوں الفاظ میں ادا کیا۔ شیخ خورشید احمد نے کہا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں —— لیکن داد دیجئے کہ میں نے آپ کا افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ پڑھا کیا دیکھا تک نہیں —— ہم سب خوب ہنسے۔ شیخ نے کہا۔ ”اور میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ مسٹر اقبال نے بھی یہ افسانہ ابھی تک نہیں پڑھا۔“

ہماری طرف سے سات گواہ اب تک پیش ہوئے تھے۔ بقایا گواہوں کو بلوانے کے لیے جب شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے درخواست کی تو مسترد کر دی گئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس خیال سے کہ ہمارا پلڑا وزنی ہے۔ عدالت کی طرف سے چار گواہ طلب کئے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی۔ شورش کاشمیری۔ ابو سعید بزمی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔

کئی تاریخیں بھگتیں۔ مگر یہ حضرات جمع نہ ہوئے۔ آخر ایک تاریخ پر سب آ گئے۔ تاجور صاحب سے علیک سلیک ہوئی تو آپ نے لیکچر پلانا شروع کر دیا کہ میں ایسے غلیظ۔ فحش اور واہیات افسانے لکھتا ہوں۔ میں خاموش سنتا رہا۔ اس لیے کہ مولانا کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا۔

آغا شورش بڑے پرشور طریقے پر ملے۔ ابو سعید بزمی نے مجھ سے ایک سگرٹ لیا اور سلگا کر ٹہلنے لگے۔ آواز پڑی تو حاضر عدالت ہوئے۔ کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے گواہ منجانب عدالت شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور تھے — آپ نے فرمایا۔ ”ٹھنڈا گوشت“ کسی مسجد میں یا کسی مجلس میں جماعتی حیثیت میں سننا پسند نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی پڑھے تو اپنا سر سلامت لے کر نہ جا سکے۔ چالیس سالہ ادبی زندگی میں ایسا ذلیل اور گندہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔

میں نے مولانا سے چند سوال کئے تو آپ نے جواباً کہا: ”یہ افسانہ میں نے پہلی بار دیال سنگھ کالج میں پڑھا لیکن پورا نہیں پڑھا۔ تھوڑا سا پڑھا اور لغو سمجھ کر بند کر دیا —— مثنوی گلزار نسیم میں بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کا تذکرہ اخلاق سے متصادم ہے —— فسانہ عجائب

مثنوی بہارِ عشق۔ مثنوی فریب عشق اور الف لیلیٰ میں جو فحش حصے ہیں۔ وہ فحش ہیں۔ حکایت خانم و کنیز کا ذکر مثنوی مولانا روم میں آتا ہے۔ لیکن میں نے نہیں پڑھا ـــــ جنسی ترغیب کا پہلو مثنوی مولانا روم میں نہیں ہو سکتا۔"

جی چاہتا تھا کہ مولانا کو خوب سناؤں۔ مگر میں نے مناسب خیال نہ کیا اور چند سوال اور کر کے ان کو چھوڑ دیا ـــــ اب آغا شورش کاشمیری ولد آغا نظام الدین اڈیٹر ہفتہ وار "چٹان"، مونچھوں کے اندر مسکراہٹیں بکھیرتے تشریف لائے۔ میری طرف دیکھ کر آپ کھل کر مسکرائے اور بیان دینا شروع کر دیا۔

آپ نے فرمایا۔ جہاں تک میرے علم اور احساسات کا تعلق ہے۔ میں نے "ٹھنڈا گوشت" سے اچھے تاثرات فراہم نہیں کئے۔ جس سماج اور گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس کے پیش نظر میں ایسا مضمون اپنے پرچے میں شائع نہیں کروں گا۔ میرا مدرسہ فکر اسے گوارا نہیں کرتا۔"

استغاثے کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آغا صاحب نے کہا۔ "اس سے اوباش قاری کو ترغیب ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو جن کا رجحان طبیعت خاص طور پر بدکاری کی طرف مائل ہو۔"

ہماری طرف سے آغا صاحب پر کوئی جرح نہ کی گئی ـــــ ابو سعید بزمی ایڈیٹر احسان لاہور، پیش ہوئے تو آپ نے افسانے کو مخرب اخلاق قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ "افسانہ معنی و مطلب کی وجہ سے قابل اعتراض ہے۔"

میں نے بزمی سے پوچھا "کیوں حضرت، یہ بتائیے کیا اسی عدالت میں آپ کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چل رہا ہے؟" ـــــ آپ نے جب "جی ہاں" کہا۔ تو مجسٹریٹ صاحب نے حیرت سے پوچھا "میری عدالت میں" ـــــ بزمی صاحب نے پھر جواب دیا۔ جی ہاں ـــــ مجسٹریٹ صاحب نے قلم سے سر کھجا کر پائپ سلگایا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

آخری گواہ منجانب عدالت پیش ہوئے۔ یعنی ڈاکٹر تاثیر صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا۔ "کہانی ادبی لحاظ سے ناقص ہے۔ لیکن ہے ادبی۔ نشان لگائے ہوئے الفاظ کچھ اس کہانی کے لیے ضروری ہیں، کچھ غیر ضروری۔ کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کو ناشائستہ کہا جا سکتا ہے، لیکن میں فحش اس لیے نہیں کہتا کہ لفظ فحش کی تعریف کے متعلق میں واضح نہیں ہوں ـــــ میرے خیال میں جن لوگوں کا میلان بدکاری کی طرف ہے۔ ان کے لیے اس مضمون میں جنسی ترغیب موجود ہے۔ جس شخص کی طبع میں میلان بدکاری نہ ہو اسے اس مضمون سے جنسی کراہت ہو گی۔ جنسی ترغیب نہیں ہو گی۔ "ٹھنڈا گوشت" کا مطلب مردہ لڑکی ہے۔ میں اس کہانی کو ایک عام جنسی کہانی سمجھتا ہوں۔ یہ جنسی اخلاق خراب نہیں کرتی۔"

عدالت کی تمام کارروائی ختم ہوئی۔ اب فیصلہ باقی تھا جو میاں ایم سعید صاحب سماعت کے دوران کئی مرتبہ زبانی سنا چکے تھے۔ شیخ خورشید احمد کو یقین تھا کہ ہم سب کو جرمانہ ہو گا ـــــ فیصلے کی تاریخ سولہ جنوری (یہی سال) مقرر ہوئی۔ نصیر انور بالکل بے پرواہ تھا۔ ساری سماعت کے دوران میں وہ ہنستا رہا۔ عارف عبدالمتین البتہ سارا وقت بہت پریشان رہے۔ ان کی اس پریشانی کا باعث یہ بھی تھا کہ ان کے معمر والد بڑے ہراساں تھے۔

جب صفائی کی گواہیاں ختم ہوئیں تو میں نے اپنا تحریری بیان داخل کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا تھا۔ "یہ بیان ہی ملزم کو سزا دینے کے لیے کافی ہے۔"

یہ بیان حسب ذیل ہے:۔

میں افسانہ "ٹھنڈا گوشت" مطبوعہ ماہنامہ "جاوید" لاہور کا مصنف ہوں جو استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہے مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ افسانہ کسی نکتۂ نظر سے ایسا نہیں ہے۔

فحاشی کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ "ادب" ہرگز ہرگز فحش نہیں ہو سکتا۔ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کو اگر ادب کے دائرے سے باہر کر دیا جائے تو اس کے فحش ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ افسانہ ایک ادیب کی تصنیف ہے جو ادب جدید میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت اس کی تصانیف ہیں اور وہ مضامین ہیں جو قریب قریب ہر ادبی رسالے میں اس کے فن پر شائع ہوئے ہیں۔

اس سے پہلے تین مرتبہ چند افسانوں کے بارے شبہ ہوا تھا کہ وہ فحش ہیں۔ چنانچہ مجھ پر مقدمے چلے۔ سزائیں ہوئیں۔ لیکن اپیل کرنے پر ہر بار سیشن کورٹ میں مجھے اور میرے افسانوں کو فحاشی کے الزام سے بری کیا گیا۔

میرے ایک مقدمے کے سلسلے میں مسٹر ایم۔ آر بھاٹیہ ایڈیشنل سیشن جج کے فیصلے کے یہ الفاظ قابل غور ہیں۔

"قابل غور امر ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے ہیں جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمان چغتائی، مسٹر کے، ایل کپور پروفیسر ڈی اے وی کالج۔ راجندر سنگھ بیدی اور ڈاکٹر آئی لطیف پروفیسر ایف سی کالج جو بطور گواہان صفائی پیش ہوئے ان سب کی رائے ہے کہ مضمون "بو" میں ایسی کوئی چیز نہیں جو شہوانی حسیات پیدا کرے۔ بلکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو کے موڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استغاثے کے گواہ نمبر چار بشیر نے دوران جرح میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر برا اثر نہیں ڈالتا۔

ماتحت عدالت فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیریکٹر نابود ہو رہا ہے۔ ماتحت عدالت کے فاضل جج نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں جن کے لیے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہیئے ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالت فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں ـــــ ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے ـــــ حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے۔ آرٹ جہاں بھی ملے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں سوسائٹی کے لیے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے۔ چاہے اس کا موضوع غیر مستوری کیوں نہ ہو۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے۔ سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مضمون ایسا نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے۔ اس لیے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو واپس کیا جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔"

اس فیصلے سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آرٹ فحش نہیں ہو سکتا اور کسی فن پارے پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی نہیں کی جانی چاہیئے۔

کوئی لٹریری پیس یعنی ادب پارہ معیاری یا غیر معیاری ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ آرٹسٹ ہو سکتا ہے۔ اپنا معیار قائم نہ رکھ سکے افسانہ نگار کا ہر افسانہ اس کا شاہکار نہیں ہو سکتا۔

"ٹھنڈا گوشت" کے اسٹینڈرڈ کے بارے میں کہا نہ جا سکتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ میرے دوسرے افسانوں کے پائے کا نہیں۔ یہ کام ادبی نقادوں کا ہے اور انہیں اس بات کا حق ہے کہ وہ جانچیں، پرکھیں۔ مگر اس افسانے پر کسی صورت میں بھی فحاشی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لیے کہ مصنف کی طرف سے افسانوی ادب میں اچھا برا جیسا بھی ہے۔ وہ ایک اضافہ ہے۔ لیکن وہ اس صورت میں کہ مجھے اپنی پوزیشن صاف کرنا ہے۔ آیئے ہم اس افسانے کو اچھی طرح جانچیں کہ اس میں فحاشی کا کوئی پہلو نکلتا ہے یا نہیں۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت"، جیسا کہ ظاہر ہے کہ ایک افسانہ ہے۔ جس کا عقبی منظر یوں تو گزشتہ فسادات ہیں لیکن دراصل جس کی بنیاد انسانی نفسیات پر قائم ہے اور انسانی نفسیات کا "جنس" سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

افسانے میں دو کردار ہیں۔ ایشر سنگھ اور اس کی داشتہ یا بیوی کلونت کور کا۔ دونوں ٹھیٹ قسم کے گنوار سکھ ہیں۔ دونوں جنسی لحاظ سے بہت تگڑے ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ایشر سنگھ کو جنسی تشفی صرف ایشر سنگھ ایسے مضبوط اور توانا مرد ہی سے مل سکتی تھی۔ دونوں کی جنسی زندگی بڑی ہموار تھی۔ لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے۔ جب کلونت کور محسوس کرتی ہے کہ ایشر سنگھ تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کی جنسی محبت میں پہلی سی توانائی نہیں رہی۔ وہ اس سے بے رخی برت رہا ہے۔ کسی اور عورت سے اس نے ناطہ جوڑ لیا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ سردار ایشر سنگھ ایک زبردست نفسیاتی ردعمل کا شکار تھا۔ جس کے باعث اس کی جنسی توانائی قریب قریب مفلوج ہو چکی تھی۔ وہ لوٹ مار کے دوران میں قتل و غارت کرنے کے بعد ایک نوجوان مسلم دوشیزہ اٹھا لایا تھا کہ تبدیلی کے طور پر وہ اس سے جنسی حظ اٹھائے۔ مگر جب اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ لڑکی دہشت کے مارے اس کے کندھوں پر ہی مر چکی تھی اور اس کے سامنے ایک ٹھنڈی لاش پڑی تھی۔ اس کی تپتی ہوئی شہوانی خواہشات کے سامنے ٹھنڈے گوشت کا لوتھڑا۔ اس کا ایشر سنگھ کو کچھ ایسا زبردست احساس ہوا کہ وہ نفسیاتی طور پر نامرد ہو گیا

اگر ایشر سنگھ کو ٹھنڈی عورتوں سے سابقہ پڑا ہوتا اگر ایشر سنگھ خود ٹھنڈا مرد ہوتا تو اتنا زبردست نفسیاتی ردعمل نہ ہوتا۔ مگر جیسا کہ اس کا کردار پینٹ کیا گیا ہے۔ وہ جنسی لحاظ سے بہت ہی توانا تھا اور اس کا جنسی رشتہ ایک ایسی عورت سے تھا جو ہر لحاظ سے اس کی ہم پلہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر بیان کیے گئے حادثے نے اسے جنسی لحاظ سے بالکل نکما کر دیا۔

یہ بات یہاں قابل غور ہے کہ قتل و غارت نے اور لوٹ مار نے ایشر سنگھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اس نے کئی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ مگر اس کے ضمیر پر احساس کی ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی تھی۔ لیکن جب وہ لڑکی کی ٹھنڈی لاش پر جھکا تو اس کی مردانگی غائب ہو گئی۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے بطن میں جو کچھ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ فحش نہیں۔ عنوان ہی ایک بین ثبوت ہے کہ افسانہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں شہوت کی گرم لہریں نہیں دوڑائے گا۔ جو حادثہ ایشر سنگھ کو پیش آیا وہ کیسے کسی قاری کو شہوانی جذبات کی طرف مائل کر سکتا ہے۔

ایشر سنگھ کا انداز گفتگو اس کا اپنا ہے۔ ہزاروں آدمی عام روزمرہ کی زندگی میں وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو مصنف نے اس کے منہ سے کہلوائے ہیں۔ اس کی حرکات غیر فطری نہیں۔ اسی طرح کلونت کور کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔

استغاثہ کے فاضل وکیل نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ ایشر سنگھ کے مکالموں میں گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ یہاں گالی کی نفسیات پر بحث نہیں کروں گا مگر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ الفاظ جو استغاثے کے وکیل کے نزدیک گالی ہیں۔ اصل میں گالی نہیں ہیں میں یہاں گالی کی ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب مرزا شہاب الدین خاں صاحب کے نام ایک رقعے

میں لکھتے ہیں۔

"یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں۔ خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیئے ہیں۔ اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ (اردوئے معلیٰ۔ صفحہ ۲۱۷)

مرزا شہاب الدین کے نام ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے۔

"میاں وہ قاضی مسخرہ تو چوتیا ہے۔" (اردوئے معلیٰ، صفحہ ۲۱۸)

گالی کے یہ نمونے تو ہو گئے۔ لیکن اگر کوئی شخص گفتگو کے دوران میں یہ کہے "میں بھی عجیب چوتیا ہوں کہ آپ یہاں اور میں آپ کو لاہور ڈھونڈتا پھرا۔" تو ظاہر ہے لفظ "چوتیا" گالی نہیں "سالا" ہمارے یہاں بہت بڑی گالی متصور کی جاتی ہے۔ لیکن بمبئی میں لفظ "سالا" کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ عام گفتگو میں آپ کو وہاں ایسے کئی فقرے سننے میں آئیں گے۔

"ہمارا باپ سالا بڑا اچھا آدمی تھا"

"سالا ہم سے مسٹیک ہو گیا۔"

"سالا کیسی بات کرتا ہے۔"

ماں بہن کی گالی یو۔پی اور پنجاب میں گفتگو میں عام استعمال ہوتی ہے اور کسی کے کان کھڑے نہیں ہوتے۔ خاص گالی اکثر لوگوں کا تکیہ کلام بن جاتی ہے۔ ایشر سنگھ بھی چند گالیوں کو تکیہ کلام کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے۔ اس لیے استغاثے کے فاضل وکیل کا اس نکتے پر زور دینا بالکل بے کار ہے۔

اس کے علاوہ یہ اہم بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ایشر سنگھ جیسے اجڈ اور گنوار آدمی سے شائستہ کلامی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے اس کے منہ میں اگر مصنف نے مہذب اور شائستہ الفاظ ڈالے ہوتے تو افسانے میں حقیقت نگاری کا خاتمہ ہو جاتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ افسانہ ایک نہایت ہی بھونڈی شکل اختیار کر لیتا اور آرٹ کی سطح سے بہت ہی نیچے خرافات کے کھڈ میں جا گرتا۔

سوال ہے جو چیز جیسی ہے۔ اسے من وعن کیوں نہ پیش کیا جائے۔ ٹاٹ کو اطلس کیوں بنایا جائے۔ غلاظت کے ڈھیر کو عود و عنبر کے انبار میں کیوں تبدیل کیا جائے ـــــ حقیقت سے انحراف کیا ہمیں بہتر انسان بنانے میں ممد و معاون ہو سکتا ہے ـــــ ہرگز نہیں ـــــ پھر ایشر سنگھ کے کردار اور اس کی گفتار پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے۔

ایشر سنگھ گندہ ذہن سہی۔ افسانے کا موضوع گھناؤنا سہی۔ لیکن کیا اس کو پڑھنے کے بعد ہمیں انسانیت کی وہ رمق دکھائی نہیں دیتی جو ایشر سنگھ کے سیاہ قلب میں خود اس کا مکروہ فعل پیدا کرتا ہے اور یہ ایک صحت مند چیز ہے کہ اس افسانے کا مصنف انسانوں اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔ اگر مصنف نے ایشر سنگھ کے دل و دماغ پر نفسیاتی رد عمل پیدا نہ کیا ہوتا تو یقیناً "ٹھنڈا گوشت" ایک نہایت ہی مہمل چیز ہوتی۔

مجھے افسوس ہے کہ وہ تحریر جو انسانوں کو بتاتی ہے کہ وہ انسان سے حیوان بن کر بھی انسانیت سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ فحش اور شہوت کو ابھارنے والی سمجھی جا رہی ہے اور یہ لطیفہ ہے کہ افسانے میں ایک انسان کو اس کی رہی سہی انسانیت ایک بہت بڑی سزا دیتی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ایشر سنگھ کو اپنی چری ہوئی گردن کا بالکل احساس نہیں تھا۔ اس کو آخری سانس تک صرف ایک ہی بات ستاتی رہی ـــــ کہ وہ ایک ٹھنڈی لاش سے زنا کرنے والا تھا۔

فرانس میں مشہور ناول نگار فلابیئر کی تصنیف "مادام بوداری" پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلا تو وکیل صفائی موسیو سینار نے فاضلانہ بحث کے دوران میں کہا۔

"حضرات! یہ کتاب جو بقول وکیل استغاثہ شہوانی جذبات کو بھڑکاتی ہے۔ موسیو فلابیئر کے وسیع مطالعے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس نے اپنی توجہ متین فطرت کی وساطت سے ایسے ہی متین اور ملول مضامین کی طرف منعطف کی ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں جس کے خلاف وکیل استغاثہ نے ہیجان خیز تصویروں کی نقاشی کے الزام میں جگہ جگہ اپنی تقریر میں زہر اگلا ہے ـــ میں پھر دہراتا ہوں کہ فلابیئر کی فطرت میں بے انتہا عگینی، شدید سنجیدگی اور بے پناہ ملال بھرا پڑا ہے۔"

میں اپنے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں۔ اتفاق سے میرا پیشہ تصنیف و تالیف ہے۔ اپنی فطرت اور جو تعلیم و تربیت مجھے ملی ہے۔ اس کی بدولت میں نے آج تک سستا اور سوقیانہ ادب پیش نہیں کیا اردو کے جدید ادب سے جو ذرا سا بھی واسطہ رکھتے ہیں۔ ان کو میرے ادبی مقام کا علم ہے۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں فلابیئر کی فطرت کی بے انتہا عگینی اور شدید سنجیدگی شاید نہ ہو۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بے پناہ ملال سے بھرا پڑا ہے اور جب سوال ملال کا ہو تو شہوت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اب افسانے کو اس پہلو سے بھی دیکھا جائے کہ مصنف کی نیت کیا ہے۔ رائے صاحب لالہ سنت رام کی عدالت میں اپنے افسانے "دھواں" کے سلسلے میں صفائی کا بیان دیتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

"تحریر و تقریر میں، شعر و شاعری میں، سنگسازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیئے اگر یہ ترغیب موجود ہے۔ اگر اس کا ایک شائبہ بھی نظر آرہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر، وہ بت قطعی طور پر فحش ہے۔"

ظاہر ہے کہ ایسی کوئی ترغیب زیر بحث افسانے میں نہیں۔ میں افسانے کا تجزیہ اوپر کر چکا ہوں جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مصنف کی نیت میں کوئی فرق نہیں تھا اور اس نے محض ایک نفسیاتی حقیقت کو اس کے صحیح روپ میں افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر اگر کسی صاحب کے جذبات برانگیختہ ہوں تو انہیں کسی ذہنی معالج سے رجوع کرنا چاہیئے۔ افسانہ "دھواں" ہی کی صفائی کے سلسلے میں میں نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

ایک مریض جسم۔ ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں۔ اصل میں انہیں کے لیے شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔

"میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لیے ہیں۔ نورمل انسانوں کے لیے جو عورت کے سینے کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے جو عورت اور مرد کے رشتے کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے۔" افسانہ "ٹھنڈا گوشت" بھی دوسرے ادب پاروں کی طرح صحت مند دماغوں کے لیے ہے۔ ایسے دماغوں کے لیے نہیں ہے جو معصوم اور پاکیزہ چیزوں میں بھی شہوت کریدلیتے ہیں اگر کوئی عورت لوہے کی مشین کی حرکت سے شہوانی لذت حاصل کر لیتی ہے تو کیا اس لوہے کی مشین یا اس کی حرکت پر سفلی جذبات برانگیختہ کرنے کا الزام دھرا جائے گا۔ دنیا میں تو ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے بھی شہوانی لذت حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کا علاج ہونا چاہیئے۔

امریکہ میں مشہور مصنف جیمز جوئیس کی تصنیف "یولی سیز" کو فحاشی سے بری کرتے ہوئے جج وولز لے نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

"ایک خاص کتاب ایسے جذبات اور خیالات پیدا کر سکتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ عدالت کی رائے کے ذریعے یہ دیکھ کر ہوگا، کہ اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ایسے آدمی پر جسے فرانسیسی معمولی قسم کی حیات رکھنے والا انسان کہتے ہیں اور جس کی حیثیت قانون تفتیش کی اس شاخ میں ایک فرضی عامل کی ہوتی ہے۔ جیسے عدالت خفیفہ کے مقدموں میں "سمجھ بوجھ والے آدمی" کی حیثیت ہوتی ہے یا رجسٹری کے قانون میں ایجاد کے جملے کے متعلق "فن کے ماہرہ" کی۔ "قانون کا تعلق صرف اوسط درجے کے آدمی سے ہے۔ چنانچہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے متعلق کوئی فیصلہ مرتب کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے مطالعے سے ایک اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔

مشہور امریکی ناول نگار ارسکائن کیلڈول کی تصنیف "گوڈز لٹل ایکڑ" کو فحاشی کے الزام سے بری کرتے ہوئے عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

"مصنف کا مقصد ایک سچی تصویر پینٹ کرنا تھا۔ ایسی تصویروں میں بعض ضروری تفصیلوں کا آجانا لابدی امر ہے اور چونکہ ایسی سیلوں کا گہرا تعلق زندگی کے جنسی پہلو سے ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں بےباکانہ صاف گوئی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے عدالت یہ حکم صادر نہیں کر سکتی کہ ایسی تصویریں سرے سے بنائی ہی نہ جائیں۔ کرداروں کی زبان بلاشبہ بھدی اور گندی ہے۔ مگر عدالت مصنف سے ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔"

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" ایک سچی تصویر ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ بڑی ہی بےباکانہ صاف گوئی سے اس میں نفسیاتی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اگر اس میں کہیں گندگی اور غلاظت ہے تو اسے مصنف کے ساتھ نہیں بلکہ افسانے کے کرداروں کی ذہنی سطح کے ساتھ منسوب کرنا چاہیئے۔

کسی تحریر کے چند الفاظ اگر چھپے سے اٹھا کر لوگوں کو دکھائے جائیں کہ فحش ہیں تو اس سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوگا ــــــ ان الفاظ کی جداگانہ اشاعت قابل گرفت ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے غالب، ہیمر، ارسٹوفین، چاسر، بوکشیو، بلکہ کتاب مقدس تک کے بعض مقامات کو قابل تعزیر گردانا جا سکتا ہے۔ تاہم کسی تحریر کو سمجھنے کے لیے اسے مجموعی طور سے ہی دیکھنا پڑے گا۔

مجھے آخر میں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ استغاثے کی طرف سے میری تصنیف "ٹھنڈا گوشت" پر کوئی ادبی تنقید نہیں ہوئی، اگر ایسا ہوتا۔ تو مجھے دلی مسرت ہوتی، افسانے میں اگر کوئی فنی کمزوری رہ گئی تھی۔ بیان میں اگر کوئی سقم تھا۔ انشاء میں اگر کوئی خامی تھی تو مجھے اس کا علم ہو جاتا اور میں کچھ حاصل کرتا۔ لیکن میں یہاں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں، اور ایک نہایت ہی گھناؤنے الزام کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ میں نے اپنی تصنیف کے ذریعے سے لوگوں کے شہوانی جذبات ابھارے ہیں ــــــ اس کے خلاف میرے دل سے احتجاج کے سوا اور کیا چیز نکل سکتی ہے۔

حیرت ہے کہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر قاری کا ذہن خوف و نفرت میں ملفوف ہونے کے بجائے شہوت سے ملوث کیسے ہو سکتا ہے۔

اور ابھی حیرت ہے کہ ایشر سنگھ کو جو ہولناک سزا ملی وہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں شہوانی جذبات کیسے بیدار کر سکتی ہے۔

سولہ جنوری آن پہنچی۔ شیخ سلیم بہت پریشان تھا۔ اس پریشانی کے باعث اس نے زیادہ پینا شروع کر دیا۔ نصیر انور حسب معمول بے پرواہ تھا۔ عزیزی عارف عبدالمتین کا حلق پہلے سے زیادہ خشک ہو گیا تھا۔

سولہ جنوری کی صبح کو پانچ سو روپے جیب میں ڈال کر میں ضلع کچہری روانہ ہوا۔ شیخ سلیم پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ صبح سے پی رہا تھا۔ بوتل پتلون کی جیب میں تھی۔ خود بہت مضطرب تھا۔ لیکن بار بار مجھے تسلی دیتا تھا۔ بھائی جان۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں یہ سن کر مسکرا دیتا۔

اتنے میں نصیر انور اور عارف عبدالمتین بھی آ گئے۔ عارف نے مجھ سے بڑے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”منٹو صاحب۔ آپ کا کیا خیال ہے کیا ہوگا۔ میں نے جواب دیا، وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔

مجسٹریٹ صاحب آ چکے تھے۔ مگر فیصلہ سنانے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ گیارہ بج گئے۔ بارہ بج گئے۔ پانی پی پی کر ہمارے پیٹ ابھر گئے۔ مگر آواز نہ پڑی۔ اتنے میں میرے ایک مخبر نے مجھے بتایا کہ فیصلہ تیار ہے۔ مگر میاں اے۔ ایم سعید اس میں شاید کچھ ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پتہ چلا کہ میاں صاحب غائب ہیں۔ یعنی اپنے کمرے میں موجود نہیں اور یہ کہ انہوں نے صبح سے کسی مقدمے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ایک صاحب نے یہ کہا کہ وہ بہت پریشان ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ تھوڑی دیر کے بعد مخبر پکی خبر لایا۔ ایک طرف لے جا کر اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔ ”میں فیصلہ دیکھ آیا ہوں —— جلدی جلدی میں نے دیکھا ہے۔ صرف چند آخری سطریں۔ آپ کو بتایا سزا ہوگی اور جرمانہ بھی —— آپ کے نام کے آگے یہ لکھا تھا AND SENTENCE HIM TO UNDERGO اس کے آگے جگہ خالی تھی۔ دوسرے ملزموں کو صرف جرمانہ ہوگا۔ میں جاتا ہوں اور ضامن کا بندوبست کرتا ہوں۔

میں سوچنے لگا سزا کتنی ہوگی۔ ایک ماہ کی۔ دو ماہ کی یا چند دنوں کی؟ میں نے کسی سے بات نہ کی۔ البتہ شیخ خورشید صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ آپ نے فوراً ضمانت کے کاغذ تیار کر لیے اور مجھ سے کہا۔ گھبرائیے نہیں منٹو صاحب۔ سزا زیادہ سے زیادہ دس بارہ یوم کی ہوگی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر تشویشناک لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایسا نہ ہو وہ ضمانت لینے سے انکار کر دے۔

یہ سن کر مجھے بہت تشویش ہوئی۔ کیونکہ مجسٹریٹ صاحب کا رویہ شروع ہی سے مخاصمانہ رہا تھا۔ لیکن کچھ کہا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔ خاموش دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے شیخ سلیم کو ساری بات بتا دی۔ میرے جی کا بوجھ تو کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ مگر شیخ بیچارہ اور وہ مضطرب ہو گیا لیکن تسلی دینے کی خاطر مجھ سے کہا کچھ فکر نہ کرو بھائی جان —— میں ٹیکسی لے کر وہاں جیل پہنچوں گا —— روپیہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں ایسے معاملے نبیڑنا جانتا ہوں —— میرا خیال ہے۔ آپ اس وقت ایک بڑا پیگ لگا لیجیے۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں شیخ صاحب —— شام کو۔

شیخ صاحب نے کہا۔ ”تو آپ مطمئن رہیں، میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا

یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی —— ایک بج چکا تھا۔ شیخ سلیم، نصیر انور اور میں نے گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کے سامنے گھاس کے میدان میں بیٹھ کر دو آلو چھولے، کھائے۔ اور اس خیال سے کہ کہیں آواز نہ پڑ جائے جلدی لوٹ آئے اور فیصلے کا انتظار کرنے لگے نصیر انور اور عارف عبدالمتین سے میں نے اشارتاً کئی بار کہہ دیا تھا کہ وہ جرمانے کا بندوبست کر لیں تاکہ عین وقت پر پریشانی کا سامنا

نہ کرنا پڑے ــــ شیخ سلیم پی پی کر یہیں سوچ رہا تھا کہ وہ جیل میں مجھ تک کیسے پہنچے گا۔ اور میری آسائش کا بندوبست کن ذرائع سے کرے گا۔

عزیزی مشتاق احمد اپنے ایک دولت مند دوست شریف صاحب کو میری ضمانت دینے کے لیے پکڑ لائے تھے۔ یہ غریب بھی ہماری طرح کھڑے بور ہو رہے تھے۔ شیخ سلیم صاحب کو غصہ تھا کہ جب وہ موجود ہے تو کوئی ضمانت دینے کے لیے کیوں لایا گیا۔ میں نے ان سے کہا۔ "شیخ صاحب اگر آپ کو ضمانت دینے کا شوق ہے تو دو ملزم اور موجود ہیں۔ شیخ صاحب اس وقت اچھے موڈ میں تھے۔ میری بات سن کر مسکرا دیئے اور ایک پیگ اور چڑھا کر اسکیمیں سوچنے میں محو ہو گئے۔ ان کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ منٹو کی شام خراب ہو جائے گی۔

پانچ بج گئے۔ تشویش اور تردد بڑھتا گیا۔ نصیر بالکل بے پرواہ تھا جیسے کچھ ہونے والا نہیں۔ اس کی یہ بے پرواہی قابل رشک تھی۔ عارف عبدالمتین کا حلق اب اتنا خشک ہو چکا تھا کہ اس نے بولنا بند کر دیا تھا ــــ ساڑھے پانچ ہوئے تو ہمیں بلایا گیا۔ فوراً شیخ خورشید صاحب کو اطلاع دی گئی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے، ہم سب حاضر عدالت ہوئے۔

میاں اے ایم۔ سعید دانتوں تلے قلم دبائے، سامنے میز پر فیصلے کے کاغذ رکھے سوچ میں غرق بیٹھے تھے۔ شیخ خورشید کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بے حد مضطرب ہیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شیخ سلیم کا رنگ زرد تھا۔ عارف عبدالمتین بار بار ہونٹوں پر خشک زبان پھیر رہا تھا۔ ــــ نصیر انور اسی طرح بے پرواہ تھا۔

پریس رپورٹر موجود تھے۔ کاغذ پنسل ہاتھ میں لیے وہ بڑی بے چینی سے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ چند لمحات مکمل سکوت طاری تھا۔ اس کے بعد میاں اے ایم سعید صاحب کھنکارے۔ دانتوں کی گرفت سے قلم آزاد کیا۔ نب کو روشنائی دکھائی۔ فیصلے کے کاغذ الٹ پلٹ کیے اور بہت سوچ سوچ کر ایک کاغذ پر خالی جگہیں پُر کیں۔ اس کے بعد میرے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا ــــ تین مہینے قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانہ ــــ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم مزید قید بامشقت ــــ شیخ سلیم کا رنگ اور زیادہ زرد ہو گیا۔ اس نے نگاہوں ہی میں مجھے تسلی دی گویا یہ کہہ رہا ہے۔ کچھ فکر نہ کرو۔ میں جیل میں ضرور پہنچوں گا۔

میں یہ سوچنے لگا تھا کہ مجسٹریٹ ضمانت قبول کرے گا یا نہیں ــــ تھوڑے وقفے کے بعد میاں اے ایم سعید نے دوسری خالی جگہیں پُر کیں اور بقایا دو ملزمین کے بارے میں فیصلہ سنایا ــــ تین تین سو روپے جرمانہ ــــ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم قید بامشقت۔

میں نے جرمانہ داخل کر دیا۔ شیخ خورشید صاحب نے میری ضمانت کے کاغذ پیش کیے تو میاں اے ایم سعید نے کہا۔ میں اگر ضمانت منظور کرتا ہوں۔ تو سزا کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے

شیخ خورشید صاحب نے یہ استدلال پیش کیا۔ "آپ کا ارشاد درست ہے۔ ملزم نے جرمانہ ادا کر دیا ہے۔ جو اپیل ہونے کی صورت میں یقیناً واپس مل جائے گا۔ لیکن وہ تین دن جو ضمانت ہونے سے پہلے میرا مؤکل جیل میں کاٹے گا۔ اپیل منظور ہونے پر کیا اسے واپس مل جائیں گے

استدلال بہت معقول تھا۔ مگر پھر بھی میاں اے ایم سعید کچھ دیر اڑے رہے۔ آخر میں کرم فرمائی کی اور میری ضمانت قبول کر لی۔

عارف عبدالمتین کے والد صاحب نے ان کا جرمانہ ادا کیا۔ اب رہ گئے نصیر انور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بڑی بے پرواہی سے کہا میرے پاس فی الحال کچھ بھی نہیں ہے۔ مجسٹریٹ صاحب نے حکم دیا کہ ہتھکڑی لگاؤ اور جیل بھیج دو۔ نصیر انور اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔

میرے پاس دو سو روپے موجود تھے۔ چودھری نذیر مالک نیا ادارہ سے میں نے کہا کہ ایک سو روپے کا بندوبست کر دیں۔ مگر ان سے نہ ہو سکا۔ سپاہی ہتھکڑیاں لیے نصیر کی بیٹھ پیچھے کھڑا تھا۔ ان کی چھنکار عدالت کے کمرے میں گونج رہی تھی۔ باہر پولیس وین تھی۔ یعنی سارے لوازمات موجود تھے۔

آخر خورشید صاحب ہی کام آئے۔ آپ نے میاں اے ایم سعید صاحب سے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں درخواست کی کہ وہ نصیر انور کی ضمانت لے لیں۔ جرمانے کا روپیہ کل صبح تک داخل کر دیں گے۔ مجسٹریٹ صاحب نے یہ درخواست قبول کر لی۔ اب ضامن کا سوال تھا۔ شیخ خورشید صاحب نے پوچھا "ان کی ضمانت کون دے گا۔"

کوئی آگے نہ بڑھا۔ اچانک شیخ سلیم نے جواب تک نشے میں دھت ہو چکے تھے۔ شیخ خورشید صاحب سے مخمور لہجے میں کہا نصیر صاحب کی ضمانت میں دیتا ہوں۔" میرا دل دھڑکنے لگا۔ اگر عدالت کو معلوم ہو گیا کہ شیخ صاحب پیے ہوئے ہیں تو ان کی ضمانت کون دے گا ــــ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور دھر لیے جائیں گے اور سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا ــــ میں اسی خوف کے مارے کمرے سے باہر چلا گیا۔ بار بار اندر جھانک کر دیکھتا کہ شیخ سلیم گرفتار ہوئے ہیں یا کہ نہیں، لیکن خیریت گزری۔

نصیر انور کی ضمانت ہو گئی ــــ شیخ صاحب جھومتے ہوئے باہر نکلے اور مجھے گلے لگا کر رونے لگے۔ اللہ میاں نے میرے بھائی کو بچا لیا۔ یہ کہہ کر آپ نے جیب سے بوتل نکال کر ایک گھونٹ بھرا جو کہ آخری تھا۔ جلدی چلیں کہیں دکان بند نہ ہو جائے۔

نصیر انور بہت ممنون و متشکر تھا۔ بار بار شیخ سلیم کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ شیخ صاحب نے اس سے کہا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ آپ میرے دوست کے دوست ہیں۔

اب سیشن میں اپیل دائر کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ میاں اے ایم سعید صاحب کے فیصلے کی نقل حاصل کرنے کے لیے درخواست دی۔ جب نہ ملی تو درخواست کے ساتھ نو "پہیئے" لگائے ــــ نقل مل گئی۔

میاں صاحب کا فیصلہ انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اس کا اردو ترجمہ درج ہے۔

فیصلہ: ایک اردو رسالہ بہ نام "جاوید" کے ایڈیٹر عارف عبدالمتین اور اس کے پبلشر انور کو معہ ایک مصنف مسمی سعادت حسن منٹو کے میرے پاس مقدمہ زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ موخر الذکر ملزم کے خلاف یہ الزام ہے کہ وہ ایک فحش کہانی جس کا عنوان "ٹھنڈا گوشت" ہے کا مصنف ہے اور جو مذکورہ بالا رسالہ کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ دوسرے دو ملزموں کے خلاف یہ الزام ہے کہ انہوں نے اس کہانی کو مندرجہ بالا انداز میں شائع کرنے کا جرم کیا ہے۔

رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ سید ضیاء الدین مترجم پریس برانچ حکومت پنجاب کے علم میں آیا ہے جو اس مقدمہ میں گواہ استغاثہ نمبر ۳ کی حیثیت سے پیش ہوا ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی بھی طبع شدہ چیز میں کوئی فحش مواد محسوس کرے تو اس سے حکومت پنجاب کو مطلع کرے۔ اس کے خیال میں مذکورہ بالا ایڈیشن میں شائع شدہ کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" فحش تھی۔ چنانچہ اس نے حکومت پنجاب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور اس غرض کے لیے قانونی کارروائی کے لیے کہا۔

اس کہانی کی تصنیف اور خاص نمبر میں اس کی اشاعت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ پہلے دونوں ملزم رسالے کے مدیر اور ناشر ہونے سے منکر ہیں۔ لہٰذا اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" فحش ہے یا نہیں۔

استغاثے نے مذکورہ رسالے کے خاص نمبر کو پیش کیا ہے جو ریکارڈ میں (P.۴۰×۴) کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے. کہانی جو اس قانونی چارہ جوئی کا موضوع ہے. اس شمارے کے صفحہ ۸۸ سے ۹۳ تک چھپی ہے. میں نے نہایت غور سے اس کہانی کو پڑھا جو موضوع کی تشکیل کرتی ہے اور دیکھا کہ اس میں گندہ طرز بیان اور ناشائستہ گالیاں استعمال کی گئی ہیں. میں نے یہ بھی محسوس کیا. اس کہانی میں کئی شہوت پرستانہ مقامات پیش کئے گئے ہیں اور جنسی اشارات کا اکثر ذکر کیا گیا ہے.

یہ طے کرنے کے لیے کہ آیا کوئی تصنیف مثلاً زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں، ضروری ہے کہ ایک معیار مقرر کیا جائے جس سے فحاشی کی تمیز کی جا سکے.

۳ کیو. بی (۱۸۶۸ء) میں ہکلن رپورٹ میں اسی موضوع کے ایک مشہور مقدمے میں لارڈ کوک بورن جج نے صفحہ نمبر ۳۶۰ پر (یا صفحہ ۳۷۱) پر فحاشی کا یہ معیار مقرر کیا تھا. اس قسم کا الزام زدہ مواد جو ان لوگوں کو بد اخلاقی اور بد چلنی کی ترغیب دے. جن کے اذہان اس قسم کے مخرب اخلاق اثرات قبول کر سکتے ہوں اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کا مواد پہنچ سکتا ہو. معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمام عدالت ہائے عالیہ ہمیشہ اس معیار کی تقلید کرتی رہی ہیں. اس معیار سے یہ ظاہر ہے کہ قانون میں مستعملہ عریانی اس ماحول سے متعلق ہے. جس میں کہ یہ جانچی جاتی ہے. وہ باتیں جو ایک پاکستانی کے اخلاق کے لیے ضرر رساں خیال کی جائیں جہاں تک ایک فرانسیسی کا تعلق ہے بالکل بے ضرر سمجھی جا سکتی ہے. ہر سوسائٹی کے اپنے اخلاقی معیار ہوتے ہیں اور وہ چیزیں جو ایک سوسائٹی کا اخلاقی قوام خیال کی جاتی ہیں. بعض اوقات اسی دوسری سوسائٹی کے معیار کے مطابق غیر اخلاقی ہو سکتی ہیں. اسی طرح اظہار کے بعض اسالیب کا اثر مختلف سوسائٹیوں کے افراد پر مختلف ہوتا ہے. خواہ یہ اظہار مخالف معیاروں کے نزدیک غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو. اس لیے زیر بحث کہانی کے فحش یا غیر فحش ہونے کا فیصلہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیاروں کے پس منظر پر کرنا ہوگا اور اس اثر کے مطابق جو اس قسم کی تحریر اس سوسائٹی میں رہنے والے لوگوں کے اذہان پر ڈالے گی. لارڈ کوک برن کا قائم کردہ معیار ایک مکمل اور جامع تعریف نہیں ہے. یہ جیسا کہ اسکا مفہوم ظاہر کرتا ہے. صرف ایک معیار ہے. اس کے علاوہ کچھ اور بھی معیار ہو سکتے ہیں. ان میں سے ایک وہ رجحان ہے (یہ الزام زدہ مواد میں موجود ہے) جو قارئین کے اخلاقی احساسات کو ٹھیس پہنچاتا ہے. یہ معیار بھی قارئین کے اخلاق پر منحصر ہے.

استغاثہ نے ابتدا میں صرف پانچ گواہ پیش کئے اور اپنا کیس بند کر دیا.

گواہ استغاثہ ۱ مسٹر محمد یعقوب منیجر کپور پرنٹنگ پریس (۲) شیخ محمد طفیل. مرزا محمد اسلم. گواہ استغاثہ نمبر ۵ خدا بخش نے ان امور کے متعلق شہادت دی. جن کا فحاشی سے کوئی تعلق نہیں. گواہ استغاثہ نمبر ۳ سید ضیاء الدین نے دوسرے امور بیان کرنے کے علاوہ اپنی رائے ظاہر کی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے. تاہم ریکارڈ میں کوئی اس قسم کا مواد نہیں جن سے ظاہر ہو کہ یہ گواہ ماہر ادب سمجھا جا سکتا ہے. میرے خیال میں قانون شہادت کی دفعہ نمبر ۴۵ کی رو سے اس کی شہادت قابل قبول نہیں ہے. اس لیے جہاں تک فحاشی کے مسئلے کا تعلق ہے استغاثے کا کیس جیسا کہ ابتداً پیش کیا گیا. خود عدالت کی رائے اور الزام زدہ مواد کے مطالعہ کے بعد اس کی ماہیت پر منحصر ہو گیا.

ملزمین نے صفائی میں سات گواہ ادبی امور کے ماہرین کی حیثیت سے پیش کئے. ان گواہوں کی شہادت سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ زیر بحث تحریر فحش نہیں ہے. صفائی کے اختتام پر استغاثے نے درخواست کی کہ مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر کچھ اور ماہرین بطور عدالتی گواہ بلائے جائیں اور میں نے انصاف کی خاطر چار اور ماہروں کو بطور عدالتی گواہ بلوایا.

بشیتر ماہرین نے خواہ وہ صفائی کی طرف سے پیش ہوئے یا عدالت کی طرف سے کسی نہ کسی فریق کے حق میں رائے دی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ تعزیرات میں جو فحاشی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ اس کی ٹیکنیکل اہمیت ہے۔ جس کا تعین عدالت کو کرنا ہے۔ ماہرین کی شہادت اسی حد تک ضروری ہے۔ جہاں تک یہ ادب کے مروجہ معیاروں، اظہار کی شگی، سوقیانہ پن اخلاقی یا غیر اخلاقی حیثیت اور رجحان کے متعلق جو کوئی تحریر قارئین کے اذہان پر اثر انداز ہو روشنی ڈالتی ہے۔ ان امور سے یہ تعین کرنا عدالت کا کام ہے کہ کوئی چیز "فحاشی" کی شرائط کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

صفائی کے گواہ نمبر ا مسٹر عابد علی عابد نمبر ۲ مسٹر احمد سعید نمبر ۳، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نمبر ۴ ڈاکٹر سعید اللہ نمبر ۵، فیض احمد فیض نمبر ۶ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نمبر ۷ ڈاکٹر آئی لطیف سب صاحب علم ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق کیونکہ آرٹ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اس لیے فنکار کوئی ایسی چیز جو زندگی کی سچی تصویر ہو۔ حقیقت پسندانہ طور پر پیش کرنے سے اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتا۔ اس لیے وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار فحش نہیں ہو سکتا۔ وہ زیر بحث کہانی کی غیر شائستہ زبان اور اس کے سوقیانہ محاوروں کو بھی قابل گرفت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ اس قسم کی گفتگو کی نمائندگی کرتے ہیں جو پیش کردہ کردار کے نوع کے لوگ بولتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث کہانی میں گواہ نمبر ا مولانا تاجور نمبر ۲ آغا شورش کاشمیری نمبر ۳ مولانا ابو سعید بزمی نمبر ۴ ڈاکٹر تاثیر بھی اسی پائے کے علمی آدمی ہیں۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ زیر بحث کہانی "برا ادب" ہے۔ اور غیر شائستگی سے پیش کی گئی ہے

صفائی کے گواہ نمبر ۷ ڈاکٹر آئی لطیف نے رائے ظاہر کی کہ اگر زیر بحث کہانی کسی میڈیکل جریدے میں شائع ہوتی تو یہ ایک سبق آموز کیس ہسٹری ہوتی۔ لیکن ایک مقبول عام رسالے میں جسے ہر شخص پڑھ سکتا ہے، ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔

صفائی کے گواہ نمبر ۵ کرنل فیض احمد فیض کا خیال ہے کہ اگرچہ وہ اسے فحش نہیں کہہ سکتے۔ تاہم یہ کہانی ادب کا کوئی اچھا نمونہ نہیں۔ اس میں بعض غیر شائستہ محاورے استعمال کیے گئے ہیں۔ جن سے اجتناب کیا جا سکتا تھا۔

عدالتی گواہ نمبر ا مولانا تاجور نے اس کی سخت اور غیر مبہم الفاظ میں مذمت کی اور کہا کہ انہوں نے اپنے چالیس سالہ ادبی تجربہ میں اس سے زیادہ کوئی چیز غیر شائستہ نہیں دیکھی۔ عدالتی گواہ نمبر ۴ ڈاکٹر تاثیر کی رائے ہے کہ اس میں ان لوگوں کا اخلاق بگاڑنے کا رجحان موجود ہے جو شہوانی حرص کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے حوالے سے بہت صحیح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غیر شائستگی اور شہوانیت نفس پرستی اور سوقیانہ پن زندگی میں موجود ہے۔ اگر ادبی مذاق کے اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے جسے صفائی کے گواہوں نے بیان کیا ہے تو زندگی کے پہلوؤں کا حقیقت نگارانہ اظہار اچھا ادب ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ہمارے معاشرے کے اخلاقی معیار کی خلاف ورزی کرے گا۔ ملزم سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی کہانی ایک سوقیانہ آدمی کے کردار کو پیش کرتی ہے جو اپنی معشوقہ سے جسے بہت شہوت پرست دکھایا گیا ہے۔ وحشیانہ اور سوقیانہ انداز سے جنسی فعل کا طالب ہوتا ہے۔ جنسی تضمین کے ساتھ غیر شائستہ گالیوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ جنسی نوع کے افعال کے سلسلے میں نسوانی جسم کے بعض پوشیدہ اعضاء کا ذکر نہایت بدتہذیبی سے کیا گیا ہے۔ ساری کہانی ایک ناشائستہ جنسی معاملے پر مرکوز ہے۔ درحقیقت جنسی بدتہذیبی ہی اس کہانی کا بنیادی تصور ہے۔

ادبی اور نفسیاتی ماہر کہانی کا ایک خاص انداز سے رد عمل قبول کر سکتے ہیں۔ تاہم میری رائے میں ایک الہڑ نابالغ پر اس قسم کی کہانی

کا ردعمل، اظہار، بول چال اور خیالات میں غیر شائستگی کی حوصلہ افزائی کی صورت میں ہوگا۔

سعادت حسن منٹو جیسے بزعم خود مشہور مصنف کی مثال پیش نظر رکھتے ہوئے وہ نوجوان جو اس کہانی کو پڑھیں گے۔ اسی طرح سے غیر شائستگی کو تقویت دیں گے۔

کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ اس میں قارئین کا اخلاق بگاڑنے کا میلان موجود ہے اور یہ ہمارے ملک کے مروجہ اخلاقی معیاروں کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

اس لیے میں ملزم سعادت حسن منٹو کو ایک فحش تحریر پیش کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہوں۔ اور اسے زیر دفعہ ۲۹۲ پی۔ پی۔ سی تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانہ کی سزا دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اس کو مزید ۲۱ یوم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور جو واضح طور پر جریدے کے مدیر اور ناشر ہیں جس میں مذکورہ کہانی شائع ہوئی ہے۔ ایک فحش تصنیف کی اشاعت عام کے مجرم ہیں اور وہ بھی اسی دفعہ کے تحت آتے ہیں۔ تاہم ان کے معاملے میں ان کی کم عمری کے پیش نظر اور پھر یہ کہ کہانی کا مصنف ایک ایسا شخص تھا جو خاصی ادبی شہرت کا مالک ہے۔ انہوں نے اس اعتماد کی وجہ سے کہانی قبول کر لی ہوگی کہ یہ قابل قبول ادب پارہ ہوگا۔ میں ان ہر دو ملزموں کے لیے تین تین سو روپیہ جرمانے کی نرم سزا تجویز کرتا ہوں۔ چونکہ یہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے گی۔ اس لیے میں اس کے مطابق حکم دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور کو اکیس یوم قید بامشقت بھگتنی پڑے گی۔

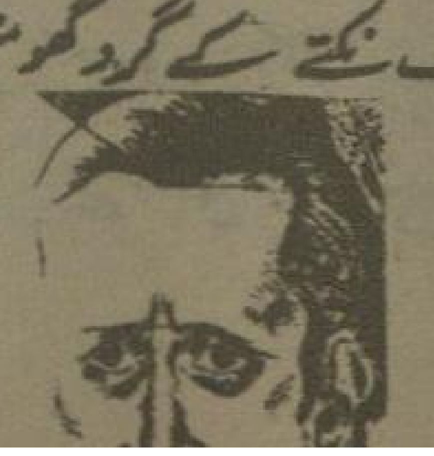
دستخط اے۔ ایم سعید مجسٹریٹ درجہ اول لاہور

۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء کو سیشن میں اپیل دائر کر دی گئی۔ تاریخ ملنے پر ہم مہر الحق صاحب سیشن جج لاہور کی عدالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے اس بناء پر کہ وہ مجھے اور میرے خاندان کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور ہم شہر (یعنی امرتسر کے) تھے۔ مقدمہ مسٹر جوشوا ایڈیشنل جج کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ دوسری پیشی پر حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ مسٹر جوشوا نے کیس واپس مہر الحق صاحب کو بھیج دیا ہے۔ یہ عذر ظاہر کر کے کہ وہ اردو زبان اچھی طرح نہیں جانتے۔ مہر الحق صاحب نے سوچ بچار کے بعد مقدمہ عنایت اللہ خان صاحب ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت کے سپرد کر دیا۔ ہم حاضر ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے ہمارے وکیل سے فرمایا۔ "یہ کیس چونکہ میرے لیے اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے۔ اس لیے میں اچھی طرح اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔ میں آپ کو ایک مہینے بعد کی تاریخ دیتا ہوں۔"

شیخ خورشید احمد نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ دلائل کے لیے دس جولائی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے باہر آ کر مجھ سے کہا۔ "اچھا ہے۔ اس دوران میں میں خوب تیاری کر لوں گا۔ لیکن انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ہمارا کیس غلط آدمی کے پاس گیا ہے جو بڑا تنگ خیال ہے۔ داڑھی رکھتا ہے۔ نماز روزے کا پابند ہے۔ میں نے کہا۔ "ہٹایئے۔ یہاں نہیں تو ہائیکورٹ میں دیکھا جائے گا۔"

شیخ خورشید صاحب نے اس دوران میں اپنی رہبری کے لیے مجھ سے کہا کہ میں اپنے افسانے "ٹھنڈا گوشت" پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھ دوں۔ چنانچہ میں نے درج ذیل سطور لکھ کر ان کے حوالے کر دیں۔

یوں تو کہانی بظاہر جنسی نفسیات کے ایک نکتے کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس میں انسان کے



نام ایک نہایت ہی لطیف پیغام دیا ہے کہ ظلم وتشدد اور بربریت وحیوانیت کی آخری حدود تک پہنچ کر بھی اپنی انسانیت نہیں کھوتا۔ اگر ایشر سنگھ اپنی انسانیت کھو چکا ہوتا تو مردہ عورت کا احساس اس پر اتنی شدت سے کبھی اثر نہ کرتا کہ وہ اپنی مردانگی ہی سے عاری ہو جاتا۔

اتنے شدید قسم کے اثر کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے موزوں ومناسب اور قریب از حقیقت دکھانے کے لئے ضروری تھا کہ ایشر سنگھ کو جنسی لحاظ سے عام مردوں کے مقابلے میں زیادہ قوی بتایا جاتا چنانچہ مصنف نے کہانی میں جگہ جگہ قلم کی جنبش سے بقدرِ کفایت ایسا کیا ہے۔

ایشر سنگھ کے کردار کے جنسی پہلو کو اور زیادہ اجاگر کرنے اور اس طرح اُسے اس کے دردناک انجام کو قاری کیلئے قابلِ قبول بنانے کے لئے مصنف نے کلونت کور کا کردار پیش کیا ہے جو ایشر سنگھ ہی کی طرح عام عورتوں کے مقابلے میں جنسی لحاظ سے کہیں زیادہ قوی اور توانا ہے۔

اگر ایشر سنگھ ایک عام مرد ہوتا۔ اسی طرح اگر کلونت کلور ایک عام عورت ہوتی تو یقینی طور پر افسانہ ٹھنڈا گوشت کا انجام کچھ اور ہی ہوتا۔ عام مرد پر جس کا جنسی تعلق ایک عام عورت سے رہا ہو۔ ایک لڑکی کی ٹھنڈی لاش ہرگز ہرگز وہ نفسیاتی اثر نہیں کر سکتی جو ایشر سنگھ نے اپنے قوی اور توانا جنسی کردار کے باعث محسوس کیا اور اس شدت سے محسوس کیا کہ وہ اس کے نیچے دب کر، بلکہ پس کر اپنی مردانگی کھو بیٹھا۔

شہوت ایک جذبہ آتشیں ہے۔ انسان میں اگر یہ جذبہ بیدار ہو تو اس کے جسم میں گرم رو دوڑ جاتی ہے اس کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ اس کا دل ودماغ تپ جاتا ہے۔ زیر بحث افسانے کا عنوان ٹھنڈا گوشت ہے ظاہر ہے کہ یہ عنوان جو کہ معنوی اعتبار ہی سے ٹھنڈا ہے۔ قاری کے دل ودماغ میں کسی قسم کی گرمی پیدا نہیں کر سکتا۔

اگر عورت جنسی لحاظ سے کمزور ہو تو ہم اسے "ٹھنڈی عورت" کہتے ہیں۔ یعنی ایسی عورت جو مرد میں جنسی خواہش پیدا نہیں کرتی۔ افسانہ "ٹھنڈا گوست" میں کلائمکس پیدا کرنے والی ایک لڑکی کی ٹھنڈی لاش ہے۔ ایسی ٹھنڈی لاش جو ایشر سنگھ جیسے پُر جوش شہوانی مرد کی ساری مردانگی پر برف کی سِل کی طرح گرتی ہے اور اسے یخ بستہ کر دیتی ہے —— ہم بخوبی سوچ سکتے ہیں کہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے والے قارئین پر جو یقیناً ایشر سنگھ کی طرح پُر جوش شہوانی انسان نہیں ہو سکتے۔ اس کہانی کے انجام نے کس قسم کا اثر چھوڑا ہوگا —— صفائی کے گواہ ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ا۔ یچ۔ ڈی۔ ڈی۔ ایس۔ سی نے اپنے تاثر کو مختصر مگر جامع الفاظ میں کیا خوب بیان کیا ہے افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے کے بعد میں خود "ٹھنڈا گوشت" بن گیا۔

جہاں تک نورمل انسانوں کا تعلق ہے، ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ پڑھنے کے بعد ان کا ردِ عمل بعینہ ایسا ہی ہوگا۔ یہ جدا بات ہے .... کہ وہ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کی طرح اپنے محسوسات کو بطریق احسن بیان نہ کر سکیں —— اینبورمل انسانوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ایسے لوگ موجود ہیں جو لاشوں سے بھی مباشرت کر سکتے ہیں۔

"ٹھنڈا گوشت" میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کو کسی مقام پر بھی لذیذ انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔ اولاً اس لئے کہ ایسا انداز افسانے کے مقصد سے متصادم تھا۔ ثانیاً اس لئے کہ افسانے کا مصنف "شہوت نگار" نہیں ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" کوئی جوڑ دار آسن نہیں پیش کرتا۔ امساک کا نسخہ نہیں بتاتا۔ کسی خفیہ تصویر کی جھلک نہیں دکھاتا ـــــــ "ٹھنڈا گوشت" البتہ ایک دردناک تصویر ہے۔ ایک ایسے مرد کی جس میں انسانیت کی رمق، اس کے کردار کی تمام ہولناکیوں کے باوجود باقی تھی ـــــــ اس رمق نے گو اسے انجام کار نامرد بنا دیا اور وہ اپنے جنسی رفیق کے حسد کے باعث نہایت ہی تکلیف دہ موت سے ہمکنار ہوا۔ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ مرتے ہوئے اسے اپنی موت کا احساس بالکل نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس کے دل و دماغ پر صرف ایک چیز مسلط تھی ـــــــ اس لڑکی کی لاش کا برف ناک ردِ عمل، جس کے ساتھ وہ مباشرت کرنا چاہتا تھا۔

مرنے سے پہلے ایشر سنگھ کو اپنی بہیمیت کا احساس بھی ہوا ـــــــ اور یہ احساس اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ظلمت میں روشنی کی ایک کرن تھی۔ مصنف لکھتا ہے۔

"ہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی ـــــــ" اس نے اپنے آپ سے کہا "اور میں ـــــــ اور میں بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں اسی کرپان سے!"

ایشر سنگھ نے اپنی کرپان سے چھ آدمی قتل کئے تھے جو نفسیاتی حادثہ اسے پیش آیا۔ اس سے پہلے غالباً اس نے کبھی غور نہ کیا ہو گا کہ اس کے ہاتھوں چھ آدمیوں کا خون ہو چکا ہے ـــــــ مگر اب وہ اپنے خون کا ذائقہ چکھتے ہوئے سوچتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ یہ سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ جس کرپان نے میرا گلا کاٹا ہے اس سے میں چھ آدمی کاٹ چکا ہوں ـــــــ اور جب وہ "چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں" کے ساتھ "بھینی یا" استعمال کرتا ہے تو کیا ہمیں اس گالی میں اس کی روح کی دردناک چیخ سنائی نہیں دیتی ـــــــ آپ سنئے۔

اور میں ـــــــ اور میں ـــــــ بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں ـــــــ اس کرپان سے!

"یعنی ایشر سنگھ ـــــــ تو درد اور تکلیف محسوس کر رہا ہے ـــــــ لیکن جانتا ہے تو مگر اس کرپان سے تو نے چھ آدمی مارے ہیں!"

ایشر سنگھ سے ہم اس کے خیالات و محسوسات کے خوش اسلوب بیان کی توقع نہیں کر سکتے۔ وہ ایک گنوار آدمی ہے لیکن اس نے اپنے خام انداز میں سب کچھ بیان کر دیا ـــــــ اور یہ خام انداز ہی اپنی جگہ پر مناسب و موزوں ہے۔

ایشر سنگھ کی قوتِ مردمی سلب ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اپنے اندر ایک نئی کروٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں کلونت کور کے دل و دماغ پر صرف ایک خیال مسلط تھا ـــــــ اس عورت کا جس نے اس خیال کے مطابق اس کے شوہر ایشر سنگھ کو موہ لیا تھا وہ پوچھتی ہے "کون ہے وہ حرامزادی"؟

مصنف لکھتا ہے۔

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔ گالی نہ دے اس بھڑوی کو۔"

ان چھ الفاظ میں کیا مصنف نے ایشر سنگھ کے سارے جذبات جمع نہیں کر دیئے۔ وہ کلونت کور کو منع کرتا ہے کہ وہ اس عورت کو گالی نہ دے، لیکن خود اسے "بھڑوی" کہتا ہے۔ دراصل اس گالی کا رُخ اس کی اپنی ذات کی طرف ہے۔ وہ بظاہر تو رحم اس عورت پر کھاتا ہے جس کو کلونت کور "حرامزادی" کہتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس کو رحم اپنی حالت پر آتا ہے۔

ذرا آگے چلئے تو سارا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

کلونت کور چلائی۔ "میں پوچھتی ہوں وہ کون ہے؟"

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی "بتاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ اور اس پر جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔ "انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے"۔

ہم یہاں ایشر سنگھ کو ایک فلسفی ——— ایک خام فلسفی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں ——— اور اس خام فلسفی کے عقب میں ہمیں صرف ایک چیز نظر آتی ہے ——— اس لڑکی کی ٹھنڈی لاش جس سے ایشر سنگھ جیسا "گرم مرد" مباشرت کرنا چاہتا ہے ——— وہ مسکراتا ہے، صرف مسکرانے کیلئے نہیں، اس کی مسکراہٹ دراصل اس کی حیرت کا مظہر ہے ——— چونکہ وہ سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، اس لئے وہ مسکرا دیتا ہے اور اپنے مضطرب ذہن سے فرار حاصل کرنے کے لئے خود سے کہتا ہے۔ انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔

یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جو کسی انسان کے ساتھ پیش آسکتا ہے ——— اس کو شہوانی جذبات کی برانگیختگی سے کیونکر منسوب کیا جا سکتا ہے؟ ——— کہانی، جس میں ایک قوی اور توانا مرد کی شہوت سرد ہو جاتی ہے، پڑھنے والوں کے سفلی جذبات کیسے مشتعل کر سکتی ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ "ٹھنڈا گوشت" میں چند ایسے الفاظ اور فقرے موجود ہیں جن کو اگر افسانے کے جسم سے نوچ کر علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو وہ ناشائستہ اور غیر مہذب معلوم ہوں گے مگر وہ افسانے کا لازمی جزو ہیں جن کے بغیر افسانہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ کسی لفظ کو یا کسی فقرے کو اس کے گرد کے ماحول کے ساتھ ہی دیکھنا پڑتا ہے۔

اگر آپ "جگ سا پزل" میں سے ایک ٹکڑے کو اٹھا لیں اور کہیں "یہ تو گدھے کی دم ہے" تو ظاہر ہے کہ آپ اپنی رائے صحیح طور پر قائم نہیں کر رہے، اس لئے کہ اس کے صحیح مقام پر رکھ کر "جگ سا پزل" کو من حیث مجموع دیکھنا پڑے گا۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ٹکڑا دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ جڑ کر کسی خوبصورت عورت کے گلے میں پڑی ہوئی لومڑ کی کھال کی شکل اختیار کر جائے۔

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ جو ناشائستہ اور غیر مہذب الفاظ یا فقرے ہیں، وہ کس قسم کے انسان کے

منہ سے نکلے ہیں۔ ایشر سنگھ ایک گنوار اور مہذب انسان ہے۔ اس کے منہ سے ہم شائستہ اور مہذب گفتگو کی توقع نہیں کر سکتے۔

اب گالیوں کی طرف آتے ہیں جو ایشر سنگھ کے مکالموں میں ہمیں نظر آتی ہے۔

ہم اس حقیقت سے کبھی اغماض نہیں کر سکتے کہ اکثر مہذب اور غیر مہذب انسان (مرد اور عورتیں) اپنی روزمرہ کی گفتگو میں گالیاں استعمال کرتے ہیں۔ ایشر سنگھ اپنی گفتگو میں گالیاں بغیر کسی تکلف کے استعمال کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد گالی دینا نہیں۔ اکثر مقامات پر وہ گالی کو بطور تکیہ کلام کے استعمال کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"اور میں ——— اور میں ——— بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں۔

ظاہر ہے کہ گالی گلوچ کا رخ نہ تو خود ایشر سنگھ کی طرف ہے نہ ان چھ آدمیوں کی طرف جنہیں وہ قتل کر چکا ہے۔

گلا چرا ہوا ہے ماں یا میرا"

ظاہر ہے کہ "گلے" کی کوئی ماں نہیں ہے جس کو وہ گالی دے رہا ہے۔

یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے"

اس کے متعلق بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ دماغ کی کوئی بیٹی نہیں ہے جس کو وہ گالی دے رہا ہے۔

اسی طرح کلونت کور ایک جگہ کہتی ہے "یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے"

دو مقامات پر ایشر سنگھ کہتا ہے انسان ماں یا بھی عجیب چیز ہے۔ ——— "انسان کڑی یا بھی عجیب چیز ہے ——— جیسا کہ صفائی کے گواہ مسٹر آئی لطیف نے کہا ہے۔ یہ گالیاں اپنی جگہ بہت نفسیاتی اہمیت رکھتی ہیں۔ افسانے کو غور سے پڑھنے کے بعد قاری سمجھ سکتا ہے کہ ان گالیوں میں ایشر سنگھ کے مضطرب اور متجسس دل و دماغ کی کرب انگیز کیفیت جھلکیاں لیتی ہے ——— وہ اپنی حالت کا صحیح جائزہ لینا چاہتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے اور آخر کار ان الفاظ میں فرار حاصل کرتا ہے۔ انسان ماں یا بھی عجیب چیز ہے۔

انسان کڑی یا بھی عجیب چیز ہے!!"

دس جولائی کا دن گرجتا ہوا آن پہنچا۔ مجھے سخت تشویش لاحق تھی۔ گھر میں سب دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا خیر کرے۔ جج صاحب نے خاص کیس سمجھتے ہوئے چار گھنٹے بحث کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ میاں اے ایم سعید کی طرح کہیں عنایت اللہ صاحب کا رویہ بھی مخاصمانہ نہ ہو۔ کیونکہ ضبط کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میاں سعید صاحب کی عدالت میں کئی دفعہ ایسے موقعے آئے تھے کہ میں چھلک پڑوں مگر حیرت ہے میں نے کیسے ضبط کیا۔

ہم سب صبح حاضر عدالت ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے اپنے دھیمے لہجے میں شیخ خورشید صاحب سے کہا "معاف کیجئے۔ آپ کو آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ذرا یہ چھوٹے چھوٹے معاملے طے کر لوں"۔

ہم عدالت سے باہر نکل آئے ——— عارف عبدالمتین خاموش تھا۔ شیخ خورشید صاحب بھی خاموش تھے۔ اپنے ساتھ وہ موٹی موٹی قانونی کتابوں کا ڈھیر اُٹھا کے لائے ہوئے تھے۔ ان کا دماغ شاید ان کے حوالوں میں گم تھا۔ میں ہائی کورٹ

کی سوچ رہا تھا۔ نصیر انور چھدری گھاس پر رومال بچھا کر اس پر بیٹھا غالباً کوئی کشمیری گیت گنگنا رہا تھا۔

پونے گھنٹے کے بعد ہمیں بلایا گیا۔ ہم عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جج صاحب کو سلام کیا ــــــ عنایت اللہ خاں صاحب نے گردن کی ایک ہلکی سی جنبش سے اس کا جواب دیا۔ ہم ملزموں کے کٹہرے کی طرف بڑھنے لگے تو آپ نے اپنی دھیمی آواز میں کہا۔ ”کرسیوں میں تشریف رکھیئے“۔

میں سمجھا کہ شاید کسی اور سے کہا گیا ہے۔ مگر ان کا روئے سخن ہماری طرف ہی تھا۔ بڑا خوشگوار تعجب ہوا ــــــ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نصیر انور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ بے حد مطمئن نظر آتا تھا۔

پیشتر اس کے کہ بحث شروع ہوتی۔ جج صاحب بولے ”میں نے اس کیس کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ آپ حضرات مطمئن رہیں۔ کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ میں نے مثل میں سے صرف عدالت ماتحت کا فیصلہ پڑھا ہے۔ گواہیوں کا میں نے مطالعہ کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ البتہ افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ بہت غور سے پڑھا ہے“۔

بحث شروع ہونے والی تھی کہ عنایت اللہ خاں صاحب نے استغاثے اور صفائی کے وکیلوں کی توجہ چند نکات کی طرف دلائی اور وضاحت چاہی۔ شیخ خورشید احمد خاموش رہے۔ ایک دو مرتبہ جج صاحب کی تائید میں البتہ کچھ ضرور کہا۔ پروسیکیوٹر صاحب کی تردید خود خان صاحب کر رہے تھے۔ قریباً آدھا گھنٹہ قانونی موشگافیاں کرنے کے بعد آپ نے مسکرا کر کہا ”میں سعادت حسن منٹو کو اگر سزا دوں تو وہ یہ کہیں گے کہ ایک داڑھی والے نے مجھے سزا دی“ ــــــ اس کے بعد وہ کچھ دیر اور عدالت ماتحت کے فیصلے پر کچھ کہتے رہے۔ آخر میں ہم سے مخاطب ہوئے۔ کیا آپ لوگوں نے جرمانہ ادا کر دیا تھا؟ ہم سب نے کہا جی ہاں اس پر جج صاحب نے کہا ”آپ بری ہیں۔ جرمانہ آپ کو پورے کا پورا واپس مل جائے گا۔

میں چند لمحات کچھ سوچ نہ سکا کہ کیا ہوا ہے۔ شیخ خورشید صاحب نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا ”اٹھیے حضرت آپ بری ہیں۔“

عدالت سے باہر نکل کر جب میں نے چپڑاسیوں کو دس روپے انعام کے طور پر دیئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بری ہوں اور یہ کہ چوتھی مرتبہ میرا انجام بخیر و خوبی ہوا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے ایک بہت بڑی لعنت سے مجھے رہائی دلائی۔ شیخ خورشید صاحب اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے اور بجا خوش تھے۔

عنایت اللہ خاں صاحب کے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے فیصلے کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

اپیل بخلاف حکم مسٹر اے۔ ایم۔ سعید مجسٹریٹ درجہ اول لاہور

مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء

دعوے زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی

سزا: عارف عبدالمتین تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی تین ہفتہ قید بامشقت سعادت حسن منٹو کو تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانہ بصورت عدم ادائیگی اکیس یوم قید بامشقت، نصیر انور تین سو روپیہ جرمانہ، بصورت

عدم ادائیگی تین ہفتے قید بامشقت

فیصلہ

یہ تین نوجوانوں عارف عبدالمتین، نصیر انور اور سعادت حسن منٹو کی طرف سے ایک اپیل ہے۔ اوّل الذکر دونوں ایک اردو رسالہ "جاوید" کے علی الترتیب مدیر اور ناشر ہیں تیسرا ایک ادیب ہے جس نے مذکورہ رسالے کے مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع شدہ ایک خاص نمبر میں اپنی ایک کہانی جس کا نام "ٹھنڈا گوشت" ہے۔ چھپنے کے لئے دی۔

انہیں بحکم میاں اے۔ ایم سعید مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور مورخہ ۱۶ ار جنوری ۱۹۵۰ء زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی (فحش کتابوں کی فروخت وغیرہ)، کی خلاف ورزی کے سلسلے میں مجرم قرار دیا گیا ہے بمصنف مسٹر منٹو کو تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپیہ جرمانہ، بصورت عدم ادائیگی جرمانہ ۲۱ یوم مزید قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔ دوسرے دو یعنی مدیر اور ناشر کو صرف تین تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی تین تین ہفتے قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔

یہ تینوں اپیل میں پیش ہوئے ہیں۔

واقعات فیصلہ زیر اپیل میں موجود ہیں۔

مضمون کی طرف حکومت کی توجہ پریس برانچ کے ایک عہدیدار نے مبذول کرائی تھی اور چیف سیکرٹری نے قانونی چارہ جوئی کا حکم دیا تھا۔

میں نے فریقین کے فاضل مشیران کو سنا ہے اور مثل کا مطالعہ کیا ہے میرا خیال ہے کہ ملزم کے خلاف جرم ثابت نہیں کیا جاسکا اور سزا برقرار نہیں رہ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ مضمون زیر بحث کو فحش اور خاص طور پر خلاف قانون قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ملزمین رسالہ سے اپنا تعلق مانتے ہیں۔ اب طے کرنے کے لئے فقط ایک سوال ہے کہ کہانی فحش اور خصوصاً خلاف قانون ہے یا کہ نہیں۔ اس سلسلے میں کئی نکتے پیدا ہوتے ہیں۔ اولاً یہ کہ لفظ "فحش" سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ماہرین کی شہادت پیش کی جاسکتی ہے سوم یہ کہ آیا مضمون زیر بحث قابل اطلاق معیاروں کے مطابق فحش قرار دیا جاسکتا ہے؛ میں نے قانون جرائم ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں تن لال وغیرہ کی کومنٹری دیکھی ہے اور وہاں اٹھائے ہوئے سوالوں پر فریقین کے پیش کردہ دلائل پر غور کیا۔

فحاشی کی جانچ کا معیار وہاں یہ مقرر کیا گیا ہے "آیا فحاشی کے تحت الزام زدہ مضمون میں اُن لوگوں کے اخلاق بگاڑنے اور ان کو بری ترغیب دینے کا میلان ہے جن کے ذہن ایسے غیر اخلاقی اثرات قبول کرنے کے لئے تیار ہیں؟ اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کی تصنیف عوام کے اخلاق کے لئے ضرر رساں ہے اور اندازہ کیا جائے کہ وہ جن کے ہاتھ میں پہنچے گی۔ ان کے ذہن میں بدچلنی اور بدکاری کا اثر پیدا کرے گی تو یہ ایک فحش اشاعت ہوگی۔ قانون کا منشا ہے کہ اس کو روکے۔ اگر کوئی تحریر حقیقتاً کسی ایک بھی جنس کے نوجوانوں یا زیادہ عمر کے لوگوں کے اذہان کو انتہائی

گندے اور شہوت پرستانہ قسم کے خیالات سجھائے تو اس کی اشاعت خلاف قانون ہے۔ خواہ ملزم کے پیش نظر کوئی در پردہ مقصد ہی کیوں نہ ہو۔ جو معصوم حتیٰ کہ قابلِ تعریف ہو۔ کوئی چیز جو شہوانی جذبات کو مشتعل کرے، فحش ہے"۔

پھر ایسے فیصلے بھی ہیں جو قرار دیتے ہیں کہ محض فقروں اور جملوں کو اس لئے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ باقی کی اشاعت ناقابل اعتراض ہے۔ اور کہ جو کوئی جواز نہیں کہ شائع شدہ مضمون کسی مصنف کا لکھا ہوا ہے یا ایسے اسلوب میں لکھا گیا ہے جو آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یا یہ کہ اشاعت میڈیکل ہے اور صرف مخصوص گاہکوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ ہمیں نہ صرف تصنیف کی ماہیت کو بلکہ حاضر معاشرہ کی حالت کو بھی دیکھنا ہے۔ اگر تصنیف بازار میں آزادانہ مہیا ہو سکتی ہے تو ہمیں یہ طے نہیں کرنا کہ مخصوص یا خواہش سے خریدنے والے گاہک اور پڑھنے والے کون ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ عوام تک پہنچ سکتی ہے؛ جن میں دونوں جنس کے جواں سال اور بڑی عمر کے لوگ بھی شامل ہیں۔

پس ہمیں تصنیف کی ماہیت کا اپنے سماج کی موجودہ حالت کی روشنی میں تعین کرنا ہے۔

میرے خیال میں اس معاملے کو اس مقام پر چھوڑا جا سکتا ہے اور ہمیں اس کی طرف بعد میں رجوع کرنا چاہیئے۔ جب ہم اس مسئلے پر غور کر چکیں کہ آیا یہ سوال ماہروں کی رائے سے طے ہو سکتا ہے یا نہیں۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ ماہروں کی رائے سے ہرگز طے پانے والا نہیں۔ ہمیں اس پر غور نہیں کرنا کہ اس کے متعلق کچھ خاص اور ممتاز ادیب کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمیں یہ پڑتالنا ہے کہ پڑھنے والوں پر عام طور سے تحریر و تصنیف کا کیا ردِ عمل ہوگا۔

اگر میرا یہ خیال درست ہے تو فاضل عدالت ماتحت کی ریکارڈ کردہ شہادتوں کا کوئی حصہ اس نکتے کے لحاظ سے قابل قبول نہیں رہ سکتا۔ اگر بفرض محال ہم حضرات جو فریقین یا عدالت کی طرف سے پیش ہوئے۔ ان کی شہادت کو عام پڑھنے کی شہادت کی حیثیت سے قبول کریں اور کسی ایک فریق کو خاص اہمیت نہ دیں تو ریکارڈ شدہ شہادت عدالت کو کوئی زیادہ مدد نہیں دیتی۔ گواہوں کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث مضمون انتہائی فحش ہے۔ دوسری جماعت نے اس کے خلاف بیان دیا ہے اور اسے ایک ایسا فن پارہ قرار دیا ہے جس میں کوئی بھی غیر اخلاقی چیز نہیں۔

غور کرنے پر پتہ چل سکتا ہے کہ یہ رائے عین قدرتی فرق ہے۔ مختلف طبقوں کے پڑھنے والوں کا ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ جب تک ہم جانچ کا ایک معیار مقرر نہ کریں جس کو پیش نظر رکھا جائے۔ اتفاق رائے پیدا نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف مزاجوں، عمروں، پیشوں اور مختلف قسم کی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں کا ردِ عمل بھی ضرور مختلف ہوگا اور علاوہ اس کے کہ یہ طے ہے کہ اخلاق ایک اضافی اصطلاح ہے۔ فحاشی کے سوال پر نظریات ضرور ایک دوسرے سے مختلف اور بہت نمایاں حد تک مختلف ہوں گے۔

میری رائے میں صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس "افسانوی آدمی" پبلک کے ایک عام رکن" کے نقطۂ نظر

سے جانچنا چاہیئے۔

یہ طے کر چکنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنے کے لئے زیر بحث مضمون پر غور کرنا ہے کہ یہ ہمارے سماج کے مسلمہ اخلاقی نظریات کے خلاف کہاں تک جاتا ہے۔

اس موقع پر مجھے زیر اپیل فیصلے کے ایک غلط مفروضے اور گمراہ کرنے والی دلیل کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ فاضل مجسٹریٹ نے اس بیان سے ابتدا کی کہ "فحاشی کی اصطلاح اس ماحول کے ساتھ متعلق ہے جس میں اس کے متعلق فیصلہ کیا جانا ہے۔ اس نے کہا کہ مختلف قوموں اور سوسائیٹوں کے معیار مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک وہ درست تھا۔ اس نے غلطی وہاں کی جب اس نے یہ سمجھا کہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے سوا اور کہیں سے زیادہ صحیح طریقے پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ اس کے مطابق غیر شائستگی اور شہوت پرستی شیطان کی طرف سے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ہمارا آدرش ہے۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ ہمارے سماج کی اصلی حالت کیا ہے جیسا کہ ظاہر ہے ہم نے اپنا نصب العین ابھی تک حاصل نہیں کیا۔ اپیل کرنے والوں کو اس کے مطابق جانچنا چاہیئے جس طرح ہماری سوسائٹی ہے نہ کہ اس طرح کہ اس طرح جیسا کہ اسے ہونا چاہیئے۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ کیسی کیسی مطبوعات مارکیٹ میں موجود ہیں جن پر کوئی احتساب قائم نہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیر بحث مضمون کہیں کم قابلِ اعتراض ہے۔ متعدد "اسراری" مطبوعات کی اشاعت کے خلاف کوئی پابندی نہیں جن سے زیادہ اور کوئی چیز فحش نہیں ہو سکتی۔ سینماؤں میں "تماشاؤں" کی نمائش پر کوئی احتساب نہیں۔ جو زیر بحث مضمون سے کچھ کم قابل اعتراض نہیں ہوتے۔ اگر ہمیں مغربی تہذیب کو اپنانا اور اس کو پسند کرنا ہے جیسا کہ ہم کر رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسی تحریر پر جیسی کہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ معقول طور پر فحاشی کا اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ تو اس تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے اور حسب معمول اس کے علاوہ کچھ نہیں۔



چوما چاٹی اور بغل گیری ایک ایسی چیز ہے جو ہر روز سینماؤں میں پیش کی جاتی ہے۔ بدکاری وہ عام اور بنیادی زمین ہے۔ جس پر "سچی" کہانیاں اور دائمی مثلثیں استوار کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہی تمام انگریزی اور مغربی ناولوں کا بنیادی پلاٹ ہے۔ اگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم کیوں ان نوجوانوں پر سختی کریں۔

زیر بحث کہانی رسالے کے صفحہ ۸۰ سے لے کر ۹۲ تک چھپی ہے۔ قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک خاص شخص کا جس کا

نام ایشر تھا۔ ایک خاص عورت کلونت کور کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ اس نے فسادات کے دوران میں ایک مکان میں چھ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور ایک خوب صورت لڑکی کو وہاں سے اٹھا لایا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے پتہ چلا کہ لڑکی مر چکی ہے۔ ٹھنڈا گوشت ہے۔ اس کہانی کے مطابق اس انکشاف نے ایشر سنگھ پر ایسا اثر کیا اور اس کے شہوانی جذبات کو اتنا سُن کر دیا کہ جب وہ بعد میں کلونت کور کے پاس گیا تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ساتھ سو سکے۔ حالانکہ اس نے اس مقصد کے لیے ابتدائی اقدام اٹھائے تھے۔

اس میں یہاں وہاں کچھ ناشائستہ اصطلاحیں اور کچھ قابلِ اعتراض الفاظ موجود ہیں اور کچھ سوقیانہ گالیاں بھی ——— بالکل اسی قسم کی جو ہماری سوسائٹی کے نچلے طبقے میں عام ہیں۔

اب کسی مضمون کی ماہیت پر غور کرنے کے لئے آدمی کو کئی اصطلاحات اور تصریحات کو زیرِ نظر رکھنا پڑے گا۔ مثلاً چند ایک کا نام لیں تو ایک مضمون "باذوق" یا "بدذوق" "غیر مناسب" یا "سوقیانہ" "ناشائستہ" یا "فحش" ہو سکتا ہے۔ ان تدریجی رنگوں کے امتزاج کو ایک دوسرے سے الگ ہٹا کر اس مضمون کو جسے فحش قرار دیا جاتا ہو، قطعی طور پر "غیر شائستہ" "غیر اخلاقی" "ضرر رساں" "اور بہت کچھ اور" ہونا چاہیئے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ جو میں اس مضمون کے متعلق کہوں گا۔ وہ یہ ہے کہ یہ سوقیانہ اور ناشائستہ ہے۔

فاضل پی پی ایس نے کسی ایسے خاص قابل اعتراض پیروں کی طرف اشارہ نہیں کیا جس کو وہ یقینی طور پر "فحش" قرار دیتا کسی شخص نے کہانی کی چند سطروں پر نشان لگائے ہیں لیکن وہ ایسی ہی ہیں جن کے متعلق میں پیشتر ذکر کر چکا ہوں۔ اور ان کو دوبارہ پیش کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہو گا۔

مجھے اس لئے فاضل عدالت ماتحت سے اختلاف ہے لیکن میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مجھے اس مضمون سے اتفاق ہے میں اسے "فحش" یا زیادہ قابل اعتراض نہیں سمجھتا۔

چنانچہ میں اپیل منظور کرتا ہوں اور تینوں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں وہ پہلے ہی ضمانت پر ہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو وہ سارے کا سارا واپس کر دیا جائے۔

ایک لطیفہ سنیئے گیارہ جولائی کی صبح کو نذیر احمد چوہدری مالک "نیا ادارہ" اور مدیر "سویرا" جو دوسرے ترقی پسندوں کے ساتھ مل کر مجھے رجعت پسند قرار دے چکے ہیں اور حلف اُٹھا چکے ہیں کہ میری کوئی تحریر اپنے "سویرا" میں شائع نہیں کریں گے۔ تشریف لائے۔ بغل گیر ہو کر بڑی گرمجوشی سے مبارک باد دی اور کہا "منٹو صاحب" اب "ٹھنڈا گوشت" عنایت فرما دیجئے میں "نمرود کی خدائی" میں شامل کر لوں۔

میں چوہدری صاحب کی اس درخواست پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

چند دن ہوئے کوہاٹ سے ایک صاحب افیسر کیڈٹ منظہر علی خاں کا خط موصول ہوا۔

مجھے امید ہے آپ کو یاد ہو گا کہ میں کون ہوں۔ ریاض صاحب کی دکان پر آپ سے چند ملاقاتوں ہی نے مجھے آپ

کا گرویدہ بنا دیا۔ بہت دن ہوئے میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کو "ٹھنڈا گوشت" سے نجات مل گئی ہے۔ فرصت کم ہونے کے باعث آپ کو مبارک باد کا خط نہ لکھ سکا۔ اب گو مبارک باد بہت دیر سے ہے لیکن پھر بھی آپ قبول فرمائیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ ایسی مخالفتوں کے باوجود آپ کے مداح بڑھتے ہی جائیں گے۔

سنا ہے چوہدری محمد حسین صاحب جو آپ کے ساتھ اکثر نوک جھونک کرتے رہتے تھے اس دنیا ہی سے چل بسے۔ اب تو معاملہ کچھ بے مزہ سا ہو گیا لیکن دنیا میں سر پھروں کی کمی نہیں۔ کوئی صاحب ان کی جگہ ضرور سنبھال لیں گے۔"

مجھے چوہدری محمد حسین صاحب کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے اب کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں ان کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ان کی جگہ اگر کوئی دوسرا سنبھال لے گا تو میں کہوں گا۔

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

سعادت حسن منٹو

لاہور ۲۹ اگست ۱۹۵۰ء

منٹو کی پہلی کتاب کا ٹائٹل جو پاکٹ سائز میں شائع ہوئی تھی

ویرا

ٹریجیڈی چار ایکٹ میں

مصنفہ آسکر وائلڈ

۱۹۳۴ء

مترجمہ سعادت حسن و حسن عباس

مطبوعہ

دار الاحمر امرتسر

(رتنائی برقی پریس کرما خیر سنگھ کہنہ امرتسر میں باہتمام ابو رضا عطاء اللہ پرنٹر چھپی)

تکلّم برطرف

آپ کے بارے میں تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا البتہ میری آنکھیں پک گئی ہیں یہ پڑھ پڑھ کر کہ انجمن ترقی پسند مصنفین مر کھپ گئی ہے۔ دہر میں اک چراغ تھا نہ رہا۔ یا زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔ کوئی روز جاتا ہوگا جس دن کوئی نہ کوئی انور سدید، انتظار حسین، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ قلم لے کر انجمن پر نہ چڑھ دوڑتا ہو۔

آہ بے چاروں کے اعصاب پر انجمن ہے سوار

ایکس چھاتی پر دوہتڑ مار کر دہائی دے گا۔ صاحبو انجمن نے تو اسی وقت جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی تھی جب برصغیر سے انگریز گیا تھا۔ وائی ران پیٹ کر چیخ مارے گا۔ یارو ترقی پسندوں نے ادب کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا ہے۔ جیسا بغداد کے کتب خانوں سے ہلاکو خان نے کیا تھا۔ اور زیڈ زہر خند کے ساتھ انکشاف کرے گا بھائیو دو تین کام کے والوں کے سوا انجمن ترقی پسند مصنفین میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی صلواتیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

تاریخی طور پر یہ درست ہے کہ سیکرٹری جنرل احمد ندیم قاسمی نے مسلم لیگی ہونے کے باعث یا طبعی شرافت کے ماتحت پاکستان والی انجمن ترقی پسند مصنفین کے وجود کو مار دیا تھا۔ انہوں نے انجمن کے آفس کو تالا لگا کر سرکاری چاکروں کے حوالے چابی یہ کہہ کر کر دی تھی کہ لیجئے آپ بھی کیا یاد کریں گے کسی شریف سے واسطہ پڑا تھا۔ میرا کیا ہے میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا۔ لیکن انجمن کی بوئی ہوئی فکر اس سرنڈر باالفاظ دیگر سقوط کے باوجود مغلوب نہیں ہوئی تھی وہ بے گھر ہو کر بھی پھلتی پھولتی رہی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ آج نوے فیصد نثر اور شاعری اسی فکر کی چھاؤں تلے سفر کرتی نظر آتی ہے۔ قیوم نظر، میرا جی، یوسف ظفر، ضیاء جالندھری، ٹائپ کے بس چند ایک اسلوب پرست اور داخلیت پسند دانے غور سے دیکھنے پر ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ باقی آوے کا آوا ترقی پسند فکر پہ ڈٹا ہوا ہے۔ اسی لئے رجعت پسند بار بار یاد دہانی کرا رہے ہیں۔ حضرات ایک ضروری اعلان سنیں۔ ایک انجمن جو ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئی تھی اور جس کا پورا نام انجمن ترقی پسند مصنفین ہے اب فوت ہو گئی ہے لہٰذا اس کے منشور پر عمل نہ کریں۔ اعلان ختم ہوا۔ شکریہ۔

کی متعدد وجوہات ہیں ۔ مجھے بتانی تو نہیں چاہیئں ۔ کیونکہ پھر انجمن دشمن ان کی بیخ کنی میں لگ جائیں گے مگر آپ کا اشتیاق دیکھ کر مٹھی بھر گوشش گذار کر دیتا ہوں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک پسپا کیوں نہیں ہوئی ۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ یہ وجوہات پہلی مرتبہ منظر عام پر آرہی ہیں ۔ اس سے پیشتر ان کا کسی کو علم نہیں تھا ۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انجمن دشمنوں کو منشی پریم چند ، جوش ملیح آبادی ، فیض احمد فیض ، احمد ندیم قاسمی ، مخدوم محی الدین ، کرشن چندر ، راجندر سنگھ بیدی ، ساحرلدھیانوی ۔ مجروح سلطانپوری ، خواجہ احمد عباس ، ظہیر کاشمیری ، بلونت سنگھ ، علی سردار جعفری ، کیفی اعظمی ۔ سبط حسن ، قتیل شفائی ، خدیجہ مستور ، عصمت چغتائی ، مجاز لکھنوی جاں نثار اختر اور حاجرہ مسرور کے پایہ کا شاعر یا ادیب میسر نہیں آیا جسے ادب کے قاری ذوق و شوق سے پڑھتے اور گمراہ ہوتے اور آگے چل کر لکھنے کے معاملے میں اس کی تقلید کرتے ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ استحصالی طبقوں کے خلاف لکھنے والوں سے تو عوام کو محفوظ رکھنے کے لئے انجمن دشمن توانائی بہاتے رہے مگر استحصالی طبقوں کے شدائد سے عوام کو بچا کر رکھنے کے لئے انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی چنانچہ جوں جوں استحصال بڑھتا گیا توں توں ترقی پسندوں کی مقبولیت اور قدوقامت میں اضافہ ہوتا گیا ۔

تیسری وجہ یہ ہے ۔ تیسری وجہ یہ ہے ۔ چلیں تیسری وجہ کو چھوڑیں ۔ آپ کون سے اجنبی ہیں سب اچھی بھلی تو جانتے ہیں ۔ ہاں تو بات میں کر رہا تھا سعادت حسن منٹو کی اور بیچ ٹیک پڑی انجمن ۔

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ انجمن ہے سوار

ہاں تو میں واقعی بات کر رہا تھا ۔ سعادت حسن منٹو کی جو بہت بڑا ترقی پسند تھا ۔ کیونکہ وہ اپنے افسانوں کے مرکزی کردار عموماً محروم طبقے سے چنتا تھا ۔ غنڈے ، کوچوان ، دلال ، جوارئیے ، جیب کترے ، شرابی ، تماش بین اور طوائفیں اور ان کے ذریعے ثابت کرتا تھا کہ موری کے یہ کیڑے اشرافیہ کے مانند بے حس ، بنجر ، بدذوق اور بددماغ نہیں ہیں بلکہ بہت بااصول ، ایثار پیشہ ، رحمدل ، بھولے اور سچے کھرے ہیں ۔

اس کی دوستی بھی ترقی پسندوں سے تھی ۔ خاص کر کرشن چندر ، احمد ندیم قاسمی ، ساحر لدھیانوی ، عصمت چغتائی اور اوپندر ناتھ اشک سے ان دوستوں کے ساتھ اس کی خوب نوک جھونک ہوتی تھی جس کی بناء پر وہ شاہکار افسانے تخلیق کرتا تھا یہ الگ بات ہے کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا رکن نہیں تھا ۔ اور خود کو ترقی پسند بھی نہیں کہتا تھا پھر بھی اس کی تحریریں چیخ چیخ کر تسلیم کرتی تھیں کہ ہم میں ترقی پسند فکر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔

دوسری جانب ترقی پسند تحریک سے وابستہ کچھ جذباتی اور مخلص اور منہ پھٹ بندے واقعی اسے ترقی پسند نہیں تصور کرتے تھے ۔ ان کا خیال تھا منٹو ترقی پسندی کی آڑ میں فحاشی پھیلا رہا ہے اور قارئین کو انجمن کے منشور سے بدظن کر رہا ہے ۔

اسی جھگڑے میں برصغیر تقسیم ہوگیا اور منٹو پاکستان آگیا، یہاں بجائے اس کے کہ وہ قبلہ و قہوہ قتیل شفائی اور منو بھائی جیسی پالیسی اختیار کرتا یا پھر سو باتوں کی ایک بات عارف عبدالمتین بن جاتا۔ اس نے پرانی ڈگر پر چلتے ہوئے کڑوی کسیلی باتیں لکھنی شروع کر دیں جن کو پڑھ کر شرفاء کی طبیعت مکدر گئی اور وہ اسے راہ راست پر لانے کے لئے لٹھ گھمانے لگے وہی اگر ایم ڈی تاثیر وغیرہ کی چلائی ہوئی پاکستانی ادب والی تحریک میں شامل ہو جاتا تو اس کا بال بیکا نہ ہوتا۔ اب آپ پوچھیں گے پاکستانی ادب والی تحریک کیا تھی تو پوچھیں میں خندہ پیشانی سے بتاتا ہوں۔ پاکستانی ادب تخلیق کرانے والوں کا نعرہ تھا کہ سارے موضوع ترک کر کے تیری وادی وادی گھوموں تیرا ذرا ذرا چوموں۔ پیارے پاکستان ہے اونچی تیری شان جیسی چیزیں ضبط تحریر کی جائیں۔ تبھی یو پی کے ایک صاحب جن کا نام اس وقت میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ ہاں بر وقت یاد آگیا محمد حسن عسکری، منٹو کو حکومتی ادب تخلیق کرنے پر آمادہ کرنے لگے اب آپ استفسار کریں گے کہ یہ محمد حسن عسکری کون تھے تو جواب میں عرض ہے کہ جیسے لاہور کے سیکرٹریٹ پر پاکستانی پرچم لہرانے والی اصل خاتون کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہے ایسے ہی محمد حسن عسکری کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ ہاں اس قدر جانتا ہوں کہ موصوف نے منٹو کی تتبع میں افسانے لکھنے سے ادبی زندگی کی ابتدا کی تھی یعنی آغاز ان کا پھسلن سے ہوا تھا جس طرح انور سجاد منٹو کے آخری عمر کے خرافاتی افسانے پھندنے سے پھسلنے کے باعث آج تک سنبھل نہیں پا رہے۔ جنسی افسانے لکھنے کے علاوہ محمد حسن عسکری نے شاعروں سے ایک ایک نظم مانگ کر کتاب بھی ترتیب دی تھی۔ ازاں بعد ترقی پسندوں سے ان کا جھگڑا ہو گیا تھا اور دہلی سے شائع ہونے والے رسالے ساقی میں اپنے مطالعہ کی جھلکیاں کرانے لگے تھے۔

محمد حسن عسکری نے منٹو کی پیروی میں دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ غیر ملکی مصنفین کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے لگے۔ منٹو نے ۱۹۳۴ء میں، آسکر وائلڈ کے ویرا کو اُردو زبان میں منتقل کیا تھا۔ اس کے تقریباً پندرہ سولہ برس بعد محمد حسن عسکری نے فلابیر اور استاں وال کی تخلیقات کو اُردو کا جامہ پہنا دیا۔ علاوہ اس کے ان دونوں نے مل کر ایک رسالے اُردو ادب کے بھی دو شمارے ترتیب دیئے تھے۔ یوں دونوں میں گاڑھی چھننے لگی تھی منٹو کو محمد حسن عسکری کے مل جانے سے یہ فائدہ حاصل ہوا تھا کہ جہاں وہ قبل ازیں، ہتک، گوپی ناتھ، ممی۔ موذیل قانون اور کالی شلوار جیسے تھرڈ کلاس افسانے قلمبند کرتا تھا۔ اب کبوترا اور کبوتری، تقی کاتب، پھندنے، فرشتہ بجلی پہلوان، بد تمیزی، ملاوٹ، مائی جنتے جیسے بے پناہ خوبصورت افسانے تحریر کرنے لگا۔ چنانچہ، ڈرے سہمے اور جلیں کاٹنے والے ترقی پسندوں کو اذیت پہنچانے کی خاطر ان افسانوں کو محمد حسن عسکری نے بالنس پر چڑھا دیا۔

جواب میں منٹو نے بھی من ترا حاجی بگویم کو پیش نظر رکھ کر محمد حسن عسکری کو سر پر چڑھا لیا اس معاملے میں منٹو یہاں تک بڑھ گیا کہ محمد حسن عسکری کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ بقول شخصے یعنی احمد ندیم قاسمی اور اسد اللہ منٹو نے محمد حسن عسکری کے بارے میں کہا کہ

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوتی ہے دروازہ کھولتا ہوں تو سامنے عسکری کھڑا ہوتا ہے وہ میاؤں سے ملتی جلتی اسلام و علیکم کہکر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ چند لمحے میری چھوٹی بیٹی سے پیار کرتا ہے اور دوبارہ میاؤں یعنی اسلام وعلیکم کہہ کر لوٹ جاتا ہے۔

لیکن محمد حسن عسکری کے زیر اثر تحریر کردہ منٹو کے افسانے قارئین کو ایک آنکھ نہ بھائے جس سے منٹو ٹوٹ پھوٹ گیا محترمہ ممتاز شیریں نے مضمون لکھ لکھ کر منٹو کو یقین دلانے کے لئے سر توڑ کوشش کی کہ وہ دل چھوٹا نہ کرے آہستہ آہستہ قارئین نئے منٹو کو سر آنکھوں پر بٹھا لیں گے۔ آخر میں بھی تو قارئین کی پسند ناپسند کو پس پشت پھینک کر افسانے لکھ کر کتابیں شائع کرا رہی ہوں میں نے تو کبھی اس بات کا گلہ نہیں کیا کہ قارئین میری کتابیں کیوں نہیں خریدتے ایک وقت میں ایک ہی فریق کو خوش کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کو یا قارئین کو مگر منٹو کو ممتاز شیریں کا سہارا بھی نہ سنبھال سکا۔ وہ ترقی پسندوں اور قارئین سے بچھڑ کر بہت دکھی ہوا۔ چنانچہ عین عالم جوانی میں یہ غم دل میں لے کر دنیائے فانی سے کوچ کر گیا کہ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا۔ اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اپنے محلے میں اسے لے جانے والے اس کے فن اور شخصیت پر کتابیں لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیتے وہ منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ مطلب نکل گیا ہے تو پہچانتے نہیں۔ نہ محمد حسن عسکری نے کوئی کتاب لکھی نہ ہی ممتاز شیریں کی نوری اور ناری طبع ہوئی۔ لہذا یہ بلا بھی تیرے عاشقوں کے سر آئی کہکر ترقی پسند ہی منٹو پر مسلسل کام کر رہے ہیں، مضمون لکھ رہے ہیں نظمیں کہہ رہے ہیں اور اس کی برسی منا رہے ہیں

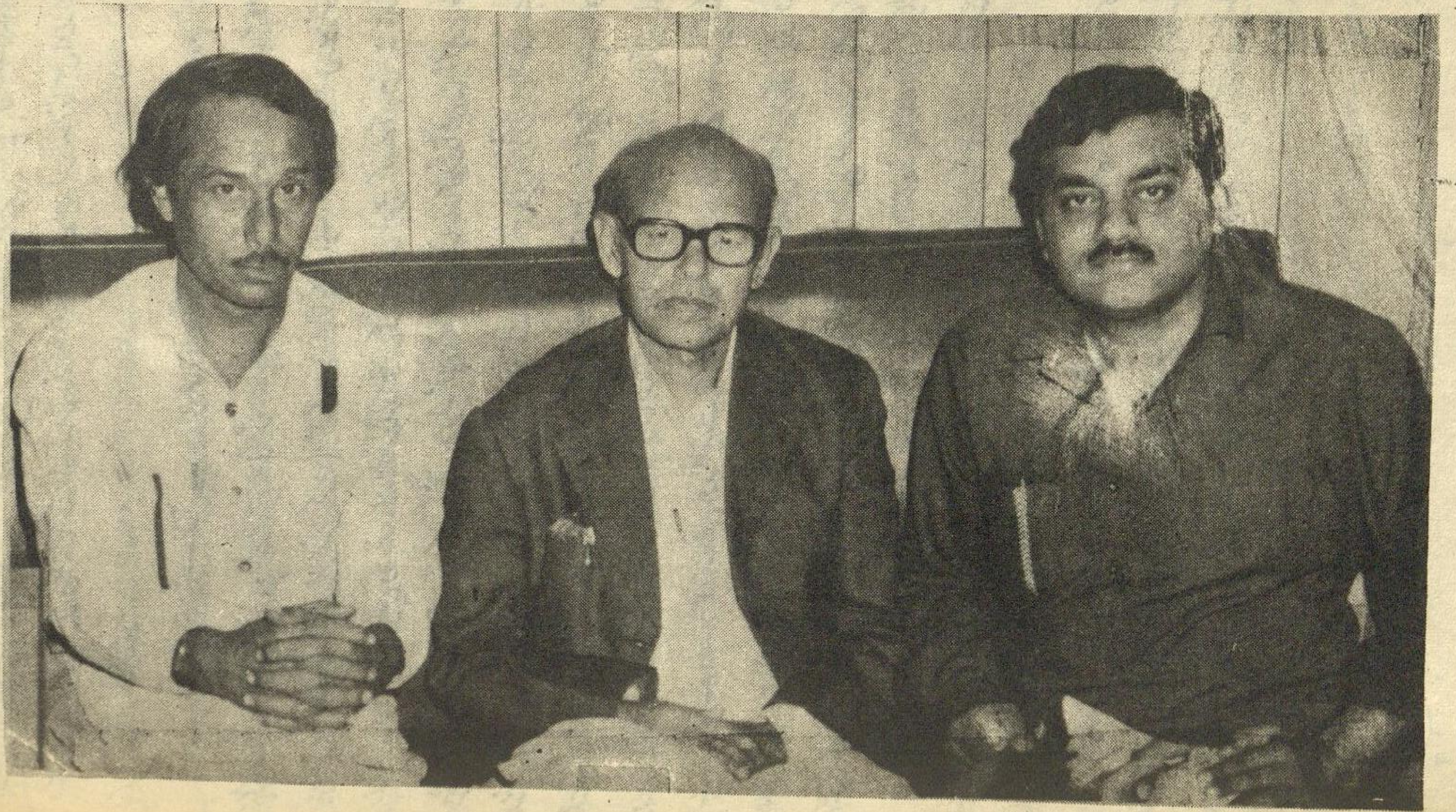
میری یہ کتاب بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ منٹو یوں تو زندہ تھا زندہ ہے زندہ رہیگا کیونکہ اس نے بہکنے سے پہلے زندگی آمیز کہانیاں کثیر تعداد میں تحریر کی تھیں پھر بھی ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اسے کسی نہ کسی رنگ میں خراج عقیدت ادا کرتے رہیں۔ شاید اسی طرح ہماری کوتاہیوں کا ازالہ ہو جائے۔

آخر میں میں اپنے بے تکلف دوست مایۂ ناز دانشور جناب قرار داد قریشی سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو محض قرار دادیں پاس کرانے پر صرف نہ کریں بلکہ منٹو پر ایک بھرپور اور جامع کتاب بھی مرتب کریں۔ جو بدلے ہو حالات اور موجودہ عہد میں منٹو کا مقام متعین کرے۔ اُمید ہے وہ امیر انیس کے ساتھ مل کر اس پراجیکٹ پر ضرور کام کریں گے۔

ضیا ساجد

سلمان بٹ کی یادگار تصویر، ساتھ ہیں ڈاکٹر وزیر آغا اور ضیا ساجد۔

فوٹو زبیر میر



سلمان بٹ اپنے والد قیوم نظر کے ساتھ، ساتھ میں ضیاؔ ساجد۔

فوٹو قیوم زاہد

